اپریل کا رسالہ ایک تو خود ہی دیر میں تیار ہوا تھا۔ طرہ یہ ہوا کہ
تصاویر کا انتظار کرنا پڑا۔ اور پھر بھی اب تک نہ آئیں۔ اس نمبر کے لیئے
مرحوم نسیم بھرت پوری کی تصویر تیار کرائی گئی تھی۔ اب زیادہ انتظار اشاعت
سالہ میں حد سے زیادہ دیر کا باعث ہوگا۔ اس لیئے یہ پرچہ
تصویر روانہ کیا جاتا ہے۔ مئی کے پرچہ کے ساتھ اپریل کے رسالہ
تصویر بھی دے دی جائے گی۔

گزشتہ چند ماہ میں جو غیر معمولی بے قاعدگی مخزن کی اشاعت میں
ہے۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں جن کی تفصیل فضول ہے
ید کی جاتی ہے کہ عنقریب مخزن کی اشاعت کا انتظام
سے شروع ہوگا اور جدید انتظام کے بعد بے قاعدگی کا
ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ایڈیٹر

ہوجانے کے بعد صحت مستقلاً دہلی میں رہیگا

مخزن

عہدِ اکبری میں سفرِ کشمیر

آج کل جسے وہ کارآمد مگر بدنما گاڑی جسے ٹانگہ کہتے ہیں۔ سیرِ کشمیر کے شائقین کو راولپنڈی سے سری نگر دو دن میں پہنچا دیتی ہے۔ اور ملک کے ہر گوشہ سے راولپنڈی تک تیز رفتار ریل موجود ہے کیونکر اندازہ ہو سکتا ہے کہ سلاطینِ مغلیہ سیرِ کشمیر کے لئے کیسی کیسی مشکلات اٹھاتے تھے بہت سے لوگ جنہیں مناظرِ قدرت کی خوبیوں کی شناخت علی الخصوص نصیب نہیں ہوتی۔ مگر جو عہدِ اکبری کے شعراء کی نظمیں تعریفِ کشمیر میں پڑھ چکے ہیں۔ کشمیر پہنچکر سوال کرتے ہیں۔ کہ وہاں کون سی چیز ہے جس کی اس قدر تعریف کی جاتی تھی۔ اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اب بھی دیکھنے والے کے لئے وادیٔ کشمیر وادیٔ جنت نظیر ہے۔ بشرطیکہ کوئی ہمت سے کام لے اور کوہ و دریا پھاندتا ہوا ملک کے اندرونی حصوں میں پہنچ جائے اور دوسرے یہ کہ جن شعرا نے تعریفیں لکھی ہیں وہ خود حسن صحبت کے دلدادہ ہونے کے علاوہ ایسے سازوسامان کے ساتھ سفرِ کشمیر کرتے تھے کہ اس سفر کی ہر منزل اُن کی شاعرانہ طبیعت

نے پہلے ہی پھیکرشنے لگا رکھے تھے۔ ان میں اترے یہاں مشکل کا سامنا تھا۔ آگے کی راہیں نکلتی تھیں اور ہر ایک طرف سے الٹی ہوئی۔ واقف کار آدمیوں کو رستہ ڈھونڈنے اور بہترین رستہ انتخاب کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ انہوں نے پیر پنجال کو پسند کیا اور ادھر کو چلے۔ آگے پیر پنجال کے قریب ایک موضع سے تھتہ۔ وہاں آرام کیا۔ یہاں سے کشمیری زبان شروع ہوتی ہے اور سارے جٹ لوگوں کو یہاں کشمیری زبان بولتے سنا تو بولے۔

"ولایت با یکدیگر بکوہ و دریا و ناموس و زبان جدا گردد"

اکبر کا یہ جملہ صرف اپنے خاندان کے بادشاہوں سے بلکہ دنیا کے تاریخی لوگوں میں بیشتر سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اس کی وجہ دادا قوت ادراک ہے۔ جس کی بدولت وہ ملکداری کی ایک سے باریک باتوں کو سمجھ جاتا تھا اور باوجود بے علم ہونے کے یہاں سلیس اور سادہ الفاظ میں ان باریکیوں کو ادا کر دیتا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ زبان کی یگانگت بہت بڑا رشتہ اتحاد اور زبان کی جدائی بہت بڑا ذریعہ علیحدگی ہے۔ لیکن قدرتی جغرافی حدود کو جو ملکوں کے درمیان حد فاصل ہیں۔ زبان سے اور زبان کو کوہ و دریا و ناموس سے بحیثیت حد فاصل ہونے کے تشبیہ دینا اسی کا حصہ تھا۔ کاش اہل ملک اس نکتہ پر اس زمانہ میں غور کریں اور خود اپنی تہذیب کی کوشش کریں جہاں جہاں زبان کی علیحدگی کی کوشش ہو رہی ہے۔ ایک ایسی حد فاصل ایک قوم اور دوسری قوم میں اور ایک صوبہ اور دوسرے

صورت میں کھڑی کی جا رہی ہے جو کوہ و دریا سے بڑھ کر علیحدہ کرنے والی ثابت ہوگی۔ اکبر کا حکیمانہ قول دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے چند الفاظ ایسے لکھ دیئے ہیں جو گو مضمون موجودہ سے غیر متعلق ہیں۔ مگر نہایت ضروری ہیں۔ اب احوالِ سفر کی طرف عود کیجئے۔

پیر مگل پر گیارھویں منزل ہوئی۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ یہاں دلکشا جگہ ہے اور آب و ہوا اور رنگا رنگ کے پھولوں میں بے مثال ہے۔ کیوں نہ ہو۔ کشمیر کا علاقہ شروع ہو گیا ہے ایک سے ایک جگہ بڑھ کر آئے گی۔ بارھواں پڑاؤ بوستانہ تھا۔ اس کی مختصر تعریف یہ ہے:-

"کوہ ہائے پُر درخت و بسیار گل و چشمہ ہائے جاں پرور"

یہاں پر لطیفہ ہوا۔ اب برفانی پہاڑ آنے لگے۔ بادشاہ کے ہندوستانی ہمراہی گھبرائے۔ نہ آگے جانے کی ہمت، نہ پیچھے ہٹنے کی جرأت۔ بادشاہ نے خود ان کو تسلی دی۔ اور پیر پنجال کا پہاڑ ختم کر کے موضع دونیا میں پہنچے۔ اس تیرھویں منزل کی کیفیت ابوالفضل نے مختصر لفظوں میں یوں بیان کی ہے:-

"از سختیِ سرما سخن سراید۔ یا تنگیِ برف و سراسیمگیِ ہندی نژاد
بار سراید۔ از بلندی کر بوہ حرف زند۔ یا داستانِ تنگیِ راہ
برگزارد۔ از نشیب و فراز ایں مرحلہ بار گوید یا از چشمہ و درخت
و گل بر نویسد"۔

اب پہاڑ کے ندی نالوں کی بہتات کی یہ حالت تھی۔ کہ ایک منزل میں چوالیس پل گزرنے پڑے۔ ہیرہ پور پر قیام ہوا۔ مرزا یوسف خاں نے اس مقام کو خیمہ و خرگاہ سے آراستہ کر رکھا تھا۔ یہاں سب نے آرام کیا۔ یہ تو

ان منتخبات میں میں نے فقط وہ حصے لئے ہیں جو غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر حروفات کا انتخاب کیا جاتا جو بجائے خود کم دلچسپ نہیں۔ تو اس سے بہت زیادہ لکھا جا سکتا تھا۔ ان حالات کو پڑھ کر زبان سے اکبر کی عالی ہمتی کی بے ساختہ داد نکلتی ہے۔ اور عہد اکبری کی عظمت ان کا ایک جلوہ عالم خیال میں نظر آجاتا ہے۔ مگر اس عظمت و شان کے ساتھ جو خیر اکبر کی پائدار ہر دلعزیزی کا باعث ہوئی۔ اس کا ذکر کئے بغیر اس مضمون کو ختم کرنا مناسب نہیں۔ رعیت کے آرام اور حریتوں کی حفاظت پر اس شہنشاہ عادل اور اس کے فاضل وزرا کو اس قدر توجہ تھی کہ سردی گرمیاں پہنچتے ہی حکم دیا کرتا ہی تھا کہ کوئی شخص غریب کے مکانوں میں نہ اترے اور اپنی آسائش کا بندوبست آپ کرے۔ اور جب سفر و کوچ ہوتے اور ہر طرح سے اطمینان حاصل ہوا تو خاص آدمی تعینات کئے گئے جو پاسبانی زراعت و کاشتکاران میں کوشش کریں +

عبدالقادر

جن حضرات نے عصمت کی اشاعت پر توجہ اور رسالہ ملاحظہ فرمانے کے بعد اظہار پسندیدگی کیا ہے انکی اعانت اور عنایت قابل شکریہ ہے۔ امید ہے کہ تمام ناظرین مخزن بھی۔ کا پرچہ طلب فرما کر اپنی بیگمات کو دکھائیں گے۔ رسالہ کے دلچسپ مضامین سبق آموز نصیحتیں۔ کنواری اور بیاہی لڑکیوں کے واسطے نعمت ہیں۔ سالانہ قیمت قسم اول (ایک روپیہ) قسم دوم مع تصویر (عہ) نمونہ کا پرچہ اول (۱) دوم (۳) دفتر عصمت دہلی سے طلب کیجئے۔ (مدیر)

حریت و مساوات

۲

فرانس میں حریت کا آغاز

اٹھارھویں صدی کے اواخر کا ذکر ہے کہ اس ملک میں جو فرانس کہلاتا ہے عام انسانی سطح سے ایک شخص اٹھتا ہے اور عامۂ خلائق کی فلاح و بہبودی کا نغمہ میٹھے سروں میں چھیڑ دیتا ہے، جو انسانی قوت سامعہ کو وجد میں لاتا ہے، اور اس کی اس جوش آمیز تحریک، یا ملک کو اصلاح پر لانے کی فیاضانہ اپیل پر، جوش و خرم اور شراب قبول و رقت سے مدہوش رہنے والا گروہ بھی بیک دل اٹھتا ہے +

یہ شخص سان سیمون نامی جو فرانس کی سلطنت کے لیے وابستہ حریت کم رہی، اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایک ریفارمر کی حیثیت سے ظاہر ہوا، پیرس کا باشندہ تھا اور [illegible] تھا،

جب سے اس نے عقل و ہوش کی دنیا میں قدم رکھا اس کے یہ مرکوز خاطر تھا، کہ وہ دنیا میں عظیم الشان مہمات کے معرکہ سر کرنے کو بھیجا گیا ہے۔ صبح ہوتی جب وہ خواب راحت سے بیدار ہوتا، تو اس کے پیش خدمت دم سے اس کے کان میں یہ الفاظ ڈال دیتے "آقا اٹھیے آج ہوشیار رہیے دنیا کے بڑے بڑے کام کرنے ہیں اٹھیے، اور ان سے مشتغل ہو جائیے تاکہ اپنے خاتمہ سے پہلے تو ان کا خاتمہ کر سکیں" یہ اس کا روزمرہ معمول تھا،

ابھی عمر گنتی کے ۱۹ سال کی تھی، لیکن باوجود اس کے اس کی ہمت بلند طبیعت پرجوش، غیور، درویش دماغ، اور دل کی [illegible] ایسا کہ مشاہیر

فوجی خدمت کی دل میں سمائی۔ اُسے ہی مدار و مدار کر رکھا، لیکن بیماری نے
تھوڑے ہی دنوں میں وہاں سے علیحدگی کے سامان کر دیے۔ صحت یاب
ہوا تو تجارت کی کشمکش میں لگ گئے، جہاں سے بہت سا تجربہ ملتا تھا،
یہ خود صاحب استقلال و مستعد تھے ہیں۔ ان کی عسرت و تنگی پر دوسروں کی
مصیبت کا حس قیاس کیا تو دور حمایت و انسانی ہمدردی نے ایسا سرست
کیا کہ بے ساختہ اشتمالی سلطنت کا تصور اور محتاجی پیشہ پر کہہ دیا۔

انسانی معاشرت و طرق معیشت سے بحث یا عام و ان کے نتائج پر اور
ایک عمیق نظر ڈالی اس سے منطقی مقدمات سامنے ورنہ جس میں سرمایہ
وحیران۔ بالآخر ترتیب مقدمات سے وہ اس نتیجہ تک پہنچے، کہ نوع انسان
میں باہمدگر واقعات اور ان کے حالات کو جتنی تقویت ہوگی اُن کے
اجتماعی مقاصد کو نقصان ہوگا کہ وہ ہمیشہ جادۂ اعتدال سے گرتے
رہیں گے، جب تک وہ اس اتحاد کو نہ سمجھیں گے کہ ایک جگہ کے رہنے والے
خواہ وہ شہر ہو یا قصبہ ایسے کاروبار معاشرت و معاملات میں بھائیوں
کی طرح ایک دوسرے کے شریک رہیں +

علاوہ اس فکر و تجربہ سے طے کرنے کے بعد جو لے دیٹرک یکس الوکی رائے
اُس نے قائم کی وہ یہ تھی، کہ

"سعادت اعلیٰ مفہوم انسانیت وہی حاصل کر سکتا ہے جسے
اپنی باطنی صداقت ضرورتوں اور خواہشوں کو حسب دلخواہ ادا کرے
تب پوری آزادی حاصل ہو۔ اس فطری آزادی کی روک تھام ہوئی
اور قیاس الی و تمامل متفاوت روان ہو گیا۔
"لہذا انسان مطلق العنان ہے۔ اس کے لیے کوئی دائرہ مقرر

ضرورت تسمیہ نے ڈھانچہ طیار کیا۔ ان کے اتفاق سے رابرٹ اوین کا
کالبد ملا۔ یہ شخص ۱۷۷۱ء میں انگلستان کے ایک قریہ میں پیدا ہوا۔ نو برس
مدرسہ میں گذرے ویں سال تک محنت مزدوری کرتا ہوا شہر
سٹیمفورڈ پہنچا جہاں ایک تجارت پیشہ نے اپنی دوکان کے
کام پر لگا لیا تین یا چار سال یہاں گذرے، یہاں سے قسمت نے مانچسٹر
(جو پارچہ بافی میں انگلینڈ کا سب سے بڑا اور مشہور مقام ہے) پہونچایا جہاں اس کام
سیکھتے ہی کے تھے مگر وہ اپنی فطری مناسبت، جرأت، غیر معمولی استعداد
کی صفائی کی بدولت اپنی خداداد صنعت، حرفت میں چابکدستی، اور تجارتی
معاملات میں مشاقی دکھلا کر لوگ کہ ایک مزدور کی حیثیت سے کارخانہ کا
مہتمم بن گیا۔ اور ایک شخص جو اس کا ایک ادنیٰ قلی تھا، پانسو قلیوں اور کاریگروں کا
افسر ہوگیا۔

اس ترقی پر جب وہ فائز ہوا اس کی عمر ۱۵ سال کی تھی، دیکھئے اس حوصلہ
افزائی کا معاوضہ اس نے یوں دیا کہ اپنی غیر معمولی طباعی و اہتمام سے بہت
تھوڑے عرصہ میں کارخانہ کو ایسی ترقی و شہرت حاصل کرا دی کہ انگلینڈ میں
وہ سب کارخانوں سے زیادہ مشہور اور ... نے لگا۔ اب وہ خود بھی
اس کارخانہ کا شریک تھا۔ اس کے بعد وہ نیو لارک آیا جہاں ... اور اس نے
انڈسٹریل ڈیپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ لے لیا۔ وہاں کام کرنے
والے کاریگروں کا شمار (۲   ۰) تھا، جس میں تقریباً (۵۰۰) چھ سال سے
دس سال تک کی عمر کے لڑکے تھے۔ جو تنگدست فقرا سے کچھ دے دلاکر
لے لیے جاتے تھے، وہاں انہیں ہر قسم کا جبر و تشدد کیا جاتا تھا۔ کام لینے کی
تو کوئی حد نہ تھی، اور وہ سخت سے سخت۔ باایں ہمہ ان کی اصلاح حال کا

یعنی یہاں بھی آگئی تھی، چنانچہ ایک عملی اور مدبر آدمی ہونے کے سوا اسپر
وہ بہت سے فلسفیانہ رائیں بھی رکھتا تھا، جس سے اس کی عقلی و دماغی دونوں
طرح کی موزونیت اور جامعیت کا پتہ چلتا ہے انسان کے اچھے یا برے
اعمال کی علت فاعلی یا محرک کے بیان میں وہ ایک حد درجہ کا نہایت
معنی خیز، ولولہ انگیز، و لائق اعتماد اضافہ کرتا ہوا لکھتا ہے -

"انسان خلقت کا مطیع ہے، اسلیے اس کے کام چاہے وہ اچھے
ہی کیوں نہوں، اس کے نہیں کہے جا سکتے ۔۔ ایک شخص جسنے
جماعت کی رفاہ وسعادت کے لیے اپنی عمر کھپا دی ہے نیکنامی
کا سزاوار ہے، کیونکہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے بدوں ارادہ و
کوشش حکم طبیعت سے کرتا ہے۔ پس اچھا کر کے وہ لائق تحسین
نہیں، اور برا ہو کے وہ مستحق ملامت ،

" ابتدا میں طبع انسانی سادہ لوحی کی وجہ سے موثرات خارجیہ
سے جن میں ذہنی جسمانی، اور ایسوسی ایشن تربیت بھی اصل
ہیں) اثر پذیر واقع ہوتی رہتی ہے، اور بعد از پختگی
ساری حکومت قوے عملی کی طبیعت کے اثر میں آجاتی ہے ،،

بعض آدمیوں سے فلسفہ اعمال میں تعلیم و تربیت کی ضرورت پر بدرجہ اتم
زور دیا گیا تھا، گو سطحی تحقیق سے دیکھا جاے تو اس نکتہ کو بیان کرنے
والوں میں اوین کو کسیطرح اولیت حاصل نہیں، لیکن اسے یہ امتیاز
ضرور ہے کہ اوس نے اس خیال کو ملک میں پھیلایا، اور اوس کی جوش
انتہائیاں اس فلسفہ کی عملی مشق میں صرف ہوئیں +
اس سے زیادہ اس کے مقاصد، اور اصلاحی اصول کا جاننا ہے

منظور ہو، اُسے اسکا وہ لیکچر دیکھنا چاہیئے جو ۱۸۱۶ء میں بمقام نیویارک ایک عام جلسہ کی تقریب میں دیا گیا تھا اور جس میں تمام انگلینڈ کے چیدہ تاجر موجود تھے اسوقت کی اقتصادی، اجتماعی اور تمدنی رکھرسل استریوں حِس وسیع النظری اور تدبر سے بحث کرتے ہوئے اوکی اصلاح کا مشورہ دیا تھا اور جو اصلاحی خاکہ طیار کیا تھا وہ ایک حد تک اوسی کے عملی اجبار دماغ کا کام تھا،

وہ نیہ کے نظامِ اجتماع کا حامی وہ سی تھا چنانچہ لیکچر میں لکھتا ہے "

"امت کی تقسیم کی جائے جسمیں سے ہر جماعت میں ہزار افراد ہوں"

"ہر جماعت کے لیے ایک دارالاقامۃ ہو، جسکی ساخت سوائیکہ"

"بحیثیت مجموعی اُس کی تعمیر نہایت شاندار ہو، اور اُس کے"

"تمام قطعہ جات ایک حیثیت کے ہوں،" "اُس جماعت کے لیے"

"ایک سطح عام ہو، اور ایک ہی دسترخوان پر اُنہیں کھانا"

کھلایا جاوے،

" ہر گھرانے کے لیئے ایک قطعہ مخصوص ہو اُن کے نومولود"

"بچے تین سال تک اُن کے زیر تربیت رہیں، بعد ازاں"

"وہ نگران کمیٹی کے انتظام میں دیدیئے جائیں جو اُن کی"

"نگہداشت کی ذمہ دار ہو،

"مگر عام مجامع یا دار الطعام کے اتفاقی ملاقات کے ماں باپ"

مخصوص طور سے اُنہیں ملنے کا بھی موقعہ دیا جائے"

"ہر شخص کو سہل الحصول، اور معیشت کے آسان وسائل بتلائے"

"جائیں"

الغرض اس تقریر کا طلسمی اثر یہاں تک ہوا کہ اُس کے پیش کردہ مباحث سے نہایت عمیق دلچسپی لی گئی۔ ہر صاحب اثر نے اُسے تسلیم کیا اور اپنے حلقۂ اثر میں اس کی تعمیل پر زور دیا۔ یہاں تک کہ ملک کا کوئی دماغ ان خیالات سے خالی نہ رہا لیکن جیتم نے یہاں بھی ایسا کام کئے بغیر پوری مذہبی قانون سے اسکی ایسی گرفت کی، اور بلنٹ نے ثابت کر دکھائی جس سے اُسکا مادۂ اجتماع ہٹا ہوا تھا، اور آخرکار اُسے یکسر نام نہ رہنے دیا۔ پھر بھی اس کے کارناموں سے صفحے کے صفحے رنگے ہوئے ہیں، اُس کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی، جس میں سے سرآوردہ موریس، کیسلی، اور لوڈلو جن کا مذہب اجتماعیہ مسیحیہ کے لقب سے ملقب ہے *

المانیا میں قومیت کا جوش | انیسویں صدی نصف گذر جانے کے بعد انگلستان و فرانس میں اجتماعیہ یا قومیت کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور المانیا میں اسکا چرچا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ المانیا میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوگئے جن کے نام وہاں کی قومی تاریخ کے لیے حروف زریں ثابت ہوئے جن میں سے چند نام یہ ہیں، کارل مارکس، اینجلس، لاسال، روڈرٹس مگر ہر دو اول الذکر کو خصوصیت خاصہ حاصل ہے۔ فقط

حاتعالی

سراج منیر۔ نواب محمد مصطفیٰ خان بہادر مرحوم حسرتی شیفتہ کے سفرنامۂ حجاز کا ترجمہ ... صاحب بی اے مترجم فرخ آباد نے نہایت محنت و قابلیت سے کیا ہے ترجمہ کی خوبیوں کے علاوہ اس کتاب کا انتخاب بھی خصوصیت سے قابل داد ہے ہم قابل مترجم کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں قیمت کہیں درج نہیں غالباً مترجم صاحب سے ملیگی۔

علامہ ابن ابی اُصیبعہ مصنف عیون الانباء فی طبقات الاطبّا

زمانہ میں کیسا انقلاب آیا ہے! کس رنج و تأسف کے ساتھ اُس قوم کا خیال آتا ہے جو اُس تمام علم و حکمت کی پیدا کرنے والی اور کھوج لگانے والی اور دنیا میں پھیلانے والی تھی جس نے آج یورپ کو مالا مال کر رکھا ہے اور اب ایسی تباہی اور بربادی میں پھنس گئی ہے کہ اُس کے گذشتہ عروج اور شان و شوکت اور تہذیب و تمدن تمام واقعات خواب و خیال نظر آتے ہیں۔

ہم نے بہت کوشش و کاوش کے بعد چاہا تھا کہ ایک ایسے ذی کمال کی مخصوص کیفیتوں، عادات و خصائل اور معیشت و معاشرت کے طریقوں پر روشنی ڈالکر کچھ سوانح بیان کریں جس نے، خود اطبا اور اُن کے ناموں کو حیات ابدی کا خلعت دیا، قدما کی تاریخ و سیر اُن کی نیک یادگار کو زندگی جاوید کے ذریعے سے مزین کیا اور جن بزرگواروں پر آج ہم فخر کر سکتے ہیں اُن کو ابد الآباد تک باقی رکھنے کے لیے عیون الانباء فی طبقات الاطبا نام ایک دلچسپ تذکرہ لکھا۔

لیکن یہ امر سخت دلشکن ہے اور اس بے خبری سے قومی تاریخ کو سخت صدمہ پہنچا ہے کہ ایسے مصنفین کے حالات بھی ظلمت میں ہیں جو دوسروں کے لیے شمع محفل یا مشعل بزم تھے۔

تاہم اجمالی طور پر جن حالات کا پتہ ملتا ہے وہ اگرچہ نہایت ناکافی ہیں لیکن

بالایجاد کل تاریخی کتب کے مقابلے پر علامہ ابن ابی اصیبعہ جیسے باکمال
مورخ کے حالات ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں کیونکہ ناظرین محسنان
کے لیے اس کی متین تصنیف سے اقتباسات پیش کرنے کا
ارادہ ہے

عشرہ من ستدادعمی نے اپنی کتاب السیرۃ کے اکتالیسویں باب میں
اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ تاریخ طب اور اطبا پر وسعتی ڈالنے کے لیے
اس آمادہ کمال کی گرانبہا تصنیف سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے جس کا
نام ابن ابی اصیبعہ اور تالیف کا نام عیون الانباء فی طبقات الاطباء ہے۔
مصنف مذکور لکھتا ہے کہ یہ وقیع ذخیرہ مشغلہ جرمنی نے جو کتاب
ترتیب قرون کے لحاظ سے لکھی ہے اور جسکو ایک مقدمہ حصہ ادوار اور
خاتمہ پر تقسیم کیا ہے وہ عیون الانباء کے پایہ کی نہیں ہے۔ اور یہ زبان
جرمنی میں ہونے کی وجہ سے اہل مشرق اس سے کچھ فائدہ ہی نہیں اٹھا سکتے
افسوس ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کے سن ولادت تک کا پتہ نہیں چل
سکا مگر یہ معلوم ہوا ہے کہ اسکا نام ابو العباس احمد بن سدید الدین قاسم
بن خلیفہ تھا اور علامہ ابن ابی اصیبعہ کے حلقے سے مسند شہرت پر قدم رکھا۔
اس نامور دوگانہ شخص کا باپ ملک العادل ملک المعظم اور ملک الناصر کے دربار
میں مسند طبابت پر ممتاز رہا اور مدت تک ... اور امراض چشم میں
یکتائے روزگار خیال کیا جاتا تھا سنہ ۶۴۹ھ میں جب اس نے اس دار فانی
کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا ہے تو ابن ابی اصیبعہ جیسا وحید العصر بیٹا اپنے
فضل وکمال کا جانشین چھوڑا جو اس کی زندگی ہی میں اپنی شہرت کا
سکہ اہل فضل کے دلوں میں جما چکا تھا۔

ابن ابی اصیبعہ کو فن طب کیطرف کھینچے والے اسباب میں سے
سبب اعظم قوی سبب اول تو یہ تھا کہ وہ تنہا بھی بلحاظ رسم و رواج زمانہ اسکو
اس فن سے تعلق تھا۔ اسیلئے سن شعور کو پہنچتے ہی اُس نے فن طب کیطرف
توجہ کی اور اس رجحان طبعی نے اُسکو یعقوب بن سقلاب جیسے نامور طبیب
کی بارگاہ میں رسائی کا موقع دیا۔ یعقوب بن سقلاب نے اپنے ہونہار شاگرد رشید
پر خاص توجہ کی اور اس نے جالینوس کے وہ تمام کتابیں جو نصاب تعلیم
میں اُسوقت داخل تھیں ایسے شفیق اُستاد سے پڑھکر اپنے عصر میں
خاص امتیاز حاصل کیا

کتاب المسامرہ میں علی بن رضوان نے بیان کیا ہے کہ اطباء اسکندریہ
نے بہت غور و فکر کے بعد جالینوس کی تصانیف کو سولہ مجموعوں میں جمع کیا
تھا جسکا نام جوامع ستہ عشر رکھا تھا اور ان کے تعلیم کے سات درجے
مقرر کیے تھے۔

پہلا درجہ مدخل کے نام سے موسوم تھا اس میں چار کتابیں تھیں
کتاب الفرق اس میں تجربہ اور قیاس کے ساتھ قوانین علاج بتائے
گئے تھے اور ایک مقالہ میں تھی۔ کتاب الصناعہ اس میں فن طب کے
نظری اور عملی دو حصوں کا بیان تھا اور یہ بھی ایک مقالہ تھی۔
کتاب النبض۔ اس میں ہر مرض پر نبض کے ذریعہ سے استدلال
کا طریقہ بتایا گیا تھا۔ کتاب المسمیٰ با غلوقن اس میں فن طب کے اعمال جزئیہ
کا بیان اور جالینوس کی بڑی بڑی تصانیف کا انتخاب تھا۔
پہلا درجہ ختم ہو کر تعلیم طب کا دوسرا درجہ شروع ہوتا ہے [illegible]

چار کتابیں تھیں۔ کتاب الاسطقسات اُن چیزوں کا بیان تھا جو جسم انسانی کے لیے بمنزلہ اجزا اولیہ مانی گئی ہیں اور تحصیل فن کے لحاظ سے جن پر عبور لازمی ہے یہ ایک مقالہ تھی۔

کتاب المزاج اس میں مختلف امزجہ کے حالات اور تقسیم وغیرہ کا بیان تھا۔ جو ۳ مقالوں میں ختم ہوا تھا۔

کتاب القوى الطبیعیہ اُن قوتوں کے حالات تھے جو جسم انسان میں ہر وقت اپنے عمل جاری رکھتی ہیں ۳ مقالوں میں۔

کتاب التشریح الصغیر فن تشریح کی ضروریات پر پانچ مقالے تھے۔

تیسرا درجہ اس میں صرف ایک کتاب علل والاعراض تھی جس کے چھ مقالے تھے۔

چوتھا درجہ دو کتابیں کتاب تعرف علل الاعضاء الباطنیہ۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ اندرونی اعضاء کی بیماریاں کیونکر پہچانی جا سکتی ہیں۔ مثلاً تنفس کی دشواری درد بخار کھانسی وغیرہ ہوں تو ذات الجنب (نمونیا) سمجھا جائے۔ اس کے چھ مقالے تھے۔

کتاب النبض الکبیر اس کے چار جزو تھے اور ہر جزو کو چار چار مقالوں میں تقسیم کیا تھا۔ نبض کے حال میں اس سے زیادہ بسیط کوئی کتاب نہ تھی۔ یہ کتاب سولہ مقالوں میں تھی۔

پانچواں مرتبہ اس میں ۳ کتابیں تھیں۔ کتاب الحمیات۔ بخار کے اقسام کا بیان ۲ مقالے تھے۔

کتاب البحران اوقات مرض اور مریض کے انجام کا بیان ۳ مقالے تھے
کتاب ایام البحران ایام مواد و بحران کے تفصیلی حالات ۲ مقالے تھے

کلیاتِ میر حسن دہلوی

مژدہ اے یاراں کہ آں یارِ عزیز
گشتہ باصد ناز آخر جلوہ گر

"دیوان اب نہیں ملتا آج یہ نوبت ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہیں جو اس کتاب میں درج کرتا۔"

یہ وہ ریمارک ہے جو شمس العلماء آزاد مرحوم نے میر حسن دہلوی کے دیوان کی نسبت آبِ حیات میں کیا ہے۔ حسرت کی قسمت کہ دیوان درکنار کلیات ملا جو نایاب نسخہ ملا اُس سے شوق و عقیدت دونوں جلوہ گر ہیں۔ کاغذ نفیس خط پاکیزہ سونا پانی کر کے بہایا ہے۔ اوّل سے آخر تک مطلّا جدولیں ہیں۔ دل نے تقاضا کیا تھا کہ یاران نکتہ داں کو صلائے عام دوں۔ اور ادب کے خزانے مخزن کے لئے ریویو لکھوں۔ فرصت نے تنگی کی۔ دل کی تمنا دل ہی میں رہی۔ شکر ہے آج موقعہ ملا۔ مدت کی چھوٹی ہوئی صحبت پھر نصیب ہوتی ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔

یہ کلیات اصنافِ سخن سے مالامال ہے۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ واسوخت۔ ہجو۔ رباعی وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ ہیں مختصر مختصر حال ہر صنف کا سناتا ہوں۔

غزل غزلیں کم و بیش پانسو ہوں گی سب کی سب سوز و گداز اور درد و غم سے لبریز ہیں۔ زبان بھی ایسی ہے جو حکایتِ شوق کے مناسب ہے۔ اگرچہ [illegible] متروک الفاظ جابجا آتے ہیں مگر عام طور پر زبان صاف اور درست ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دل میں درد اور حسرت کا جوش زیادہ تھا۔ اسی سے [illegible]

شمع لحد پہ مثل پروانہ — ہو گئے ہم نثار بہر لحد
شمع ساں ان کے یار جل جل کر — ہو گیا جسم زار سب لاغر
دیدۂ احسن اور ہے لاغر — رنگ اب انتظار ہے لاغر

غزل

دل غم سے تیرے لگا گئے ہم — کس کس سے مگر جلا گئے ہم
ماتم کدۂ جہاں میں مثل شمع — رو رو کے جگر بہا گئے ہم
مانند حباب اس جہاں میں — کیا آئے تھے کیا دکھا گئے ہم
کھویا گیا اس میں گو دل اپنا — پر یار تجھے تو پا گئے ہم
آتا ہے ہی تو ہم کو رونا — یوں موت کا غم بھلا گئے ہم
افسانۂ سرگذشت چوں شمع — رو رو کے بہت سنا گئے ہم
تھا ہم میں امید اس میں وہ جو پڑا — سو اس کو حسن اٹھا گئے ہم

غزل

آج دل بے قرار ہے کیا ہے — درد ہے انتظار ہے کیا ہے
جس سے جلتا ہے دل جگر وہ آہ — شعلہ ہے یا شرار ہے کیا ہے
یہ جو کھٹکے ہے دل میں کانٹا سا — مژہ ہے نوک خار ہے کیا ہے
چشم پر شور تیری آنکھوں میں — نشہ ہے یا خمار ہے کیا ہے
میرے ہی نام سے خدا جانے — ننگ ہے اسکو عار ہے کیا ہے
کیوں گریبان تیرا آج حسن — اس طرح تار تار ہے کیا ہے

متفرق

دل جلا یا پھڑک جگر اٹھا — دیکھیو شعلہ یہ کدھر اٹھا
یک بیک دل پہ کیا غضب ٹوٹا — پھر تو کچھ آہ سے وہ بھر اٹھا

تھی یہیں عندلیب کی تربت — کھلا گل ہی سے چراغ رہا

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

وصل ہوتا ہے جنکو دنیا میں — یارب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں

تھا ہجر ہی بھلا کہ تھی اس میں امید وصل — پھر ہجر کا خیال نہ تھا وصل میں

کیسا وصال کس کا فراق اور کہاں کا عشق — تھی عالم جوانی کی بس یہ بھی ایک ترنگ

ایک تو تلخی حال اس پہ تیرا زہر فراق — اس دل زار کو ملتا ہی رہا سم پہ سم

خیال رہتا ہے جو اس کوچہ میں اکثر اپنا — گھر میں ہم رہتے ہیں [illegible] اپنا

قطعوں کا نمونہ

کل کسی سے کہا حسن نے کہ لیا — تیری خاطر یہ اپنا حال کیا
رکھ کے ماتھے پہ ہاتھ کہنے لگا — میر جی نے مجھے نہال کیا

دیگر

دلی سے تازہ آئی تھی یہ میر کی غزل — جس کا یہ شعر ہوش سے بیہوش کر گیا
یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رخ زرد پر مرے — کہتا ہے میر رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

دیکھو دلی کی یاد دل سے لگی ہوئی ہے! معاصرین کا ذکر محبت سے کرتے ہیں۔ میر صاحب کا ذکر اوپر کے قطعہ میں ملاحظہ ہوا۔ میرزا سودا کی نسبت ایک قطعہ ہے۔

کیا شعلہ ہے کہ جس تن [illegible] ہو ‏ ‏ [illegible]
کے شاگرد [illegible] کا یہ کون اشارے ۔ میر ضیاء الدین ضیا تخلص کے استاد تھے
کیسا مطلب شعر کو قطعہ بند کیا ہے ؎

کیا کہیں ہم حسن بقول ضیا ‏ ‏ جس طرح سر کر آپ پیلہ ہیں ہم
داغ ہیں کارواں رفتہ کے ‏ ‏ نقش پائے گزشتگاں ہیں ہم

ایک مقطع میں تسلیم پشتوی کا نام بھی لیا۔

قصیدہ قصیدے اہتمام کے ساتھ لکھے ہیں جو لوازم قصیدہ ہیں اُن کی پابندی کی ہے۔ کلام میں شکوہ ہے۔ بندشیں چست ہیں۔ زبان غزل سے زیادہ پاک ہے۔ اکثر مضامین لطیف پیدا کیے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ میں مرزا سودا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے جس طرح غزل میں میر کا انداز لیا ہے۔ دو قصیدے منقبت میں ہیں۔ باقی نواب آصف الدولہ اور دیگر امرا کی مدح میں۔ مجھ کو تذکرہ نویسوں کی اس رائے کے قبول کرنے میں تامل ہے جو آبحیات میں نقل کی ہے۔ "قصیدہ اس رتبہ (یعنی غزل کے مرتبہ) کا نہ تھا"۔

نمونۂ قصیدہ

حضرت شیر خدا کے تلوار کی تعریف ملاحظہ ہو۔ ردیف ہے۔ نشانِ مہتاب
چراغدانِ مہتاب ؎

ہے یک تیغ دشمن اعدائے دیں چمک اسکی ‏ ‏ جلائے جان و دل و چشم مومناں مہتاب

آصف الدولہ کے گھوڑے کی تعریف ؎

یہ جو گلگوں سبک عناں تیرا ‏ ‏ ہے روانی میں ہم عنانِ سخن
رنگ کر جب حنا سے لاویں اُسے ‏ ‏ ہو وہ تب مضحکِ بوستانِ سخن

نواب سالار جنگ کی مدح میں جو قصیدہ ہی اُسکی تشبیب بہت شگفتہ ہے

کھینچا ہو حُسن کا کسے حق دستِ خیال | یہ بل ہو میسر اگر ایسا تو کھنچے تصویر

اسی قصیدہ کا دوسرا مطلع جو حسن مطلع ہے ؎

زہے یہ نقشِ محبت کی ہم سے گہہ تاثیر | ہوا نہ وہ تو مسخر پہ ہم ہوئے تسخیر
برنگِ بید یہ حسرت زدہ ہر اک ہر زخم | الٰہی کس کی نگہ کا لگا جگر پہ تیر

ممدوح کے ہاتھی کی تعریف ؎

تمام ہاتھیوں میں وہ رکھے ہو ایسا وقر | شبوں میں قدر کی شب جس طرح سے توقیر
ہے اُسکے ماتھے پہ اس طرح جلوہ گر انکس | کہ جیسے عکس ہو دریا پہ جب پڑے شمشیر

ایک قصیدہ کی تشبیب کے چند مسلسل شعر نقل کرتا ہوں جس سے قصیدہ کا انداز معلوم ہو سکے ؎

یاں تک کیا ہی اس فلکِ دوراں نے کار تنگ | کیا ہی عجب جو مجھ میں سما دے میرا رنگ
افسردہ دل ہوں غنچۂ پژمردہ کی طرح | بادِ خزاں نے جی کی کلی ہی میں کی ہے تنگ
جوہر معائنہ ہو مرا کیونکر غیر سے | شمشیر ہوں میں وہ کہ مجھے کھا گیا ہے زنگ
جوہر شناس ہو کوئی میرا تو سمجھے وہ | کس کس طرح کی دل میں بھری ہیں مرے ترنگ
آئینہ سامنے ہو تو طوطی ہو حرفِ دل | کیا سر کو اپنے پٹکے کوئی ہو کے روبرو سنگ

مثنوی مثنویاں متعدد ہیں۔ ایک سحر البیان اسے نظر اب یہ محتاجِ بیان نہیں۔ دوسری گلزارِ ارم مخزن لپیس کی حسن سعی سے اسکی بیاض بھی ہو مگر کمیاب ہے۔ تیسری مثنوی تصنیف کی ہے۔ اسکا نام رموز العارفین ہے ۱۱۹۸ھ میں لکھی گئی یعنی مثنوی سحر البیان کے اُنیس برس بعد۔ معلوم ہوتا ہے کہ اخیر زمانے میں ان کا جی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اُس کے کہارے کے واسطے یہ مثنوی لکھی چنانچہ لکھتے ہیں : ؎

دیگر

جس چیز کا اشتیاق دیکھا ہم نے آخر اُس کا فراق دیکھا ہم نے
دل اپنا ملا جس سے دل اُس کا نہ ملا یہ بھی عجب اتفاق دیکھا ہم نے

مخمسات مخمسات فارسی اور اردو دونوں غزلوں پر ہیں۔ اِن میں رو بکمال ایک شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مخمس میں شاعر کو دوسرے کی طرز کا پابند ہو کر اپنے کلام کو شگفتہ کرنا پڑتا ہے۔ سب سے زیادہ مشکل موزون مصرع لگانا ہے۔ جس شعر کی تخمیس ہو اس کے مضمون کے اول کے تین مصرعوں میں یا تائید ہو یا اسکو ترقی دیجائے۔ طلب ہے کہ سادہ کے مضمون پر ترقی و اضافہ سخت مشکل کام ہے میر حسن نے کمال یہ کیا ہے کہ شیخ علی حزیں اور اہلی کی معرکہ آرا غزلوں کو مخمس کیا ہے۔ اور اس خوبی سے کہ حق تخمیس ادا کر دیا ہے۔ اُردو میں زیادہ تر میر کی غزلیں لی ہیں مخمس کا لطف حاصل ہوتا ہے کہ کل غزل پڑھی جائے۔ اس قدر گنجائش کہاں۔ تاہم دو تین نمونے بے اختیار نوکِ قلم پر آتے ہیں۔

مخمس غزل شیخ علی حزیں ؎

مجھ اُسکی وہ قیامت مژہ اُسکی ایک آفت مرا دل سو آسا نارک میرے جی کی سو یہ حالت
یہ کوئی ہے دوست میرا۔ کسی کو مجھ سو اُلفت بستانِ غمزہ او کر رسانند این نصیحت
کہ دلِ بت این رسدان جگر است این حلال

از مخمس غزل اہلی شیرازی ؎

جو پھرتا ہوں تو مثلِ آئینہ میں اے صنم بخود جو بیٹھا ہوں کہیں تو بھی ہوں نقش قدم بخود
یہاں تک ہوش آتا ہے کہ ہوں وسدم بخود را جانے کہ روے دیدہ ام آنجا روم بخود
مدام طاقت آن دم کہ بیم بے تو آنجا را

نکتہ جس طرح ہر صنف کلام میں میر صاحب سے سعدِ کمال کھایا ہے ویسی طرح ہجو میں
شمشیرِ دودم میان سے لے لی ہے۔ فحش مضامین اس بلند آہنگی سے نظم کیے ہیں کہ
سننے والے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ رواج بری بلا ہے۔ عیب کو ہنر کر دیتا
ہے۔ ان شعرا کے قلم سے یہ الفاظ نکلنا سخت حیرت خیز ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ نقل
کر کے انکو یادگار چھوڑ گئے۔ قدر اول سے کشمیری کاغذ پہ لکھ کر سنہری جدول
سے چمکایا۔

مرحوم محمد حسین صاحب آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں "شگفتہ مزاج ظریف طبع تھے۔
اور اس میں حد سے شائستگی کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے"۔ اسکو پڑھ کر میں ان کی
ہجو پڑھتا ہوں تو دم بخود رہ جاتا ہوں +

حسرت شروانی

غزل

دل پہ قابو نہ رہا رنج و الم بھول گئے
آنکھ پڑتے ہی ستمگر پہ ستم بھول گئے

عشق کا میرے عدو ہوا اتنا مشہور
لوگ بھولوں کو ترے سر کی قسم بھول گئے

دل میں پچھتاتے ہیں چہرے کی اداسی ہے عیاں
میرا مرنا کہ سب انداز ستم بھول گئے

گردشِ چشم سے ظاہر ہے الم ساقی کا
گھول دیا جو مرے جام میں سم بھول گئے

بے خطا ہیں بخدا کچھ تو زباں سے بولو
کون تقصیر ہوئی جس پہ صنم بھول گئے

جب کیا شکوہ تو بولے کہ بجا کہتے ہو
تم ہمیں بھول گئے یا تمھیں ہم بھول گئے

بت کدہ بھی اسے کہتے ہیں صنم خانہ بھی
خود لتیک جہاں اہل حرم بھول گئے

سادگی اپنی کہیں یا اثرِ حسن کہیں
جب وہ پہلو میں ہوا ہجر کا غم بھول گئے

دل سے آشنا کو فراموش۔ کرنا تھا محال
کہ ستم کرنا بھی اب اہل ستم بھول گئے۔

بزمِ شعرا اور مرحوم آزاد

دیکھنا، دیکھنا، برادرانِ وطن! کہیں ایسا نہو کہ آنکھ جھپک جائے، غنیمت ہے یہ وقت اور نعمت غیر مترقبہ یہ محفل، رات گئی تو پھر یاسمہ آنے والی نہیں۔ چاند چمکیگا تارے چھپینگے۔ راتیں بہت سی آئینگی اور جائینگی۔ مگر تم کہاں اور یہ تم میں کہاں، دلِ مجروح جوں کے آنسو رہیگا۔ آنکھیں چاروں طرف ڈھونڈھینگی، مگر یہ سماں پھر نظر نہ آئیگا۔

آج آبادی سے ساڑھے سات میل کے فاصلہ پر اس گورستان میں جس کا چپہ چپہ اور کونہ کونہ بیش بہا جواہرات سے مالا مال ہے وہ مقدس صورتیں جمع ہوئی ہیں۔ جنکے مبارک ہاتھ گلستانِ اردو میں ایسے پودے لگا گئے جو قیامت تک تروتازہ رہینگے اور وہ سدا بہار پھول کھلا گئے جنہوں نے تمام دنیا کو معطر کر دیا۔ رفتارِ زمانہ کے شیدائیوں! ان جبّے دار پگڑیوں اور لمبی ڈاڑھیوں کو دیکھکر تعجب نہ کرنا۔ یہ شہر آبادی کے بسنے والے ہیں۔ ان کا لباس تیرھویں صدی ہجری کا نمونہ ہے۔ یہ وہ ہیں جو مر گئے اور مرقع کو ہاتھ سے نہ دیا۔ یہ مدرسیں ہو گئے لیکن آن بان میں فرق نہ آنے دیا۔

یہاں باکمال بزرگوں کا مجمع ہے جو دلی کی خاک سے اُٹھے یا سرزمین جہان آباد میں اکتسابِ علم کیا۔ آسمانِ ادب پر چودھویں کا چاند ہو کر چمکے اور بزمِ اُردو میں ایسے فانوس روشن کر گئے جو بھولے بھٹکے مسافروں اور اس منزل پر پہنچنے والوں کی ہمیشہ رہنمائی کرینگے۔

کسے خبر تھی کہ یہ قلعہ لاثانی جس پر آج شاہجہان کی نظرِ شفقت پڑ رہی ہے

کیسا معزز اُن پاک رُوحوں کا مسکن ہوگا۔ اِن کے مقدس ہاتھ ایسی عمارتیں بنا چکے جو
رُوئے زمین پر بےنظیر ہونگی۔

او معزز سیلانیو! دِل کی آنکھیں کھولو، دیکھو، دیکھو اور سنو کیسی کیسی صورتیں
سامنے ہیں، قلم ان کی توصیف میں مجبور، زبان انکی مدح سے معذور، کس کی مجال
ہو کہ انکے احسانات کا حق ادا کر سکے۔ یہ ملک سخن کے تاجدار عالم ارواح سے چلکر
دُنیائے اجسام میں آئے ہیں اور مرحوم آزاد کی ملاقات کے مشتاق ہیں، انیسویں صدی
عیسوی کا دسواں سال شروع ہوا تھا تب اس بلبل خوش الحان کو جس کی نغمہ سنجی
کلیجے ہلا دیتی تھی ہم سے جُدا کر رہی ہے۔ گو مرحوم آزاد کو اس خاک پاک میں سونا نصیب
نہ ہوا جس کا وہ دمِ واپسیں تک دلدادہ رہا مگر اسکی رُوح جسد خاکی سے وداع ہوتے
ہی ان قدر دانانِ سخن کی خدمت میں حاضر ہوئی ہے۔

اللہ اللہ کیسے اچھے لوگ ہیں۔ ذرا انکی باتیں سنو اور انکی صورتیں دیکھو۔ لکھنؤ
کے معزز مسلمانو! تمہاری آنکھ بند ہونے کی دیر تھی زمانہ کچھ کا کچھ ہو گیا وہ باتیں
خواب و خیال ہو گئیں۔ تمہارے دامانِ شفقت سے جُدا ہوتے ہی بدنصیب اُردو
پر وہ وہ ستم ٹوٹے کہ زندگی وبال ہو گئی۔ اغیار کی بے اعتنائی کا ذکر نہیں
گھر کے بھیدیوں نے وہ لنکا ڈھائی کہ چھکے چھڑا دیئے۔ نتھرے ستھرے صاف
شفاف پانی کے چشمہ میں کھاری بدذائقہ میلے کچیلے لا لا کے اصلی آب و تاب
غارت کر دی۔ تمہاری آنکھیں دیکھی ہوئی وہ چار صورتیں ہیں جو آڑے آئیں ورنہ شیرازہ
گر کون سنتا تھا۔ جس پودے کو تم نے اپنے خون جگر سے سینچ کر رنگ برنگ کے
پھول کھلائے آج اس کا خدا حافظ ہے۔

سنگلاخ زمین کو دم بھر میں گلزار بنا دینے والے بزرگو، کہاں ہو، آکر مرحوم
قلعۂ معلیٰ کی بھری پُری بیگم کی کنگھی تمہارے دربار میں کھڑی ہے اسکی فریاد سنو اور

انصاف کرو، یہ محلوں کی رہنے والی آج در بدر ماری ماری پھر رہی ہے۔ اور کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ تمہاری بدولت اس نے بڑی بڑی سلطنتوں پر حکومت کی۔ ایک عالم میں اس کا ڈنکا بجا۔ عالم ارواح کے ستارو! تمہارا ہی طفیل تھا کہ اس کے حسن کو چار چاند لگے۔ نزاکت اسکی لونڈی۔ فصاحت اس کی چیری۔ بلاغت اس کی زر خرید۔ تمہارا منہ موڑنا تھا اس کی چمک ماند اس کی رنگت پھیکی۔ اس کی آب و تاب ختم اس کی دلکشی ختم۔ غرض اس کے تمام جوہر زائل ہو گئے۔

عالم بالا کی سیر کرنے والو! للہ میرے قریب آؤ اجازت دو کہ تمہارے پاک جسم کو بوسہ دوں۔ تم کیا تھے میرے دل سے پوچھو تم کیا تھے تم ہادی تھے تم رہبر تھے تم اپنے چند روزہ قیام میں وہ راج کر گئے کہ سلطنتوں کو نصیب نہیں وہ یادگار چھوڑ گئے کہ سیکڑوں ہزاروں برس کے بعد بھی دنیا تمہارے نام کو آنکھوں سے لگائیگی۔

اے تخت نشینوں سے بہتر خاک نشینو! تمہارے خیالات کا ہجوم مجمع سلیمانی تھا۔ جہاں روانی طبیعت کی خوشنما پریاں ہر وقت اور ہر لمحہ ہاتھ جوڑے موجود تھیں۔ عقل سراسر متعجب اور دل شیدا متحیر ہوتا ہے فطرت نے تمہاری طبیعتوں میں کیا مادہ ودیعت کیا تھا۔ تم کس ساز و سامان کے ساتھ آئے تھے کہ تقریریں پھول اور تحریریں موتی برسا گئے۔

کیا پُر لطف سماں اور بہار کی محفل ہے میر سودا درد سے لیکر داغ تک تمام حضور موجود ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو مرکز اقلیم سخن کے استاد ٹھہرے گو زمانے جیتے جی انکی قدر نہ کی مگر انکے دماغوں سے ایسے چشمے پھوٹے کہ خلق اللہ ہمیشہ ہمیشہ سیراب ہوگی۔

کرسی صدارت پر میر صاحب، ولی اور ہیں غالب۔ ذوق۔ مومن اور انکے
ساتھ وہ تمام شعرائے باکمال جن پر آج ناز کر رہی ہے تشریف فرما ہیں۔ دفعتہً
شمس العلما آزاد کی تشریف آوری کا غلغلہ ہوا۔ کشتی زرنگار میں خلعت
ہفت پارچہ رکھا تھا۔ آزاد کا داخل ہونا تھا کہ خوش آمدید کے نعرے لگاتے
ہوئے اہل محفل تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ذوق سے بڑے شوق سے
لئے ملک الشعرا خاقانی ہند نے میر صاحب کی اجازت سے خلعت پہنایا
سب نے مبارکباد دی اس کے بعد حضرت داغ کھڑے ہوئے۔ ہاتھ میں ایک
دیوان تھا اور نگاہ سوئے شمس العلما کہ رخ روشن پر صدر انجمن کے اشارے سے
تقریر شروع کی۔

حضرت انسب زبان اردو سے زیادہ قابل رحم کون ہوگا جسکی ایک بیس
پچیس ہی برس میں وہ کایا پلٹ کہ خدا دشمن کی نہ کرے۔ یہ وہی زبان ہے جو کسی وقت
شہزادیوں کا زیور بادشاہوں کا جوہر ایک عالم کی محبوب ایک دنیا کی مرغوب
ہندوؤں کی جان مسلمانوں کا ایمان تھی۔ مگر تقدیر نے اسکو وہ وقت دکھایا جب
اس کے قدرداں ایک ایک کرکے دنیا سے چلنے شروع ہوئے جس جگہ ہر وقت
بلبلان خوش الحان کی چہکار اور گلہائے رنگین کی مہکار تھی۔ وہاں ایک ہو کا
میدان رہ گیا کبھی کوئی بھولا بھٹکا پردیسی سیلانی ادھر سے گذر جاتا تو کسی درخت
کے پیچھے بیٹھ کر دو آنسو بہا لیتا ورنہ اس کی اگلی بہاریں سب ختم ہو گئیں۔ انگریزی
کے زبردست سیلاب نے اسکی ٹھنڈی اور میٹھی لہروں کا خاتمہ کر دیا۔ اس نفسا
نفسی کے عالم میں آزاد کی کوششیں شکریہ کی مستحق ہیں جن کے دم سے چمنستان
ادب گلزار ارم بنا رہا۔ بدقسمتی سے آزاد کو وقت ایسا ملا جب اردو کے قدردان
بڑی بڑی عدم آباد کا رستہ لے چکے تھے۔ کوئی اتنا بھی نظر نہ آتا تھا کہ

مقصود کا پتہ دیتے مگر وہ مرد میدان ہمت نہ ہارا۔ گو دل کے حوصلے پورے
ہونے کی امیدیں خاک میں مل چکی تھیں مگر دھن کا پکا ارادے کا سچا اپنی کوششوں
میں سرگرم رہا اور اس باغ میں جو مدتوں سے ویران ہو چکا تھا ایسے ایسے پھول کھلا گیا جو
مدتوں تک جلتے مسافروں کے دماغ معطر کرتے رہینگے۔

یہ زبان اردو کا محسن مرحوم مولوی باقر علی دہلوی کے ہاں سنہ ۱۲۴۶ھ میں پیدا
ہوا۔ ہونہار بچے کی تعلیم میں باپ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چونکہ
استاد ذوق سے بے تکلف دوستی تھی شاگردی میں سپرد کیا۔ ذوق جیسا سکھانے والا
اور آزاد جیسا سیکھنے والا۔ آزاد ہمیشہ کہا کرتا تھا استاد کی صحبت نے
باپ کی دلی آرزو پوری کر دی اور آزاد ایسا شاگرد ہوا کہ آج استاد اس پر ناز کرے
آزاد وہ پہلا شخص ہے جس نے اگلے وقتوں کے مضبوط زنجیروں کو توڑا اور اردو شاعری
کو واقعیت کے ایسے سانچے میں ڈھالا کہ آئندہ نسلیں مدۃ العمر دعائیں دیں گی۔
اس نے نثر اردو کو کمال معراج پر پہنچایا اور ایسی یادگاریں چھوڑ گیا جو اگلوں
کو بھاتی ہوئی کلیجہ پر گڑتی ہیں۔

قسمت نے اس دماغ کو علم کا کچھ ایسا شوق دیا تھا کہ زندگی اسی تحقیق و تلاش
میں بسر ہو گئی۔ گو عمر کا آخر حصہ جوان لڑکی کی موت سے ایک عجیب حالت میں
بسر ہوا۔ مگر جب تک دماغ کام کرتا رہا اس وقت تک تدقیق ختم نہ ہوئی۔ جو
چسکا تھا جو ہندوستان سے ایران کی سرزمین میں لے گیا صحبت کا تکلف
کی امانت اس شخص پر جو ایران سے ہزاروں کوس کے فاصلہ پر پیدا ہوا ایسا
رنگ چڑھا کہ اہل زبان بھی اس کے کلام پر صاحب زبان ہونے کا شبہ کرتے

باپ کی شہادت استاد کی موت سنہ ۱۸۵۷ء کا غدر غرض پیہم صدمات نے
عقل کے سہنے میں لطف نہ رکھا۔ اس پر اہل وطن کی ناقدری اور سب سے

رہی ہیں۔ مگر اب تمہاری صورتیں ایک دھندلی سی تصویر دکھائی دے رہی
ہیں۔ آہ وہ بھی نہ رہیں!

مذاق صحیح اور عقل سلیم دونوں شاہد ہیں، الفاظ سخن کی کان ان دنوں کھد رہی
ہیں کہ یکایک اردو کے سر سے اس شخص کا سایہ اٹھا جو عمر عزیز کا بڑا حصہ
اور زندگی جیسی نعمت کی کل کائنات لطف زبان کی نذر کر گیا۔ ہو تو آزاد
آمد یقینی اور فیصلہ قطعی تھا مگر یہ ہر وہ موت جس رستے ٹوٹ رہ گیا۔
زمانہ بدل جائے۔ خدا کرے کہ جو آسمان زمین سب تہ و بالا ہو جائیں
مگر مرحوم آزاد میدان سخن میں ایسے موتی لٹا گیا جو ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔
نئے موسم کی ترکاری اور نئے فصل کا میوہ ہمیشہ سدا بہار پھولوں کا مزہ دیگا

راشد الخیری

مصباح الترجمہ

مولوی محمد باقر صاحب پروفیسر عربی اورینٹل کالج لاہور نے اس
چھوٹی سی کتاب میں عربی ترجمہ کے چند معدود ضروری
قواعد جمع کر دیئے ہیں۔ تاکہ طلبہ کو اردو یا فارسی سے عربی میں ترجمہ کرنے میں آسانی ہو
ہر قاعدہ کے ساتھ اس کی مثال لکھی ہے۔ اور اس کی مشق۔ جدید عربی الفاظ بھی
جا بجا دیئے گئے ہیں۔ شمس العلما مفتی محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی شیخ العلما قاضی
میر احمد شاہ صاحب رضوانی جیسے مستند اصحاب نے اس کتاب کو پسند کیا ہے۔
اور پنجاب ٹکسٹ بک کمیٹی نے بھی اظہار پسندیدگی کیا ہے۔ کتاب عربی دان طلبہ کے
لئے خصوصاً سکولوں اور مدرسوں میں مفید ثابت ہوگی۔ صاحب مؤلف سے مل سکتی
ہے اور اسکی قیمت صرف چار آنے (۴) ہے۔

کا اظہار ہم سے مطابقت الحمل کرایا جاتا ہے۔ تاہم طوعاً و کرہاً کرنا ہی پڑتا ہے۔
اور بعض ایسی باتیں ہیں کہ
"جن کا اظہار ہم کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتے۔ اور
بعض ایسی ہیں کہ جو صرف ہمیں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اور ہماری زندگی
کے خاتمہ کے ساتھ ہی اُن کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دُنیا میں اس وقت تک جس قدر ایجادیں اور مخترعات ظاہر ہو چکی ہیں یا
بار آور ہو رہی ہیں وہ کسی امر کا نتیجہ مانتے ہیں۔
"راز طلبی یا راز کشائی کا"

جس وقت تک ہم کسی شے یا کسی حقیقت کا راز کھلتا نہیں۔ اس وقت
تک وہ ہستی یا وہ وجود ہمارے واسطے ایک لاعلمی یا ایک راز ہوتا ہے جب
کسی شے کے راز پر ہم دسترس حاصل کر لیتے ہیں اس وقت وہ حقیقت جو ہم
پر کھل چکا ہے ہمارے واسطے ایک علم یا ایک فن ہو جاتا ہے۔ اور جو مستور تھی
ہے۔ وہ ایک راز یا رسالہ ہے۔ اگر ہم غور کریں اور تامل سے دریافت کام
لیں تو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

چھوٹی سے چھوٹی ہستی یہاں تک کہ ایک بے مقدار ذرہ بھی ایک راز
رکھتا ہے یعنی یہ کہ اس کی ہستی میں بھی ایک نہیں بلکہ کئی ایک راز ہیں۔ جوں جوں
وہ راز رفتہ رفتہ کھلتے جاتے ہیں۔ توں توں دنیا میں آسائش اور ترقی
کے سامان مہیا ہوتے جاتے ہیں۔ تاہم اِن حدود تک پہنچ جاتے
ہیں کہ جو ہماری آسائش اور دنیا کی مجموعی ترقی کے موجبات اور وسائل ہیں۔
جو شخص ایک شے یا ایک ہستی کی حقیقت یا کیفیت سے واقف نہیں
رکھتا وہ اس کے واسطے ایک جیسی شے یا جیسی ہستی ہے۔ اور اس کی

نسبت کہا جائیگا کہ وہ اُس سے ناواقف اور جاہل ہے۔ جو شخص ایک چیز
یا ایک ہستی کی حقیقت یا کیفیت سے شناسائی اور واقفیت رکھتا ہے۔ اُسکی
نسبت کہینگے کہ۔

وہ اس شے یا اس آدمی کی نسبت علم رکھتا ہے۔

جس طرح یہ ضروری ہے کہ

ہم دُنیا یا دُنیا کی ہستیوں اور چیزوں کے [illegible] رازوں سے واقف ہوں
اور اس واقفیت سے اپنی زندگی کے کاموں اور احتیاجات میں کام لیں۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہم سے راز مخفی ہوں کہ

جن سے ہم ایک مدت تک ناآشنا رہیں

یا اخیر تک بھی ہمیں اُن کا علم نہ ہو۔

یہ کلیہ یا یہ اصول اس وقت زیادہ تر صاف ہو جاتا ہے کہ جب ہم قانون
قدرت اور اُن معاملات پر ایک غائر نظر کرتے ہیں کہ جو قانون قدرت کے
ماتحت سرزد ہوتے رہتے ہیں اور جن میں ہم کسی قدر یا ایک حد تک ترمیم
اور تبدیلی سے کام لیتے ہیں۔ ہم باوجود طرح طرح کی کوششوں اور مساعی کے
پاتے ہیں کہ چند امور اور چند رازوں سے ہم عمر بھر تک واقف نہیں
ہوتے۔ اور چند راز یا چند امر ایک خاص وقت تک ہم پر نہیں کھلتے
لیکن ایک خاص وقت میں آکر اُنکا انکشاف ہونے لگتا ہے۔

ہر شخص اور ہر ہستی خود اپنی ہی ذات کی نسبت ہی ایسا خیال کر سکتی ہے
اور دوسروں کی نسبت بھی اُسے ایسی قسم کے واقعات کا پتہ مل سکتا ہے۔

جو شخص اس کلیہ کے خلاف ہے اس سے یہ دریافت ہونا چاہیئے کہ کیا
وہ دُنیا کے ہر ایک راز سے واقف ہے۔

یا خود اس کے اپنے رازوں سے اور سب لوگ واقف ہیں۔

ان سوالوں کا جواب ہر شخص کی طرف سے نفی ہی میں ہوگا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دنیا کے کل رازوں سے واقف ہے۔ یا خود اس کے اپنے ذاتی رازوں سے سب لوگ واقف ہیں۔

راز دو قسم کے ہیں۔

رازِ قدرت۔

راز مخلوق۔

رازِ مخلوق کی حد ایک نہیں ہے۔

ہر مخلوق بجائے خود ایک راز رکھتی ہے۔ کبھی وہ راز مجموعی ہوتا ہے۔ اور کبھی منفرداً۔ جداگانہ سرار کی حیثیت سے یہ کہا جائیگا۔ کہ ہر نوع کا راز دوسری نوع سے مجموعی اور منفردہ صورت میں جداگانہ ہوتا ہے۔ اور ہر نوع کے افراد کے راز بھی کچھ تو ظاہر ہونے کے قابل ہوتے ہیں اور کچھ ایک مدت تک اخفا میں رہتے یا رکھے جاتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اخیر عمر تک ظاہر ہی نہیں ہوتے یا نہیں کئے جا سکتے۔

حیوانی نوعوں میں سے صرف انسان ہی راز نہیں رکھتا دوسری نوعیں بھی کچھ نہ کچھ راز رکھتی ہیں۔ اگرچہ یہ نہ کہا جاسکے کہ اُن کے راز انسانی راز کے ہم پلہ ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور کہا جائیگا کہ اُنکے بھی کچھ نہ کچھ راز ہوتے ضرور ہیں۔ جن میں سے بعض راز تو ہم جانتے یا جان سکتے ہیں لیکن بعض سے ہمیں بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ یہ ہر ایک فرد اُن انواع کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

انسانی رازوں کی تین قسمیں ہیں۔

وہ راز جن کے اظہار کے بغیر گزارہ ہی نہیں۔

وہ راز جو ایک خاص وقت پر یا ایک خاص شخص یا خاص اشخاص سے ظاہر کیے جاتے یا کیے جا سکتے ہیں۔

وہ راز جو ساری عمر تک بھی ظاہر نہیں ہوتے۔ ہر ایک شخص کے ساتھ ہی جاتے ہیں

پہلی قسم کے رازوں کی نسبت تک اگر شاعر نے یہ کہا ہے کہ

انسان کے دل میں رازہ ایک ایسی لوکٹ یعنی تمغہ ہوتا ہے جس سے کوئی واقف نہیں ہوتا۔ اور جو کبھی نہیں کھلتا۔

شاعر مذکورہ کا یہ استدلال اور خیال عام واقعات کے مطابق ہے ہر شخص اپنی زندگی میں چند ایسے راز رکھتا ہے جو عام طور پر ظاہر کر دیتا ہے۔ چند ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاص خاص لوگوں پر وقت پر ظاہر کیے جاتے ہیں اور چند یا ایک دو ایسے راز بھی ہوتے ہیں جو کسی کے پاس بھی مدت عمر تک ظاہر نہیں کیے جاتے اور زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ راز اسی لوکٹ میں بند رہتے ہیں جو اُن کے واسطے انسانی خیال نے دل کے اندر بنا رکھا ہے۔

جو راز انسان خاص خاص لوگوں پر ظاہر کرتا ہے وہ اظہار اسکے اپنے مذاق اور انتخاب کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی نسبت کوئی شخص یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا ہے کہ

کیوں بعض پر اُن کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اور کیوں بعض پر نہیں کیا جاتا۔

یہ ہر ایک شخص کا اپنا اپنا انتخاب ہے۔ اس میں کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ چاہے کسی کا اپنا انتخاب دوسروں کی نگاہوں میں کیسا ہی اعلیٰ یا کم درجہ کا ہو

بعض راز جو ایک خاص وقت تک ظاہر نہیں کیے جاتے۔ انکی نسبت بھی
کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا۔ کہ کیوں اُن کا اظہار ایک خاص وقت پر موقوف
رکھا گیا اور رکھا جاتا ہے۔ یہ وُہی شخص اوروں کی نسبت زیادہ تر اچھا سوچ سکتا ہے
جو ایسا کہہ رہا ہے۔ بعض راز جو آخر تک اظہار میں آتے ہی نہیں۔ انکی نسبت
بھی کسی شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے کہ کیوں آخر وقت تک انکا اظہار
نہیں کیا جاتا۔ ہزاروں صورتیں ایسی عام صورتیں ہیں کہ اُن سے ایک شخص
یا ایک فرد بھی انکار نہیں کرسکتا اور انکے ثابت کرنے کے واسطے کسی دلیل
بازی کی ضرورت نہیں۔ کچھ ایسے محفوظ حصوں ہیں کہ ہر شخص انکا عادی
ہے۔ اور ہر شخص اُن کی اخیر تک حفاظت کرتا ہے۔ پہلی قسم قدرتی اسرار کی ہے۔
قانون قدرت یا قدرت کے کارخانوں اور تصرفات میں سے بہت سی
ایسی صورتیں اور ایسی کیفیتیں ہیں کہ جن کے رازوں سے ہم کچھ نہ کچھ واقف
ہیں۔ اور واقفیت پیدا کرتے جاتے ہیں بابت کچھ کرچکے ہیں اور بعض
ابھی ایسے راز بھی باقی ہیں۔ جن سے ہمیں کسی اور خاص وقت پر واقفیت
ہوگی۔ اور بعض ایسے راز بھی ہیں کہ جن سے ہم واقف ہی نہیں ہو سکتے
انسان جب قدرتی رازوں میں سے کوئی ایک آدھ راز کبھی کبھی معلوم کرلیتا
ہے۔ تو یہ فخر کرنے لگتا ہے کہ قدرت کا کوئی بھی ایسا راز نہیں جو اس کے حیطہ
ادراک سے باہر رہ سکے۔ یہ اس کی جلد بازی اور باطل لاف زنی ہے۔
ہم قدرت کے کل رازوں پر کیا اکثر رازوں پر بھی قادر نہیں ہو سکتے۔
ہم نے جس قدر راز اب تک معلوم کیے ہیں وُہ قدرت کے رازوں کا عشر عشیر
بھی نہیں ہیں۔
قدرت کے رازوں کی بھی دو ہی قسمیں اور وُہی صورتیں ہیں جو خود انسان

اور کمالات کے بھی ہم میں کوئی قدرت اور کوئی سکت نہیں - ایک ذرہ ہمارے
مقابلہ میں ایک پائدار ہستی رکھتا ہو - لیکن ہم اس سے بھی گئے گذرے ہیں - ایک
ذرہ کی کوئی حقیقت ہو اور ہماری کوئی حقیقت نہیں -

ایک جاہل ہی نہیں بلکہ ایک سائنس داں بھی مقابلہ جاہل کے اپنی ہستی کی
حقیقت کی بے حقیقتی سے ایسی بصیرت سے واقف ہوتا ہے - کہ اسکی عارفانہ نگاہوں
میں انسان کی ہستی سب ہستیوں سے بودی اور کچی ہے - اگرچہ اس کا عروج
حقیقی اس میں نہیں ہوتا ہے - جو ایک اور عالم میں جا کر منکشف ہوتا ہے - لیکن
اسکی اس عالم کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے - جو ہر رنگ میں کچی اور ناپائدار ہے -
قدرت کے مقابلہ سے اور محض انکار اور ہٹ دھرمی سے ہم پر کوئی حقیقت
نہیں کھل سکتی - استقلال اور بردباری ہی سے ہم ثابت قدم اور طمانیت کے مالک
ہو سکتے ہیں - ہم ہمیشہ یا ہم میں سے اکثر اس نکتہ سے بے خبر رہتے ہیں کہ
بہت سی ایسی باتیں اور بہت سے ایسے راز ہیں کہ جن سے واقف ہونا
ہماری زندگی کے مراحل میں ایک بیہودگی اور رذالت ثابت کرتا ہے - اور اکثر
اسرار کا ہم پر ایک خاص وقت میں ہی کھلنا ہماری زندگی کی ضروریات کے واسطے
ضروری ہوتا ہے - اگر اس وقت مقررہ سے پہلے اور مقررہ حدود سے باہر نکل کر ایک
راز ہم پر وا ہو جائے تو اسکا نتیجہ اسی طرح خراب اور مضر ہوتا ہے - جیسے کہ ایک
مولود کا وقت مقررہ کے پہلے جسم سے نکل آنا یا پیدا ہونا -

بہت سی ایسی باتیں ایسے راز ہیں کہ
انکا نہ کھلنا اور نہ معلوم ہونا ہی دنیا اور دنیا داروں کے حق میں سود مند ہے -
یہ صرف قدرتی اسرار سے ہی وابستہ نہیں - بلکہ خود انسانی رازوں کی کمی بھی صورت
بہ راز مفید بھی ہوتے ہیں اور مضر بھی اگر ایک ایک شخص کے برے اور اچھے راز

کا علم طور پر انکشاف ہوتا ہے اور کوئی شخص بھی اپنے متعلق یہ راز ہمیشہ تک محفوظ رکھے
تو نظام معاشرت میں صدہا خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ رہیگا۔

اسی طرح اگر قدرت اپنے اُن اسرار سے بھی ہمیں واقف کرا دے جو قابل اخفا ہیں۔ تو ہماری زندگی بجائے آسائش اور راحت کے یقیناً ایک دکھ میں پڑ جائیگی۔ مثلاً اگر یہ راز کھول دیا جائے کہ۔

مرنے کے بعد درحقیقت یہ ہوتا ہے۔ اسکے دو ہی نتیجے ہونگے۔

یا تو ہم خوشی کے مارے بالکل ہی آزاد اور بے لگام ہو جائینگے اور یا ہمیشہ سے قبل از وقت ہمارا خاتمہ ہوگا۔

اُمید و یاس بھی ایک راز ہے اور اسی پر ہماری زندگی کے نشیب و فراز کا بہت کچھ مدار ہے۔ اُمید کی حالت میں ہم آہستہ ترقی کی طرف جاتے ہیں۔ اور یاس ہمیں اکثر برائیوں سے روکتی اور ایک مناسب پیرایہ میں ہم کو تحریک کرتی ہے۔

اگر سب اسرار کھلے ہوں یا ادنیٰ توجہ سے کھل سکیں۔ تو اس صورت میں ہماری اکثر ترقیات کا دروازہ ارتقائی معنوں میں بالکل بند ہو جائیگا۔ ہم جو آہستہ آہستہ اوپر چڑھتے جاتے ہیں۔ اس حالت میں ہمارے اسلئے سب ترقیاں بلا تفصیل حاصل ہو جائینگی۔ بصورت تمام معاشرتی اور معادی مراحل کے واسطے ایک سخت روک ثابت ہوگی۔ قانون قدرت سے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ضابطہ کا مدعا ہمارا طبعی جادہ ہے۔ اور یہی ہمارے ضمیر کا منشی مسلہ ہے۔ جب ہم قانون قدرت کا مقابلہ کرتے ہیں تو ضابطہ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ضابطہ سے باہر نکلنا ہماری زندگی کے واسطے ایک سخت ٹھوکر اور مزاحمت ہے۔

ختم شد

مرزا سلطان احمد

پہنچتا جو پہلے نہیں پہنچ رہا تھا۔ کہیں کہیں صرف رنگ جدا دکھانے کے
لیے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ تھوڑی سی چاشنی پولٹیکل مضامین کی لگا دی۔
مگر یہ تدبیر خصوصیت میں پسندیدہ رہی اور نہ زیادہ کارگر ہو سکی۔ علم ادب
کی ترقی کوئی چھوٹا سا کام نہیں ہے۔ اگر ادبی رسالے اسی کی طرف دل و جان سے
متوجہ رہتے تو ملک کی اعلیٰ درجہ کی خدمت تھی۔ جن اصحاب کو سیاسی مضامین
سے خاص دلچسپی ہوتی اور جو سیاسی خیالات کی ترقی کے دلدادہ ہوتے۔
انہیں لازم تھا کہ سیاسیات کے لیے جداگانہ رسالے نکالتے جن میں سنجیدہ
اور پرمغز پولیٹکل مضامین سنجیدگی کے ساتھ لکھے جاتے۔ سیاسی مضمونوں
کے پہلو بہ پہلو سستی شاعری کے نمونے اور عام بازاری غزلوں کے ساتھ
پولیٹکل فلسفہ پروا رہا۔ ایک بے جوڑ بات تھی جس سے بعض ہمعصروں کو بہت
سی تکالیف اٹھانی پڑیں اور جس سے بعض کے رسالے اہل نظر کے نزدیک بے لطف
ہو گئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ "ادب" کے ایڈیٹر صاحب اس پرچہ
کو پولیٹکل مباحث سے علیحدہ رکھ کر خاص ادبی پرچہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس
ارادہ کے ساتھ جس بلند ہمتی سے انہوں نے کئی تصویریں مع ایک رنگین تصویر کے
دے۔ بڑی تقطیع پر عمدہ اور اہتمام سے چھاپنے کا تہیہ کیا ہے۔ وہ قابل
تعریف ہے اور ہم "ادب" کو شعر و سخن کا ایک خوش رنگ ترجمان سمجھتے ہیں اور
اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں جو امیدیں رسالہ کے متعلق
پہلے نمبر کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہیں پوری نہیں ہوئیں۔ دوسرے نمبر بھی
اسی انداز کے نکلے تو یقیناً "ادب" ہمارے اردو کے رسالوں میں
ایک مفید اضافہ ہوگا۔ اکثر ارباب سخن جن کے کلام نظم و نثر سے یہ پرچہ
مزین ہے۔ ہمارے اور ناظرین مخزن کے پرانے احباب میں سے ہیں۔

اور ایک آدھ نام کے سوا شاید ہی کوئی ہی نہیں جس سے ہمارے ناظرین آشنا نہ ہوں لیکن ہمیں امید ہے کہ حضرت ناظر کی نظر غائر کو ہنوز اہل قلم بھی ڈھونڈ نکالیگی۔ جو ان لوگوں کا نام شائع ہونے سے اس میدان میں موجود ہیں اور مدتوں سے ہمارے نامور رسالوں کی بلا معاوضہ خدمت کر رہے ہیں

ہم اسے لائق ہم عصر کے ممنون ہیں کہ انہوں نے پہلے نمبر میں محررین کی خدمات کا خصوصیت سے اعتراف کیا ہے اور ہم دل سے "ادیب" کی کامیابی کے لیے دعا مانگتے ہیں۔

عبدالقادر

"ادیب" کا چندہ سالانہ چار روپیہ ہے اور ایک پرچہ کی قیمت ۶ ہے۔

اس کی ضخامت فی الحال ۴۸ صفحے ہے۔ اور ایک صفحے میں دو کالم ہیں "ادیب" انڈین پریس۔ الہ آباد مینجر سے خط و کتابت ہونی چاہیے۔

رسالہ تذکرۂ عالم ایک عجیب تاریخ ہے جو ماہواری حصہ وار طبع کی جا رہی ہے اسکی رنگین بیش بہا و نگینات کی تصاویر جو ۱۸ × ۲۲ تختی پر چھاپی گئی ہیں قابل دید ہیں منشی ملا قیوم مسٹر صاحب مالک میور پریس دہلی نے جو محنت و جانفشانی و صرف کثیر اس رسالہ کے طبع میں کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ کاغذ بہتر چھپائی صاف تصاویر دلکش۔ قیمت فی نمبر مع محصول ڈاک ایک روپیہ۔

میور پریس دہلی سے ملتا ہے

قومی مرکز

از حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب شیروانی جائنٹ سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ علیگڑھ

گو نصف صدی میں ایسے مواد اور دیگر وجوہ حاصل ہوئے مگر اب عام ایک گیتیں رہ گیا
جملہ شخص یہ کہ "اتحادِ قومی" یعنی عزت قومی حفظ اور کامیابی کے واسطے
سب سے زیادہ ضروری صفت ہے قرآن مجید میں مسلمانوں کو مل کر دین کی رسی مضبوط
پکڑنے کی خاص ہدایت ہے جس سے صاف اتحادِ قومی کی جانب اشارہ ہے۔ جن
لوگوں نے اس زریں اصول پر نظر غور ڈالی ہے اور جن لوگوں نے اسکے ذرائع پر
غور کیا ہے وہ ضرور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اتحاد قومی کے واسطے کسی قومی مرکز کا
ہونا لازمی ہے۔ ریاضی کا قاعدہ کلیہ ہے کہ کائناتِ عالم میں کوئی شے مرکز
سے خالی نہیں ہے۔ گو قومی اتحاد تو بغیر مرکز کے ناممکن ثابت ہوا ہے ہمیشہ
وہی قوم معزز سمجھی جاتی رہی ہے جس کا کوئی مرکز ہو اور جو اپنے مرکز کی حرمت
کی پوری پوری حفاظت کرتی رہی ہو اور ایسے مرکز کی عظمت و سطوت لوگوں
کے دلوں میں بٹھاتی رہی ہو پھر ایسے مرکز کی ترقی میں ساعی رہتی ہو ہر ایک
قوم باوجود اس آزاد خیالی کے قومی عظمت کی خاطر ضروری سمجھتی ہے۔ پیرس کو
اپنا قومی مرکز ظاہر کرے اور اسکو ترقی دے تاکہ اس کی عظمت لوگوں کے دلوں
میں جاگزیں ہو۔ انگلش قوم لندن کی شوکت بڑھانے اور اس کو عظیم الشان
ظاہر کرنے میں کس قدر کوشش کرتی ہے۔ جرمن قوم کی دنیا میں وقعت
اسی وقت سے ہوئی ہے جب سے جملہ ریاستہائے جرمن نے متفقہ طور برلن
کو اپنا مرکز تسلیم کیا ہے۔ خواہ حقیقتِ حال کچھ ہی ہو۔ مگر یونانی قوم ایتھنز
کے نعرہ کو قسطنطنیہ سے بہتر ظاہر کرنے میں ابھی دریغ نہیں کرتی۔

اُسکے زیر زمین مادہ آتشیں ہونے کی وجہ سے ٹوکیو کی حالت کیسی ہی خطرناک ہو اور آئے دن کے زلزلوں کا سلسلہ کیسا ہی نقصان پہنچاتا ہو مگر جاپان کے سوا جاپانی قوم سے اُنکے مرکز کی نسبت دریافت کیجیے جس کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے اُنکے منہ خشک ہوتے ہیں۔ بس اس وجہ سے اس لئے کہ قومی عظمت کے واسطے یہ اقوام مرکز کی ضرورت اور اس کی سطوت کے اظہار کو ایک جزو لاینفک سمجھتی ہیں اور برابر قومی مرکز کو ترقی دیتی رہتی ہیں۔ جن لوگوں نے بنظر تعمق مذہب پر غور کیا ہو وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مذہب جو درحقیقت قومیت کی بنیاد ہے اُس میں بھی مرکز کا لحاظ رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہو۔ کسی مذہب کے ماننے والے کے دل کو مرجانے کی جگہ ہو اگر اُس کے مذہبی مرکز کی نوبت کی آواز اس کے کان میں آئے جن لوگوں کو حج خانہ کعبہ کا شرف حاصل ہوا ہو۔ اُن سے دریافت کیجیے کہ اس معدن مرکز اسلام پر پہلی نظر پڑنے کا اُن کے دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ روحانی مسرت، وہ دلی اُمنگ وہ قلبی جذبہ تحریر میں نہیں آسکتا جو زائرین بیت اللہ کو اُس وقت حاصل ہوتا ہو جبکہ اپنے لاکھوں ہم قوموں کے سامنے ایک لباس میں اُس مقدس اسلامی مرکز میں اپنے تئیں دیکھتا ہے (زاد اللہ شرفًا و تعظیمًا) جس قوم کے مرکز کا جتنا دائرہ وسیع ہو اُسی قدر اُس قوم کی عظمت دنیا میں تسلیم کیجاتی ہے۔ امریکہ کے عظیم الشان براعظم میں جسکو دنیا کا نصف حصہ کہا جا سکتا ہے برازیل وغیرہ اور بھی بڑی بڑی سلطنتیں ہیں مگر امریکن قوم کا مفہوم یہاں دنیا میں وہی قوم ہے جس کا مرکز نیویارک ہے اور جو عظمت سلطنت متحدہ امریکا کی دنیا کی نظر میں ہے وہ کسی دوسری امریکن سلطنت کی نہیں ہر اس کا یہی باعث ہے کہ یونائیٹڈ

سائنس کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔

برخلاف اس کے جن قوموں نے اپنے مرکز کے بدلنے میں یا مرکز کی جانب سے بے پرواہی کی اس دنیا میں انکو نقصان اٹھانا پڑا۔ ہندوستان کی شوکت او عظمت کے بہت سے پرانے قصے سننے میں آئے ہیں اس قوم کی قدیم سطوت وجبروت کے بہت سے افسانے مشہور ہیں مگر صفحۂ کاغذ پر جسے کہ اس ملک کی تاریخ شروع ہوتی ہے اتحاد قومی جو اقتصادی ترقی اور امن وآسائش کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس کا یہ ملک ہمیشہ متا برخلاف اس کی حالت عناد و دشمنی سے جو بربادی کا باعث ہے اس ملک کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ آریاؤں نے غیر آریاؤں کو نکال دیا، مہاراجہ کورو اور پانڈو کے بیٹے آپس میں لڑ پڑے اور ملک میں تباہی و بربادی برپا ہو گئی۔ ہستناپور کے راجہ کوج اور پانی پت کے فرمانرواؤں کی جان کے خواہاں رہے۔ یہ اور اسی قسم کے واقعات اس ملک کی قدیم تاریخ میں نظر آتے ہیں اور قومی اتحاد جس سے قومی عظمت کا پتہ چلتا ہو اس سے ہندوستان کی تاریخ کا یہ حصہ موجودہ حالت میں تو خالی نظر آتا ہے ایسا کہ ہندوستان کی موجودہ قدیم تاریخ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جاری ہے۔ خدا کرے کہ جو تاریخ تیار ہو رہی ہے اس میں اتحاد قومی کی مثالیں مل سکیں۔ مگر موجودہ صورت میں تو ہم اس زمانہ کو بہترین زمانہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔ اگر غور کیجیے تو قدیم زمانہ کی سب سے بڑی خرابی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں مرکز کا خیال مفقود ہو گیا تھا۔

اگر توجہ سے دیکھیں تو دنیا میں مسلمان قوم کی عظمت کے زوال کا وہ پہلا دن ہے جبکہ معاویہ شام کے گورنر نے اسلام کے مقدس پایۂ تخت پر

کا حصہ نہیں ہے۔ علیگڈھ کو ہندی مسلمانوں کا قومی مرکز ہز ایکسیلنسی لارڈ منٹو
وائسرائے ہند نے بھی تسلیم کیا۔ دیکھو لارڈ منٹو جو درحقیقت ہندوستان
کی اصلی حالت سے پورے طور پر واقف ہیں اور جنکی خاص پالیسی اپنا
نظیر نہیں رکھتی اور جنھوں نے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ صرف مسلمانوں کے
بلکہ ملک ہند کے سچے خیر طلب ہیں۔ اور جنکی عظمت نہیں بلکہ محبت مسلمانوں
کے دلوں میں ہے۔ یہی لارڈ منٹو یکم اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کے مسلمانوں کے
مشہور شملہ ڈپوٹیشن کے ایڈریس کے جواب میں علیگڈھ کی نسبت ایک فقرہ
کہتے ہیں "علیگڈھ کامیاب ہو چکا ہے اسنے تعلیم یافتہ ایسے عقاید کی مضبوطی
حب الوطنی اور وفاداری کے اصولوں کو پورے طور پر ذہن نشین کر کے
زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنیکے لئے دنیا کے کھاڑے میں اُترنے لگے ہیں اور
اسوقت جبکہ ہندوستان کی پولیٹکل مستقبل میں بعض نازک مسائل درپیش
ہیں سرسید احمد خاں کی پاک روحانی تاثیر اور علیگڈھ کی تعلیم نے اپنی چمک
صاف طور پر دکھائی ہے جس پر مسلمانوں کی تاریخ کو ناز ہے۔" کیا
وقت نہیں آگیا کہ ایسے قومی گھر علیگڈھ کی مرکزی حیثیت کی تمام مسلمان متفق
ہو کر حفاظت کریں اور اسکو ترقی دیں۔ جس پر مسلمانوں کی قومیت
کی عظمت کا دارومدار ہے اور جسکے سرسید جیسے محسن نے اپنی زندگی
اور محسن الملک جیسی بیش قیمت عمر قربانی چڑھا چکی ہے اور جس پر محسن
چالیس برس سے لگاتار محنت کر رہے ہیں اور جو ہر درجہ عروج جیسا
ہے جسکا اوپر تذکرہ ہوا۔ ضرور ایسا وقت آگیا ہے اور مسلمانوں کو ایسا
ہی کرنا چاہئیے۔

نوٹ۔ مولانا سلیم صاحب پانی پتی کے مسلسل مضامین تمدن عرب کی باقی قسطیں آئندہ نمبر میں درج ہونگے۔

حُسن

گردت سنگھ

نازک بدنوں میں تو لچک ہے — چال کج رو میں ٹھمک ہے
بجلی کی کڑک کڑک جلال تیرا — اور اسکی چمک جمال تیرا
تو نہر میں - نہر کا پانی — تو لہر میں - لہر کی روانی
تو گل میں شاخ - شاخ میں گل — تو جسم میں زلف - زلف میں طول
تو ابر میں برق - برق میں ضو — تو بزم میں شمع - شمع میں لَو
روشن بنکر شکن جبیں سے — ظاہر معشوق کی ہنسی سے
ڈورے ڈالے نگاہ بنکر — دل لے چشم سیاہ بنکر
تو فلس سے زیب جسم ماہی — تو تاج سے زیب فرق شاہی
آرائش پیکر فلک تو — تاروں کے لباس میں چمک تو
تو سنگ سے رنگ بنکے ظاہر — چمکے ترے نور سے جواہر
آئی ہیرے میں آب تجھ سے — پائی موتی نے آب تجھ سے
تو لعل کی چھوٹ - لعل کا رنگ — پکھراج کا زرد - خوش نما رنگ
تو راستی اور تو درستی — تو مُنہ کا سکوت ن کی چُستی
روشن کہیں ہو کے قابلیت — ظاہر کہیں ہو کے پاک نیت
ایمان میں تو ہے نور بنکر — زاہد کی ہوس میں حور بنکر
ہموار مزاج سے ہو جو شے — دل اور حسن قیاس میں تو ہے
تو حلم کی شان ضبط کے ساتھ — تو لطف کی جان ربط کے ساتھ

ہائے وہ دن دل کے ٹکڑے تھے جو آنکھوں کی راہ
ہائے وہ دن بستر غم تھا کسی کا دل نشیں

ہائے وہ دن بیٹھ جاتے تھے کلیجہ تھام کر
یاد آتی تھی جو اک کافر کی چشم سرمگیں

ہائے وہ دن تا بہ دن پھرتے تھے ہم دیوانہ وار
لگ گیا تھا جیسے کچھ آتش جو داغ آنا دیں

ہائے وہ دن لوٹتے تھے وصل کی سوگند پر
وہ شب ہجر تھے آغوش تصور میں حسیں

تیر دلدوز تھی نگاہ دلربا اپنے لئے
تیغ و خنجر تھی ہماری واسطے چین جبیں

آس وصل یار کی کھوئی تھی ہم کو سادہ کام
یاس ہوتی تھی تو ہوتے تھے پرستان حزیں

ضبط کی کرتے تھے ہم ہر چند کیا کیا کوششیں
لیکن اس پر بھی بھڑک اٹھتی تھی آہ آتشیں

انتظار یار میں کٹتی تھی اپنی عمر ہائے
کسی کے چین آتا ہی نہ تھا ہم کو کہیں

بستر غم پر بدلتے تھے ہمیشہ کروٹیں
تھا قرار دل کوئی غارتگر دنیا و دیں

اب تو اے حامد ہمارا حال ہی کچھ اور ہے
ہائے وہ باتیں وہ سب کیسی کہاں کیا ہو گئیں

دل میں دود وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

[illegible]

تازہ غزلیں

سامنے آئینہ تھا مستی بھی
اس پہ اک شان خود پرستی تھی

مجھ کو کعبے میں بھی ہمیشہ شیخ
یاد ایام بت پرستی تھی

ہائے کیا پوچھتے ہو حال اسد
کیا بتاؤں کہ کیسی مستی تھی

آج مقتل میں ہی کچھ اور سماں
اف یہ کیسی دراز دستی تھی

کیوں زلیخا تری عدالت میں
حسن کی جنس ایسی سستی تھی

صرف دل ہی نہیں جلا امیر
نقد نقد میں اس کی بستی تھی

شو بختا تھا نہ انتظار میں کچھ — دیکھنے کو مگر ترستی تھی
کیا غمِ مرگ کشتۂ حسرت — اس کی ہستی بھی کوئی ہستی تھی
دیکھنے ہم گئے تھے قبرِ عزیز
ہائے کیا بیکسی برستی تھی

[illegible]

تم مرے گھر میں ہو گھر کا اجالا ہو کر — دل میں آجاؤ مرے دل کی تمنا ہو کر
شیخ صاحب کو یہ کیا سوجھی ہے دانا ہو کر — کعبہ جانے کا ارادہ ہے کلیسا ہو کر
میرا یوسف جو کبھی خواب میں مجھ سے لپٹا — کھل گئی آنکھ مری چشمِ زلیخا ہو کر
اس قدر اے مرضِ عشق سکھا دے ہم کو — چشمِ دشمن میں کھٹکنے لگیں کانٹا ہو کر
کل مرے پاس آکے مرے دل کو وہ تڑپائے گا — رہ گیا آج کئی بار تقاضا ہو کر
رازِ الفت کہیں کم ظرف چھپا سکتا ہے — غیر رسوا کرے آپ کو رسوا ہو کر
میں تو کیا چال ہو دشمن کی رسائی ہو جائے — یہی چل جائے اگر آپ کا قصہ ہو کر
چشمِ کم مت مرے آنسو کو رہ دیکھے کوئی — رنگ لائیگا یہ قطرہ کبھی دریا ہو کر
غیر سے کیا ہمیں امید دمِ بسمل ہو — دل ہی جب غیر ہوا جاتا ہے اپنا ہو کر
آتے جاتے کبھی ٹھوکر وہ لگا ہی دیں گے — تم گئے راہ میں ہم نقشِ کفِ پا ہو کر
عشق ہے اچھا کہ تڑپتے ہیں کئی برس میں ہم — ہوش آجائے نہ سر سے یہ سودا ہو کر
بڑھ چلے درد کی لذت نہ کہیں یہ عالم — رنگ لائے نہ مرا زخمِ دل اچھا ہو کر

عابد حسن فخیری [illegible]

تنہا مری نگاہ میں صحرائے یاس ہے — حسنِ زن سے بھی اداس ہے عالم اداس ہے
نالوں کو بھی کسی کی نزاکت کا پاس ہے — اے صبر المدد فقط اب تیری آس ہے
کم ہو جی مجھ کو نزع میں بھی اک دوسرا خیال — وہ جانتے نہیں موت سے اس کو ہراس ہے

ترقی اردو

کی

جو کوشش رسالہ ادیب الہ آباد کے ذریعہ سے شروع کی گئی ہے وہ ہر علم دوست
کی امداد اور سرپرستی کی مستحق ہے اس میں عمدہ ادبی مضامین کسی مسلمہ
قابلیت کے اہل قلم سے لیے جاتے ہیں اور ہندو مسلمان مرد و عورت
ہر فرقے ہر طبقے کے لیے یکساں خوش گوار ہوتے ہیں ہر پرچہ میں ایک اعلیٰ درجہ
کی رنگین اور ست کلر عکسی تصاویر بھی دی جاتی ہیں جن میں مشاہیر حضرات کے
فوٹو تاریخی عمارات کے نقشے اور آثار قدیمہ کے مرقعے ہوتے ہیں سایز ماڈرن ریویو
وغیرہ انگریزی رسالوں کے مطابق ہے اور وہ کاغذ وغیرہ بھی بعینہ ویسا ہی
عمدہ اور چکنا لگایا جاتا ہے اس اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ادیب عمدہ سے عمدہ
انگریزی رسالوں سے ہمسری کر سکتا ہے مضامین نظم و نثر کا اتنا سرمایہ
مرتب ہوگا جو کئی روز تک پڑھنے کے لیے کافی ہے باایں ہمہ قیمت صرف چار روپیہ سالانہ

فی پرچہ ۶ر

نمونہ مفت نہیں دیا جائیگا ملک کے تمام نامور اخبارات اور اہل الرائے نے بالاتفاق
اس کوشش کی داد دی ہے

اکسیر الحیات

اکسیر الحیات

اکسیر الحیات

اکسیر الحیات

اکسیر الحیات

اکسیر الحیات

دافع بواسیر

کے سلسلہ میں ان چیزوں کی قیمت نصف سے بھی کم کردی گئی ہے
آٹھ روزہ چابی کی جیبی گھڑی
حیرت انگیز چڑیا

پتہ ایس ـ ای ـ ٹی کمپنی ایسٹکو کومٹی مرہ ۲۳ کولو ٹولہ اسٹریٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۳ کلکتہ

مخزن

عالمگیر ماتمِ قیصری

قیصرِ ہند اڈورڈ ہفتم جہاں سے گذر گیا اور سارا عالم برطانیہ کے خاندانِ شاہی کے ساتھ اس طرح شریکِ ماتم ہوا کہ تاریخِ عالم میں اس کی مثال نہیں۔ اس عالمگیر ماتم کا راز کیا ہے؟ اس کا راز خاندانِ شاہی کے اوصافِ حمیدہ اور اراکینِ خاندان کی پسندیدگی ہے۔ ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے عہد میں جو ہردلعزیزی خاندانِ شاہی کو حاصل ہوئی اُس میں شہنشاہ اڈورڈ مرحوم کی نمایاں طور پر شرکت تھی۔ اور اُس نے اسے زمانہ شاہزادگی میں ہی اس ہردلعزیزی کی بنیاد ڈالدی تھی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ شہنشاہ کے واقعاتِ زندگی منصفانہ نظر سے جانچے جائیں اور تاریخ کوئی حکم لگائے۔ کہ دنیا کے بڑے بڑے فرمانرواؤں کی فہرست میں اڈورڈ ہفتم کا کونسا درجہ ہوگا لیکن جہاں تک عام رائے کا اظہار اب تک ہو چکا ہے اُس سے ایسا اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں۔ کہ اڈورڈ ہفتم باوجود مختصر زمانہ سلطنت کے ہمیشہ رہنے والا نام چھوڑ گیا ہے اور خیرخواہ خلائق بادشاہوں کی صفِ اول میں ضرور اس کی جگہ ہوگی۔

رسماً تو لوگ بادشاہوں کا ماتم کیا ہی کرتے ہیں۔ ہر ملک و قوم میں کم و بیش یہ رواج موجود ہے۔ مگر یہ کسی کسی بادشاہ کو نصیب ہوتا ہے کہ لوگ اسے دل سے روئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اڈورڈ کو لوگ دل سے رو رہے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ اڈورڈ کی طبیعت میں اپنی

اپنی عظیم ماں کی طرح انسانیت کا عنصر بادشاہی پر غالب تھا۔ اور یہی وہ خصلت اور یہی وہ ادا
ہے جو انسانوں کے دلوں کو مسخر کرتی ہے۔ یعنی جس طرح ملکہ آنجہانی۔ اچھی ملکہ ہونے کے علاوہ
اپنے شوہر کی اچھی بیوی اور اپنے بچوں کی اچھی ماں تھی۔ اسی طرح اڈورڈ ہفتم اپنی بیوی کے
حق میں اچھا شوہر اور اپنے بچوں کے حق میں اچھا باپ تھا۔ اور یہ وہ باتیں تھیں جو اسے
رعایا کے ہر طبقے کے قریب لاتی تھیں اور جنکے سبب انگلستان والے اسے دل سے
پسند کرتے تھے۔ وہ تاج شاہی کا اعزاز خواہ کیسا ہی کریں اور تخت کا احترام خواہ
انکے آئین کا جزو ہو مگر ان چیزوں سے صاحب تاج و تخت کے ساتھ ارادت اور
محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ خود تاجدار اپنے اخلاق سے اُن آزادی پسند
لوگوں پر یہ ثابت کر دے۔ کہ وہ اُن کا سا انسان ہے۔ اُن سے حیثیتِ انسانی
ہر طرح کی ہمدردی رکھتا ہے اور اپنی وجاہت اور اعزاز اور دولت کو اُنکی خدمت اور
اُنکی بہتری میں صرف کرنیکو آمادہ ہے۔ شہنشاہ اڈورڈ نے اپنی رعایا کو یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ
وہ کسی وقت انکے خیال سے غافل نہیں۔ خاص خاص موقعوں میں ایک لفظ وہ کام
کر جاتا ہے جو معمولی حالات میں لمبی لمبی تقریروں اور تحریروں سے نہیں نکلتا۔ نو برس ہوئے
جب تاجپوشی کی رسم کی تیاریاں زور شور سے لندن میں جاری تھیں اور لوگ کوچہ و بازار
کی آرائش دلی جوش و شوق سے کر رہے تھے اور دور دور سے جلوس کی سیر دیکھنے والے
لندن میں آ رہے تھے اور آ لئے تھے۔ کہ اچانک بادشاہ بیمار ہوئے اور رعایا سخت
پریشان ہوئی۔ اس بیماری میں جس میں بادشاہ کی جان نہایت خطرہ میں تھی۔ بادشاہ
کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:۔ "کیا میری رعایا مجھے معاف کریگی؟" ان الفاظ کے شائع ہونے
سے دل جو پہلے ہی رقت سے بھرے ہوئے تھے اور بھی پگھل گئے اور دعائیں بے اختیار
دلوں سے نکلکر عرش معلیٰ تک پہنچیں کہ خدایا ایسے نیک نیت رحمدل بادشاہ کو صحت دیجیو۔
قبول کی گھڑی تھی۔ بادشاہ کی زندگی باقی تھی۔ کئی کارہائے نمایاں اس کے عہد میں

ہونیکے لئے ازل سے تقدیر میں بندھے تھے۔ دعا سنی گئی۔ مصیبت ٹل گئی۔ نازک اپریشن کا عمل جراحی نہایت کامیابی سے ہوا اور بادشاہ مرض مہلک سے جانبر ہو گئے۔ رعایا نے جس سچی مسرت سے صحت یابی کی خوشیاں منائیں۔ سب کو معلوم ہے۔ رسم تاجپوشی ادا ہوئی۔ بادشاہ گو باعتبار عمر سن رسیدہ اور بتقاضہ علالت سے ضعیف اور مضمحل تھے۔ مگر ہمت جوان تھی۔ تاج سر پر رکھتے وقت پھر ایسی بات کہی کہ ساری رعایا کو موہ لیا۔ کہنے لگے "جب تک دم میں دم ہے میں خدمت خلق اللہ سے منہ نہیں موڑونگا" جیسا کہ آنکا یہ وعدہ تھا ویسی ہی مردانگی کے ساتھ اسے شہنشاہ ایڈورڈ نے پورا کیا۔ مرتے دم تک کام میں معروف رہے۔ زندگی کا آخری دن بھی ادائے فرائض منصبی سے خالی نہ تھا۔

ڈیلی کرانیکل کیطرف سے ایک انگریزی نظم شہنشاہ متوفی کی شان میں چھپی ہے جس میں انکی مردانگی کی قدردانی کا اظہار سادہ مگر پُر اثر الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ترجمہ میں اصل زبان کا لطف تو نہیں آتا۔ مگر حالات کی خوبی چھپی نہیں رہتی :-

"اہل روما کا قول تھا کہ بادشاہ مرے تو کھڑا ہوا۔ اور یونہی اگلے
بادشاہ مرتے تھے۔
شہنشاہان روما گذر گئے۔ مگر یہ قول ابتک زندہ ہے اور اس کا مفہوم
ہے ادائے فرض۔ اور زندگی جاوید۔
ہماری آنکھوں نے بھی یہی مثال دیکھ لی۔ ایک اور بادشاہ جہان سے
گذرا جو دم آخر تک اس اعلیٰ شہنشاہی اصول پر کاربند رہا۔
بس ہم میں چاہے کوئی اختلاف ہو۔ ہم سب جو اس حکمران کے زیر فرمان
تھے۔ ایک بات میں متفق ہیں کہ ایسے باپ کے بیٹے کا دل سے خیر مقدم
کریں اور کہیں کہ بادشاہ بدستور زندہ رہے"۔

الحمد للہ ہم کو جو انعام پابندی فرض کا خدا کے ہاں ملیگا اسکا حساب تو ہم کیا لگا سکتے ہیں

لیکن نیکی کا نیک بدلا اسی جہان میں ملتا دیکھ لیجیے۔ کہ آخر وقت کی ذرا سی تکلیف برداشت کر کے مرنیوالا اپنی اولاد کی جڑیں مضبوط کر گیا اور اپنے جانشین کے راستے میں پھول بچھا گیا۔ لوگ اب جارج پنجم کے آگے آنکھیں بچھانے کو تیار ہیں۔ کیونکہ انہیں امید ہے کہ لائق باپ کا سپوت بیٹا ایسا ہی عہد وفا باندھے گا اور اسی طرح اُسے نباہیگا۔

ماہ مئی کی چھٹی ساتویں تاریخ کے اخبارات میں جب اب پہلے قیصر ہند کی بیماری کی تردید میں آنے والی خبریں اور پھر انکے انتقال کے حالات شائع ہوئے یہی سوچ تھا کہ قصر شاہی کے باہر ہجوم خلائق ہر وقت رہتا ہے اور وہ لمحہ لمحہ کی خبر اس تشدد تردد سے دریافت کرتے رہتے ہیں۔ جیسے انکا کوئی اپنا عزیز بیمار ہو رہا ہو۔ اور ذرا سی اچھی خبر سے شگفتہ اور ذرا سی زیادتی کی خبر سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمدردی یہ تردد کوئی یکطرفہ ہمدردی نہ تھی کہ صرف رعایا کو ہو اور بادشاہ کو نہ ہو۔ بادشاہ بستر مرگ پر بھی انکی تکلیف سے متاثر تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کئی مرتبہ یہ خواہش ظاہر کی۔ کہ بیماری کی اصلی خبر ظاہر ہو جائے تاکہ لوگ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔

خاندان شاہی کی بہت سی ایسی باتیں ہیں جو گرویدہ کرنے والی ہیں لیکن شہنشاہ اڈورڈ کی تجہیز و تکفین کے دنوں میں حسن انتظام کا ملکہ الگزنڈرا اور شاہ جارج پنجم نے ثبوت دیا ہے۔ وہ بہت ہی قابل داد ہے۔ اُن کے ہاں رواج ہے کہ دفن سے چند روز پیشتر نہلا دھلا کر بادشاہ کے جنازہ کو قصر شاہی یا کسی اور ایوان میں رکھ دیتے ہیں کہ لوگ آخری دیدار کر لیں۔ اس دیدار کو ملکہ الگزنڈرا نے عام کر دیا۔ ویسٹمنسٹر ہال میں جب جنازہ رکھا گیا تو اذن عام تھا کہ ہر کہ و مہ بلا لحاظ جاہ و مرتبت اپنے بادشاہ کو آخری نظر دیکھ لے اور ہزارہا آدمیوں کی قطاریں میلوں لمبی صبح سے رات تک اندر جاتی اور چشمہائے پرنم کے ساتھ آخری سلام کر کے نکلتی جاتی تھیں۔ یہ شہنشاہ انگلستان و ہندوستان کا آخری عہد تھا۔ جس میں حاضر ہونے کی منت سے ہر غریب فقیر کو اجازت دیدی گئی

وقت خوبیاں کا بے نوحہ لکھنا تم ان کے بے ریا آنسو بتا رہے تھے کہ مرنے والی نے کس طرح
ان کے دلوں میں گھر بنا لیا ہوا تھا۔ یوں تو جہاں کہیں برطانیہ کا جھنڈا لہراتا ہے۔ شہنشاہ
ایڈورڈ کا سایہ رعایا کے سروں پر سے اٹھ جانے کا صدمہ ہے۔ مگر اہل انگلستان کے لئے
اور خاصکر لندن والوں کے لئے۔ آخری سفر جس قدر رقت انگیز ہوتا کم تھا۔
کیوں نہ ہو۔ مدت العمر کا ساتھ چھُٹ رہا تھا۔ گذشتہ نصف صدی میں کوئی بڑا کار خیر
ایسا مشکل سے ہوا ہوگا جس میں ایڈورڈ ہفتم نے اول بہ حیثیت ولیعہدی اور پھر بہ حیثیت
شاہی شرکت نہ کی ہو۔ حسن قابل یادگار زندگی کے ڈرامے کا آخری پردہ وسٹ منسٹر
کے تاریک کمروں کے پُر سکوت۔ عبرتناک۔ مگر شاندار منظر پر اٹھا ہے۔ اس زندگی کے
باقی دلچسپ منظروں کی جانکوش تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔ ناظرین
انہیں ایک نظر دیکھ لیں۔ کیونکہ آخری پردہ گرنے کو ہے اور سارے کا سارا مرقع ہمیشہ
کے لئے آنکھ سے اوجھل ہونے کو ہے پھر دیکھنے والے کی فقط یاد رہ جائیگی اور اسکا نیک نام۔

(۱) ۱۸۴۱ء میں نومبر کی نویں تاریخ قصر بکنگھم میں جشن شادمانی منایا جا رہا ہے۔ جوان اور نیک نہاد ملکہ وکٹوریا
کے ہاں وارث تاج و تخت پیدا ہوا ہے۔

(۲) ۲۵ جنوری ۱۸۴۲ء میں مولود مسعود کے نام رکھنے کی رسم ادا ہو رہی ہے۔ قلعہ ونڈسر کے شاہی
محلات میں چہل پہل ہے۔ کنٹربری کے لاٹ پادری صاحب رسم ادا کرنے آئے ہیں اور مولود
ولیعہد نے البرٹ ایڈورڈ نام پایا ہے۔

(۳) ملکہ جیسی ماں اور پرنس البرٹ جیسے باپ کی خاص نگرانی اور تربیت میں ہونہار بچہ
جسمانی اور دماغی ترقی میں اپنی عمر اور ہمجولیوں سے بڑھ کر قدم بڑھا رہا ہے۔ ابتدائی عمر میں ہی
ضروری نوشت و خواند اور علوم متعارفہ میں عمدہ مہارت حاصل کر چکا ہے۔

(۴) کالج میں جانے کا وقت آگیا۔ ایڈنبرا کی صحت بخش آب و ہوا اور وہاں کی یونیورسٹی ہے اور
شہنشاہ شہزادہ۔ عام طالبعلموں کی طرح ڈگری حاصل کرنا تو کوئی منزل مقصود نہ تھی۔ ایک

درسہ اڈنبرا کی تعلیم سے مستفید ہونے کے بعد قرار پایا کہ انگلستان کی دو نامی یونیورسٹیوں کے
فیض سے بھی شاہزادہ کا علم جلا پائے اور وہ یونیورسٹیاں بھی اپنے فخر میں اڈنبرا کی شریک
کر دی جائیں۔ چنانچہ آکسفورڈ میں کرائسٹ چرچ اور کیمبرج میں ٹرینٹی ہال نے یہ ناز پایا
ہے کہ البرٹ ایڈورڈ اسی میں ممتحن رہا ہے۔

(۵) علمی ترقی کے بعد فنونِ حرب کی نوبت آئی۔ کیونکہ شاہی سپہگری کے بغیر ممکن نہ تھی اور ۱۸۵۸ء
میں جوان ایڈورڈ فوج میں کرنیل بنایا گیا۔

(۶) کوئی تعلیم بغیر سیر و سفر کے مکمل نہیں ہوتی۔ اس لیے اوائل عمر میں ہی شاہزادہ کو سیاحت کے
شوق نے گھیر لیا اور اسی سیاحت سے وہ وسعت نظر اس نے حاصل کی جس نے آخر میں
شہنشاہ کا ایسا نام پیدا کیا۔ ابھی اٹھارہ برس کا سن تھا کہ ۱۸۵۹ء میں اٹلی اور سپین
کی سیر کا حکم ہوا۔

(۷) اٹلی اور سپین کی سیاحت ایسی سیاحت تھی کہ اگلے برس ۱۸۶۰ء میں انگریزی علاقہ کینیڈا
میں حیثیت جانشین شاہی کے ترک دم ہونے جانا ہوا۔ اور جیسے خاطر خواہ تھے وہاں
ان مرحوم کا استقبال ہوا کہ یادگار رہیگا۔ نئی پارلیمنٹ تہرا اوٹاوا میں قائم ہوئی تھی۔ حیثیت مند
دراکمین کینیڈا نے اپنی آئینی حکومت کے مرکز کا سنگ بنیاد شاہزادہ کے ہاتھوں رکھوایا۔

(۸) کینیڈا سے چل کر امریکہ کی سیر کی۔ واشنگٹن کی قبر پر زیارت کے لئے جانا تھا کہ اہلِ امریکہ
کے دل شکار ہو گئے اور نہایت اچھا اثر پڑا۔

(۹) جہاں میں شادی و غم دوام ہیں ۱۸۶۱ء میں شاہزادہ کو اپنے شفیق باپ کے سایہ سے محروم ہونے
کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ مگر اسی سال میں شاہ ڈنمارک کی لڑکی شاہزادی الگزینڈرا سے ملاقات
نصیب ہوئی۔ جو جسکو ملکہ الگزینڈرا بنکر سب میں ہر دلعزیز ہوئی۔

(۱۰) ۱۸۶۲ء میں شاہزادہ نے اپنا مذہبی فرض ادا کیا۔ یعنی بیت المقدس اور اسکے حوالی کی
زیارات کے لئے گیا۔ باپ کی وصیت بھی تھی اور اپنا شوق بھی۔ یہ سفر بھی بہانہ تھا [illegible]

(۱۱) ۱۸۶۳ء میں پریوی کونسل کی ممبری اور لارڈوں میں جلوہ افروزی کا اعزاز شاہزادہ کو دیا گیا۔ انگریزی آئین کی رو سے یہی ہے کہ شاہزادے شاہی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور بہت سے امور میں شرفائے رعایا کے ساتھ بھی شریک ہیں۔ اس سے سلسلۂ یگانگت مضبوط ہوتا ہے۔

(۱۲) آپ کی تزویج اسی ۱۸۶۳ء کی عام انگلستان کے لئے یادگار شادی سے کم نہ تھی۔ شاہ ڈنمارک کو شاہ ڈنگر کہتے ہیں۔ اور گھر گھر خوشیاں ہو رہی تھیں کہ ہمارا شاہزادہ ساد ہکر کی بیٹی بیاہ لایا ہے۔ جیسا شوہر تھا ویسی ہی بیوی ملی۔ آتے ہی رعایا کے دلوں میں بس گئی۔ اسوقت بھی سادگی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ جب سرزمین انگلستان میں اسکے قدم رکھتے ہی گرجاؤں میں خوشی کے گھنٹے بجنے لگے اور سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ اور لوگوں نے تالیاں بجا کر اظہار مسرت کرنا شروع کیا ہی تو شاہزادی گھبرا کر ایسے کہنے لگی "آہاں یہ لوگ مجھ عاجز کیلئے کیوں اسقدر شور مچا رہے ہیں" کیا خبر تھی کہ اسی انکسار کے سبب رعایا اسکے واسطے جانیں لڑانے کو تیار ہوگی۔

(۱۳) شادی کے بعد قوم کی طرف سے عملی ثبوت قدردانی کا ملا۔ چالیس ہزار پونڈ سالانہ شاہزادہ کے لئے اور دس ہزار پونڈ سالانہ شاہزادی کے لئے خزانۂ ملکی سے وظیفہ قرار پایا۔

(۱۴) ۱۸۶۹ء میں مصر اور آئرلینڈ کی سیر ۱۸۷۰ء میں ٹیمز کے کنارہ کے پشتہ کا افتتاح۔ ۱۸۷۱ء میں باپ کے شروع کئے ہوئے کام کی تکمیل یعنی لنڈن کی بڑی نمائش بین الاقوام کا آغاز۔ ان سرگرمیوں میں شاہزادہ سرگرم و مصروف تھا کہ اچانک بیمار ہو گیا۔ اور بیماری بھی وہ شدید کہ سرسام کی نوبت آئی۔ تمام قوم بے تاب اور تمام رعایا دست بدعا تھی۔ فروری ۱۸۷۲ء کی ستائیسویں تاریخ غسل صحت کی خبر نے دلوں کے کنول کھلا دئے۔

(۱۵) سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۷۴ء میں دیکھا۔ اور واپسی پر ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کے اسفار کا رتبہ پایا۔ جس کے بعد کورٹ ۱۹۰۱ء تک شاہزادہ کے نام سے زینت رہی۔ اسکی ذمہ داری جب چھوڑی کہ تاج شاہی کی بڑی حوالی سر پر آ پڑی۔

(۱۶) [illegible] ۱۸۷۵ء میں جب کہ ملکہ نے اپنے پیارے فرزند سے رعایائے ہندوستان کو روشناس کرانے کے لئے سیر ہندوستان کے لئے بھیجا۔ شاہزادہ نے چند ماہ کے قلیل عرصہ میں ہمالیہ کے قریب سفر کیا اور ہندوستان کے سب ضروری حصے دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں اپنے اخلاق کی یاد چھوڑ کر واپس گیا۔

(۱۷) ۱۸۸۷ء میں شاہزادہ کی مسرت دیکھنے کے قابل تھی جب اپنی مادر مہربان کی سلطنت کی پہلی جوبلی (جشن پنجاہ سالہ) کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

(۱۸) ۱۸۹۲ء کا سال سوگواری کا تھا جب شاہزادہ کا بڑا بیٹا البرٹ وکٹر اپنے والدین اور اقربا کو داغ مفارقت دے گیا اور رعایائے ہند کے ساتھ خاندان شاہی کے غم میں شریک ہوئی۔

(۱۹) ۱۸۹۳ء کے سال اس سبق کے رنج و غم کی کچھ تلافی کی۔ خاندان شاہی کو شاہزادہ جارج (حال شہنشاہ جارج پنجم) کی شادی کی خوشی دکھائی۔

(۲۰) ۱۸۹۶ء میں ویلز میں نئی یونیورسٹی قائم ہوئی اور اس کے لئے شاہزادہ ویلز کا مناسب موزوں انتخاب عہدہ چانسلر ہوا۔

(۲۱) ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریا کا انتقال اور ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی کا اعلان۔ پھر شہنشاہ کا دفعۃً بیمار ہونا۔ تاج پوشی کا التوا۔ صحت یابی اور کچھ عرصہ کے بعد تاج پوشی کی دھوم دھام۔ سب تازہ واقعات ہیں۔

(۲۲) ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک کہنے کو مختصر سے نو سال تھے۔ مگر شاندار عظیم الشان واقعات و کارناموں سے پُر تھے۔ یورپ میں صلح و امن قائم رکھنے کے لئے ایڈورڈ ہفتم کی ذات ایک کفالت تھی۔ عام لوگوں نے "پیس میکر" یعنی صلح کرانے والا کا خطاب اسے دے رکھا تھا۔ فرانس اور انگلستان کی دیرینہ دشمنی کو مبدل بہ صلح کر دیا اسی کا کام تھا لیکن حیف بہت دیر ہم میں رہنے نہ پایا۔ ع رفتے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

عبدالقادر

تہذیب

تہذیب ایک وسیع المعنی لفظ ہے اور اس کو دنیا کے تمام حکمائے صنعت انسانی میں سے اعلیٰ اور اعظم جوہر مانا ہے۔ اسی سے تمام انسانی خوبیوں کو رونق پہنچتی ہے اسی پر حسنِ معاشرت آداب و اخلاقِ انسانی۔ وسائلِ خارجہ کی درستی اور انکے استحکام کا مدار ہے۔ لہٰذا ہم اس کی ذاتی اور اصلی خوبیاں بیان کرنے کی طرف اپنے خیالات کو رجوع کرتے ہیں۔

ہمارے بیان کی شرح نمبروار حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ تہذیب کے لغوی اور اصطلاحی معنے۔
۲۔ تہذیب طبعی فطری شے ہے یا کسبی۔
۳۔ تہذیب کی وسعت اور اس میں اصطلاحات۔
۴۔ تہذیب کے آثار اور کرشمے۔
۵۔ تہذیب سے کیا کام نکلتے ہیں؟
۶۔ تہذیب سے وسائلِ خارجہ کا تعلق۔
۷۔ تہذیب کے کام روئے مذہبِ اسلام کہاں تک موقر مانے گئے ہیں۔
۸۔ تہذیب فطری ہے تو علم کیوں نہیں۔ اور پھر اس میں اختلاف کی کیا وجہ ہے؟

(۱) تہذیب کے لغوی معنے آراستہ و پیراستہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں تہذیب اس مستحسن طریق عمل کو کہتے ہیں کہ جس سے کسی چیز یا امورِ اخلاقی کی وہ خوبی لئے ہوئے ذاتی اور اصلی حالت معلوم ہو جاوے کہ جو خدائے لم یزل کے منشاء ازلی کے موافق ہو اور وہ عام نگاہوں میں عزت و قدر

حاصل کرے۔

(۲)۔ تہذیب کا وجود ہماری روحیں ہمارے ساتھ لائی ہیں اور فطرت انسانی کے ساتھ جزو لاینفک کا حکم رکھتی ہے۔ پاؤں سے لیکر سر تک جسم ظاہر بنظر ڈالو۔ علی ہذا حواس باطنیہ و قوائے ذہنیہ کو دیکھو کہ اللہ جل شانہ نے کس حسن و آراستگی اور کن ترکیبوں اور اعلیٰ صنعتوں سے ہر ایک جز کو بنایا جس پر ابتدائے آفرینش سے آجتک کسی فلاسفر صناع نے حرف گیری نہیں کی اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔ انسانی ساخت ہی یہ بتلاتی ہے کہ انسان میں ہر چیز کی اصلی اور ذاتی خوبی محدود کئے کی قوت ودیعت رکھی گئی ہے انسان کو حسن و قبح نیک و بد کا ہرگز امتیاز نہ ہوتا اگر اس میں بطور خود مادۂ تہذیب کی آمیزش نہ ہوتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تہذیب ایک فطرتی مادہ ہے۔

(۳)، یہ معلوم کرنا کہ تہذیب کا مبلغ اور وضعاً و رواجاً اسکی انتہا کہاں تک ہے۔ ناممکن بات ہے۔ کیونکہ ہر ملک اور ہر قوم میں تہذیب کے مدارج اور اسکے اصول موضوعہ عموماً مختلف ہیں۔ اور کرۂ ارضی پر ایک ملک کی مسلمہ تہذیب پر دوسرے ملکوں میں اعتراض ہوئے۔ اور ایک قوم کی باقاعدہ وضعداری۔ روزمرہ کے برتاؤ۔ حسن قواعد و شہرت پر دوسری قوم نے حرف گیری کی۔ مثلاً عرب کا قدیم ستر پوشی تہ بند ہے اور یہی اس ملک میں تہذیب مانا گیا۔ مگر دوسرے ممالک میں یہ سمجھکر اعتراض ہوئے کہ تہ بند ستر پوشی کے لئے ناکافی ہے۔ علیٰ ہذا بلادِ یورپ میں پتلون کا رواج وہاں کی تہذیب میں داخل ہے۔ مگر دوسرے حصۂ ملک میں اسکو نامسنون لباس قرار دیا ہے۔ اسی طرح یورپین تہذیب میں ٹوپی اتار کر سلام کرنا۔ یا درباری مقامات میں ٹوپی اتار کر بیٹھنا۔ شامل ہے۔ غیر جگہ اس طریقہ کو ایک نامسنون اور گستاخانہ فعل قرار دیا ہے۔ ایسے ہی ہزاروں افعال ہیں

جو ہم ایک دوسرے ملک کی تہذیب اور وہاں کے آئین و آداب کے خلاف و متضاد ہیں۔ مگر نہایت صداقتاً جو قواعد تہذیب و تعلیم کے قرار پاچکے ہیں اور جنکو قومی سوسائٹی نے قابلِ عمل مان لیا ہی اُن کی پابندی کرنا انکے لئے ایک کامل اور سچی تہذیب ہی۔

اِس اختلافِ مدارج تہذیب کے ساتھ۔ پتہ لگتا ہی کہ ہر انسان میں تہذیب کی قوت ممیزہ موجود ہی گو طریقِ عمل جداگانہ ہیں مگر سب کا مرکز وہی ایک جادۂ تہذیب ہی (۳) حکیم ارسطو کا قول ہی کہ تہذیب انسان کے لئے خوبیوں کا حرا ہی اور وُہ آدمی کے لئے ایک پائدار ذمیت ہی۔ اِنسان اِس سے صلاحیت و نیکی سیکھتا ہی۔ وُہ سب خوبیوں کی سردار ہی۔ اگر انسان میں سب خوبیاں ہوں اور تہذیب نہ ہو تو وہ سب پھیکی ہیں (۱) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الشرف بالفضلِ والادب لا بالاصلِ والنسب (ترجمہ) شرافت اور بزرگی فضیلت اور آداب پر موقوف ہے۔ حسب و نسب پر نہیں ہی۔ ایک ایشیائی مشرقی شاعر اور حکیم کا قول ہی ؎

ادب تاجیست از لطفِ الٰہی بنہ بر سر برو ہر جا کہ خواہی

غرض دُنیا کے ہر طبقہ میں تہذیب کی عظمت اور شرافت مانی گئی ہی۔

قدرتی طور پر جو کام اپنے ذاتی اور اصلی خوبیوں کے ساتھ پورے کئے جاتے ہیں اور اُن سے ذاتِ اِنسان و معاداتِ انسان کو نقصان نہیں پہنچتا تو یہ اسی تہذیب کا کرشمہ ہی۔ ہم اپنے والدین اپنے اُستاد قومی لیڈروں کی انکے مراتب کے مطابق عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ تو یہ بھی خاصہ تہذیب ہی۔ ہم اپنے احباب اقربا۔ مصیبت زدہ لوگوں سے محبت اور ہمدردی رکھتے ہیں تو یہ بھی تہذیب ہی۔ ہم اپنے قوم و ملک کی خیرخواہی میں حصہ لیتے ہیں یا کسی سوسائٹی کے حقوق میں ناجائز مداخلت سے احتراز رکھتے ہیں تو یہ سب امور آثارِ تہذیب

مشغول ہیں۔ ایک حکیم سے کسی نے سوال کیا کہ ما التہذیب یعنی تہذیب کیا
چیز ہے۔ اُس نے ایک مختصر مگر معنی خیز فقرے میں جواب دیا کہ اِعداد الامرِ
بحیث یراہ الناس مستحسناً یعنی تہذیب یہ ہے کہ تم ایسا کام کرو جو آدمیوں
کی نگاہ میں مستحسن دکھائی دے۔ اسی طرح ہزاروں اخلاقی افعال ہیں کہ انسان
سے آداب و تہذیب کی روشنی لئے ہوئے صادر ہوتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں
کہ تہذیب وُہ خزانہ ہے کہ جس میں لاکھوں پُرآب جواہر مخفی ہیں۔ اگر انسان اُنکو
کام میں لائے اور اُنکی قدر کرے تو تمام دُنیا میں ممتاز اور برگزیدہ ہو سکتا
ہے اور اُس کی عظمت اور نیک شہرت عالمگیر اور دوامی ہو سکتی ہے اور مرنے
کے بعد بھی وُہ زندہ رہنے والوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شعر

دولت جاوید یافت ہر کہ نکو نام زیست   کز عقبش ذکر خیر زندہ کند نام را

(۵) تہذیب سے آدمی ہر دلعزیز ہو کر اپنے معاصرین میں عزت حاصل کرتا ہے۔
مصائب اور مہمات میں ثابت قدم رہتا ہے۔ تہذیب سے اِنسان منکسر المزاج
ہو کر متکبر لوگوں پر فتحیاب ہو جاتا ہے۔ وہ صرف دوستوں کے دل ہی میں جگہ نہیں
پاتا بلکہ مخالف کی آنکھوں میں بھی سرفرازی حاصل کرتا ہے۔ مفاسد و مکروہات
زمانہ سے صاف بچ جاتا ہے۔ تہذیب انسان کے وسائل حسن معاشرت میں
مدد دیتی ہے اور اسکو مکمل کرتی ہے۔ تہذیب سے انسان قوم کا ممتاز لیڈر کہلایا
جاتا ہے۔ اُس کے روزمرہ کی کارروائیوں، حسن سلوک سے آدمی نیکی کا نمونہ لیتے ہیں
وُہ شہرت و عزتِ دوام حاصل کرتا ہے وُہ اپنے ذاتی کاموں میں ہمیشہ کامیاب
رہتا ہے۔ تہذیب انسان کو متحمل اور مستقل مزاج بناتی ہے۔ حلم و حیا کے راستہ پر لاتی
ہے انسان کے اکثر عیبوں کو تہذیب چھپاتی ہے۔ تمام صفاتِ انسانی کو اُس کی
روشنی پہنچتی ہے۔ اِنصاف۔ صداقت۔ محبت میں زیادہ تر اسی تہذیب کا

شائبہ ہے۔ غرض کل اوصاف ذاتی وحدھی ایسی ایک چشمۂ شیریں کے محتاج ہیں اگر
چشمۂ تہذیب انکو سیراب نہ کرے تو انسان ایک سوکھے ہوئے درخت کے
مانند رہجاتا ہے۔ جو رنگ و گل اور ثمر سے بالکل آزاد ہے۔

(۶) تہذیب ذات ہی پر محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق ہماری ضرورتوں کے
اُن خارجیہ وسائل سے بھی ہے جو ملکی سیاسی حُسن معاشرت کے آلات و
اسباب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دیکھو دُنیا کے بعض بر اعظموں میں جو آجکل
حیرت انگیز ترقیاں ہو رہی ہیں۔ اور جگہ جگہ صنعتی اشیاء کی جو نمائشیں ہو رہی
ہیں یہ سب تہذیب کے کرشمے ہیں۔ مثلاً تار کا بنانا۔ ریل کا چلانا۔ غباروں کے
ذریعہ سے ایک ملک کے دُوسرے ملک میں پہنچ جانا۔ جہازوں کا پانی کے
سطح پر اور پانی کے اندر چلانا۔ تارپیڈوں کے ذریعہ سے جہازوں کا غرق کرنا
ڈائنامیٹ کی ایجاد۔ نقاشی کے فن کو درجۂ کمال پر پہنچانا۔ مختلف کاموں کے
لئے مختلف اور کارآمد مشین بنانا۔ پوشاک میں اعلیٰ نمونوں کی قطع و برید اسباب
معاشرت اور تفریح طبع کے لئے نئی نئی ایجادیں۔ غرض ایسے ہزاروں اختراعات
لاکھوں ایجادیں جو کسی زمانہ میں معجزہ خیال کی جاتی تھیں۔ تہذیب کی زبردست
قوت سے آج دُنیا میں پیدا ہیں۔ انہیں وسائل کے سبب سے امریکہ و یورپ نے مہذب
ملک و مہذب قوم کے اعلیٰ خطابات حاصل کئے ہیں اور انکا یہ اظہار مہذب
کے اعلیٰ نمونوں کے ساتھ قابل اعتراض بھی نہیں۔

(۷) اسلام نے تہذیب کی بہت تعریف کی ہے۔ اور تمام شعار اسلامی اصول
تہذیب سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ کتاب مقدس میں ایک جگہ ارشاد ہے اُدْعُ اِلٰی
سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ گو لفظ تہذیب کا نہیں فرمایا مگر الفاظ
مرادف فرما کر تہذیب کی علامات بتلائی ہیں جس سے پایا جاتا ہے کہ ادب حکمت اور

ملائمت سے جو کام کیا جائے وہ تہذیب کی اصلی خوبی لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اور ایسے نصائح کا اثر بھی جلد ہوتا ہے دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ اگر تم کو کوئی تحفہ دے تم اس سے بڑھکر اسے تحفہ دو۔ تہذیب کی کتنی عمدہ تعلیم ہے اور ارشاد ہے کہ تم اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو اور انصاف کے ساتھ یکساں برتاؤ کرو۔ عدل کرو خدا کو بھی عدل پسند ہے۔ کیسی بیش بہا اور قیمتی نصیحتیں تہذیب کے متعلق فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ سائل کو مت دھمکاؤ۔ دوسرے یتیموں پر مت غصہ کرو۔ تیسرے یہ کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا بیان کرو۔ احادیث میں بھی ہم کو ایسے احکام بہت سے ملتے ہیں۔ اور خود آنحضرت مجسمہ تہذیب اخلاق تھے اور آپکی تہذیب سے اُس زمانہ کے نصاریٰ و یہود بھی سبق لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قوم یہود کے ایک سردار نے اپنی قوم کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے زور کے ساتھ بیان کیا۔ تہذیبہ احسن من دعوت موتہ یعنی اے قوم یہود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تہذیب اُنکے نبوت کے دعویٰ سے اچھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انزلوا النّاس علی قدر منازلھم یعنی جس مرتبہ اور عزت کا آدمی ہو اُسی مدارج پر اُسکو جگہ دو ایک اور حدیث ہے اکرموا عزیز قوم ذل (ترجمہ) تمہاری قوم سے اگر کوئی شخص ذلیل ہو گیا ہو تو اس کی عزت و تعظیم کرو۔ تیسری حدیث ہے۔ کوئی شخص کسی کو اپنی جگہ سے ناگوار الفاظ میں نہ اُٹھاوے بلکہ ضرورت کے موقعہ پر یہ کہدے کہ بھائی جگہ کشادہ کرو۔ چوتھی حدیث میں ہے کہ تم خیرات کرو۔ سائلوں کو دھمکاؤ مت۔ اگر تمہارے پاس نہیں ہے تو کہدو کہ بابا معاف کرو۔ یہ سب احکام کلام الٰہی اور احادیث نبوی اس بات پر دال ہیں کہ جو کام کرو تہذیب کے ساتھ تاکہ انسان کو صدمہ نہ پہنچے اور اُنکی نگاہوں میں تمہاری عزت ہو۔ ان مختصر احکام کے دیکھنے اور پڑھنے سے

تہذیب کے وقار اور عظمت کا پورا اندازہ ہوتا ہی۔ اور فی نفسہ تہذیب وہ علم مقبول صفت ہی کہ میرے خیال میں کسی مذہب کو اس کے کارآمد ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔

(۸) تہذیب بیشک فطری جوہر ہے اور کم و بیش ہر انسان کو اس سے حصہ ملا ہی۔ کسی نے علم و صحبت کے اثر سے اُسے صیقل کیا اور عام شہرت و عزت حاصل کی۔ اور کسی نے جہل کی تاریکی میں اس کو بدستور بیکار اور زنگ آلود رکھا۔ بہت سی ایسی مخلوق ہی کہ جس نے تہذیب کا نام تک بھی نہیں سُنا اور کسی مہذب جماعت کا اُس پر رنگ نہ ہوا مگر مادہ فطری تہذیب کا اُن میں ضرور موجود ہی۔ مثلاً ہم ایک حکایت خلیفہ ہارون الرشید کی یہاں نقل کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ انکو جنگل میں جانے کا اتفاق ہوا اور دیکھا کہ ایک گڈریا ہے۔ پوچھا کتنے برس کی عمر سے بکریاں چراتے ہو۔ کہا آٹھ برس کی عمر سے۔ پھر پوچھا تم مجھے جانتے ہو؟ کہا نہیں۔ خلیفہ نے کہا کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔ گڈریے نے جھک کر دو سلام کئے حالانکہ اس نے اس سے پہلے نہ تو کبھی کسی بادشاہ کو دیکھا۔ کسی کو سلام کرتے ہوئے دیکھا ادائے سلام کا جو فعل تھا اس سے صادر ہوا۔ یہ محض فطری تہذیب کا خاصہ تھا تفرقہ تہذیب جو انسان میں دیکھا جاتا ہی۔ وہ بلحاظ اختلاف آب ہوا۔ تجربہ علم صحبت کے ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلم ہے کہ آب و ہوا۔ علم۔ تجربہ سے دماغ میں اثر پہنچتا ہے۔ اور دماغ کی تازگی سے خیالات پر اثر پڑتا ہے۔ جب خیالات انسانی میں اثرات نے جگہ پائی تو لازمی بات ہے کہ تہذیب میں بھی احساس پیدا ہوگا۔ ذات انسان میں سب قسم کے مواد موجود ہیں۔ مگر وہ مردہ ہیں مثل ان مچھلیوں۔ مینڈکوں کے جو مٹی کے اندر رہتے ہیں یا مثل اُن ہزارہا تخموں کے جو سنگلاخ

زمین میں پائے جاتے ہیں۔ اور پانی پڑنے سے زندہ اور روشن ہو جاتے ہیں۔ غرض جو قابلیت اللہ تعالیٰ نے انسان کے امزجہ میں ودیعت رکھی ہو وُہ اسی وقت ظہور میں آتی ہے۔ جب اُنکو اُن کی غذا پہنچتی ہو ہر انسان کی تہذیب اور ہر قوم کی شائستگی میں جو مابہ الامتیاز تفرقہ پایا جاتا ہے اس کے بھی اسباب ہیں جن کا مذکرہ اوپر کیا گیا ہو۔ اِس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ علم و صحبت سے اپنی تہذیب کو زندہ کرے۔ اور اس کو اس کام میں لائے جس کے لئے خدا نے اس کی طبیعت میں امانت رکھا ہے +

سید احمد مرتضیٰ نظر

جُدائی

ہم اپنے دوستوں سے جُدائی کا تحمل نہیں رکھتے اگر وُہ چلے جائیں تو ہم پریشان ہوتے ہیں اور یہ نہیں دیکھ سکتے کہ اُن سے بھی بہتر دوست میسر آنے ممکن ہیں۔ ہم ماضی کے پرستار ہیں۔ ایک پُرانے چشمے میں جہاں نہیں ایک وقت کھار اور سیاہ ملی تھی پڑے رہتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اگر رُوح میں قوت ہو تو وہ پھر خوراک اور طاقت ہمارے لئے پیدا کر سکتی ہو۔ خدا کی آواز نہیں کہہ رہی ہو کہ "ہاں بڑھے چلو" اور ہم ہیں کہ حال و استقبال دونوں کو چھوڑ کر صرف ماضی پر انحصار رکھتے ہیں اور اُن عجیب الخلقت مخلوقوں کی طرح پیچھے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جن کی آنکھیں کیسا جاتا ہو کہ پس پشت ہوتی ہیں + (ترجمہ)

فریبِ قدرت

بہت کم لوگوں کو اس بات پر غور کرنے کا موقعہ ملا ہوگا کہ جو چیزیں بظاہر نظر آتی ہیں اُن میں اکثر کا وجود نہیں ہوتا برخلاف اس کے بعض چیزیں آنکھوں کے سامنے تو موجود ہوتی ہیں مگر دکھائی نہیں دیتیں۔

غور کرنے والوں کے لئے یہ ایک ایسا دلچسپ اور قوتِ متخیلہ کو ترقی دینے والا مشغلہ ہے جو اُنہیں سائنس کے پرستان کی ایک عجیب سرزمین میں پہنچا سکتا ہے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کرشمہ قدرت بھی دھوکے سے خالی نہیں؟ بیشک بعض اوقات یہ ایک طرح نہیں بلکہ ہزار طرح سے ہمیں اپنے گونا گون کرشموں کی بھول بھلیوں میں پھنسا دیا کرتی ہے اور پھر کے اریگروں میں سے کوئی۔ کوئی اس تماشاگاہ عالم پر بیٹھا ہوا خلق کو مغالطے دیتا رہتا ہے اور اُس کے دام فریب میں نہ صرف انسان بلکہ حیوان بھی بڑے ہوں یا چھوٹے۔ غبی ہوں یا ذکی آجاتے ہیں۔ مگر خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ اِس لئے یہ بظاہر ایک فعل بھی انسان اور حیوان دونوں ہی کے فائدے کی غرض سے ہوگا۔ یہ فائدے خواہ شخصی ہوں یا قومی اچھا پھر وہ فریب کیا ہے جنہیں مصلحتِ الٰہی میں دخل ہے؟

اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اوّل یہ جاننا ضروری ہے کہ نیچر کا نقال بھی عجیب چیز ہے۔ بہت سی عجیب چیزوں کو ہم جس کو دکھاتا ہے آپنے لکڑی نما یا پتہ نما کیڑے دیکھے ہونگے۔ یا شاید ان کی تصویریں نظر سے گذری ہونگی۔ یہ کیڑے چل سکتے ہیں اُڑ سکتے ہیں مگر جب جس و حرکت

بیٹھے ہوں تو ہو بہو لکڑی او رپتے معلوم ہوتے ہیں۔ اور یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی کہ یہ دراصل جاندار کیڑے ہیں۔ تا وقتیکہ بے خبری میں اُن پر ہاتھ نہ رکھ دیں اور نرکے انگلیوں کے نیچے کلبلانے سے ایک ناگوار سی کیفیت نہ محسوس ہو۔ مگر اس دھوکے کی وجہ کیا؟ یہی کہ اُن کے بازو اور پشت کی ساخت میں خشک سے کے ٹوٹے ہوئے کناروں اور داغدار مرجھائی ہوئی سطح کی ایسی ہو بہو نقل ہوتی ہے کہ جب تک کیڑا چلنے نہ لگے نہیں معلوم ہوسکتا کہ وہ کیڑا ہے یا کیا۔

بعض کیڑے چمکدار اور خوشنما پھولوں سے مشابہت رکھتے ہیں اور جب کلیوں یا پھولوں کے گچھوں پر بیٹھے ہوں۔ یا پھولوں کا رس چوس رہے ہوں تو اُن میں اور پھولوں میں تمیز نہیں کیجا سکتی اور جس طرح انسان کی آنکھ دھوکہ کھا سکتی ہے اسی طرح حیوانوں کو بھی مغالطہ ہوسکتا ہے اور دراصل نقاشِ قدرت کا اس قسم کی نقاشی سے یہی منشا ہوتا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے چمکدار عجیب الخلقت جانور پھولوں کے دھوکے میں اپنے دشمنوں کی چونچ اور رخساردار پنجوں کے گزند سے محفوظ رہیں۔ برخلاف اس کے بعض پھولوں کی صورت کیڑوں سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اور اصلی کیڑے انہیں اپنا ہم جنس سمجھ کر اُن سے ملنے آتے ہیں۔ اور آخرکار انہیں نوچ کھسوٹ کر اور اُنکے بیج پھیلا کر چلے جاتے ہیں اور اس طرح اُن پھولوں کی بقائے نسل کا باعث ہوتے ہیں۔ مگر یہ نقل مطابقِ اصل کیسی ہی عجیب کیوں نہ ہو اس وقت ہمارا منشا ناظرین کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ ہم انہیں ایک اس سے بھی زیادہ عجیب فریب ہی کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جسے اہل سائنس نے حال ہی میں دریافت کیا ہے۔

آپ کبھی جنگل میں چلتے پھرتے اس دُرّاج کے پاس سے گذرے ہیں جو
زمین پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ اور قریب پہنچنے سے اس طرح پھڑپھڑا کر اُڑتا
ہے جیسے کوئی چیز آپ کے قدموں کے نیچے سے پیدا ہو کر آناً فاناً نظر سے
غائب ہو گئی۔ ممکن ہے کہ اس کے ہلنے جُلنے سے پیشتر آپ اُس کی طرف
دیکھتے رہے ہوں مگر اس کا وجود نظر نہ آیا ہو کیونکہ اس کے پروں کا رنگ
زمین اور اُن خشک پتّوں اور صحرائی روئیدگیوں کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا
ہے جو جنگل میں ہر جگہ بکثرت موجود ہوتی ہیں۔

اسی طرح بعض اور جانوروں میں بھی جو عادتاً زمین یا کسی گرے ہوئے
درخت کے تنے پر بیٹھے رہتے ہیں یہ نہ دکھائی دینے والا مادہ ایسے
سادے اصول کے موجب موجود ہوتا ہے جس کی نسبت یہ یقین ہی نہیں
آسکتا کہ وہ ایسا موثر ہو سکتا ہے۔ مگر دراصل وہ ایسا ہی موثر ہوتا ہے۔ بھلا پھر وہ
اصول کیا ہے؟ "وہی دھوپ اور سایہ یا چاندنی اور پرچھائیں"۔

اگر کوئی یکساں رنگی ہوئی چیز زمین پر رکھی جائے تو اسکا کم و بیش سایہ
ضرور پڑیگا۔ اور اس چیز کا زیرین حصہ بہ نسبت اُوپر کے حصہ کے زیادہ تاریک
یا گہرا نظر آئے گا۔ اور جس طرح سایہ کا یہ اصول قدرتی اور ازلی ہے۔ اسی طرح
آنکھ بھی اس نظارہ کی ہمیشہ سے عادی ہے۔ اور ہر چیز کو خواہ وہ قریب ہو یا
کسی قدر فاصلے پر دیکھ کر فوراً پہچان لیتی ہے لیکن اگر اسی چیز کو خواہ وہ کچھ
ہی کیوں نہ ہو زمین پر سے اُٹھا کر اُسکے اوپر کے حصہ کو گہرا رنگ دیں اور
حصہ زیرین کو بہ نسبت اوپر کے حصہ کے زیادہ ہلکا رہنے دیں اور پھر اُسی طرح
اُسے زمین پر رکھ دیں تو پھر وہ چیز ایسی نمایاں نہ معلوم ہوگی جیسی پہلے معلوم
ہوتی تھی۔ خصوصاً جبکہ اُسکے اوپر کے حصہ کا رنگ زمین کے معمولی رنگ سے

بیٹھا ہو۔ مگر کیوں؟ اِس لیئے کہ حصّہ زیرین کا رنگ اوپر کے حصّے کے رنگ
سے ہلکا کر دینے کے باعث روشنی میں سایہ پڑنے کے اصُول کا ردِ عمل
ہو جائے گا۔ اور آنکھ اِس قدر دھوکہ کھانے لگے گی کہ تاوقتیکہ اس
چیز کو بڑے غور کے ساتھ نہ دیکھا جائے وُہ نظر نہ آسکے گی۔

اِسی اصُول کے مطابق نیچر بہت سے جانوروں کے سینے اور نیچے
حصّہ کا رنگ بہ نسبت اُن کی پُشت کے رنگ کے چند درجہ ہلکا رکھتی ہو اور
نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ جب وُہ جانور بے حس و حرکت زمین پر بیٹھے ہوں تو باوجود
ٹھیک اُنکی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بھی ممکن ہو کہ وُہ نظر نہ آئیں۔ اور
عموماً نہیں نظر آتے۔ ممالک منطقہ حارہ کے جنگلوں میں اس اصول کے سبب
بعض جانور خطرات سے اس قدر محفوظ رہتے ہیں کہ اور کسی طرح ایسے محفوظ
نہیں رہ سکتے۔ برخلاف اس کے بعض درندے جانوروں کا شکار اسی
اصُول کے مطابق خود بخود اُن کے پاس جا پہنچتا ہو اور پھر ناچار اور تن
بہ تقدیر ہو کر نہنگِ اجل کا لقمہ بنتا ہے۔

افریقہ کے اُس ملک جنگلوں میں دن کے وقت جب دھوپ کھلی ہوتی
ہو تو زمین کا رنگ گندمی یا ہلکا زردی مائل معلوم ہوتا ہو۔ جس پر اونچے اونچے
درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں کے سایہ کے سیاہ دھبّے اور سیاہ دھاریاں
پڑی ہوتی ہیں۔ اور شیر کی زرد کھال پر بھی اسی طرح سیاہ لکیریں ہوتی ہیں پس
جب دوپہر کے وقت شیر کسی ایسے جنگل کی روئیدگی میں خاموش بیٹھا ہو
اور اوپر سے دھوپ پڑ رہی ہو تو اس کا سیاہ دھاریوں دار زرد رنگ جسم
زمین کے سیاہ دھاریوں دار زرد رنگ میں مل کر نظر آنا دشوار ہو جاتا ہو اور بھولے
بھالے غزالوں کی نظر ہر ہر قدم پر دھوکہ کھاتی ہو۔ اور وُہ نہایت معصومیت

کمسلسلہ سنبھلتے ہوئے ایسے دشمن کے قریب جا پہنچتے ہیں جو اُن کا خیر مقدم
کرنے کے لئے پہلے سے مُنہ پھیلائے اور نیچے جھاڑ سے بیٹھا ہوتا ہے۔
جس طرح شیر نظر سے غائب رہتا ہے اُسی طرح گورخر بھی جنگلوں میں چھپا
رہتا ہے۔ کیونکہ اُس کی پشت اور پہلوؤں پر بھی قدرت نے سیاہ دھاریاں
بنادی ہیں اور اُسکا رنگ بھی اُن جنگلوں کی زمین کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا
ہے جن میں وُہ رہا کرتا ہے۔ مگر اُسکے نظر نہ آنے سے ایسے غمناک نتائج
نہیں پیدا ہوتے۔ جیسے شیر کے نظر نہ آنے سے پیدا ہُوا کرتے ہیں۔
برخلاف اسکے جب وُہ دھوپ میں کھُلے میدان میں کھڑا ہوتا ہے تو اپنے
رنگ اور دھاریوں کی خصوصیات کے باعث شکاریوں کی نظر سے پوشیدہ
رہتا ہے۔ اسی طرح چیتے کا داغدار جسم اس کے نظر نہ آنے کا باعث ہوجاتا ہے۔
اصل یہ ہے کہ گرم ممالک کے بہت سے جانور جو گندمی رنگ کے ہوتے
ہیں اور جنکے جسم سفید سیاہ داغوں اور دھاریوں سے آراستہ ہوتے
ہیں۔ اُن سب کو یہ خصوصیت حاصل ہوتی ہے کہ جب وُہ جنگل میں دھوپ
میں کھڑے ہوں تو بڑی مشکل سے نظر آتے ہیں بلکہ نظر نہیں آتے۔ کیونکہ
دھوپ کی چندھیا دینے والی تیزی اور اس نواح کی تمام چیزوں کے سایہ
کی سیاہی اور نکلا پن مل جل کر آنکھوں کی قوتِ فیصلہ کو اس قدر دھوکے
میں ڈالدیتے ہیں کہ انہیں صورتیں برابر نظر نہیں آتیں۔
یہ خصوصیت بھی گرم ہی ممالک کو حاصل ہے کہ وہاں خاص خاص صورتوں اور رنگوں
کے ایسے ہو بہو مگر خیالی خاکے نظر آتے ہیں کہ عقل انسانی دیکھتے حیرت میں پڑی
غوطے کھایا کرتی ہے اور اس خدائی نقاشی کو دیکھ کر انسان یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ
ہو بہو یہ نظر فریب کرشمے اسی غرض کیلئے ہیں جس غرض کے لئے انسان طرح طرح

مُغل

ہندوستان کچھ اوپر آٹھ سو برس تک مُسلمانوں کے زیر فرمان رہا۔ ۱۵۲۶ء
سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں نے جس نمونہ پر یہاں پر حکومت کی ہے اُسکی تقلید کرنا
اس ترقی کے زمانہ میں بھی مہذب گورنمنٹس اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ اُنکے شان و
شوکت کی داستانیں ابتک زبانوں پر جاری ہیں اور مُلک کے ہر گوشہ میں اُس
عہد کی زندہ یادگاریں زبانِ حال سے اپنے بانیوں کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ اُنکے
نام سے ہندوستان کی تاریخ کے صفحات کی زینت ہے۔ اُنکی اولوالعزمی۔ فیاضی
رعایا پروری علوم و فنون کی قدردانی دادرسی مذہبی رواداری۔ تدبر اور انصاف
رسانی نے بجائے خود ہر ایک کو آسمان شہرت کا آفتاب بنا دیا تھا۔ اکبر کی مُدبّری
شاہجہاں کی عدل گستری اور اورنگ زیب کی خدا پرستی نے اس خاندان کے
نام کو اور چار چاند لگا دیئے تھے۔ چنگیز خانی اور تیموری خون فارس اور ہندوستان
کی آب و ہوا کی تاثیر سے اگرچہ رقیق ہو چلا تھا تاہم میدان کارزار میں اُن کا ہر فرد
اب بھی مستقل مزاجی اور شجاعت کا پتلا تھا۔ اُنکے علمی کارنامے دیکھکر انصافاً
کہنا پڑتا ہے کہ یہ سلاطین سیف و قلم دونوں کے مالک تھے۔ اُنکے اصول سیاست
اور طرزِ حکومت نے زمانہ بھر میں اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اُنکے عہدِ حکومت میں
ہندوستان کے تمدن اور یہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت کی کایا
پلٹ گئی تھی۔ ابوریحان بیرونی نے کتاب الہند میں اور سلطنتِ مُغلیہ کے بانی
شہنشاہ بابر نے خود اپنی سرگذشت میں ہندوستان کے تمدنی حالت کیطرف
اشارہ کیا ہے اسکو پڑھو اور پرانے سلاطین کے کارناموں۔ ایجادات و اختراعات

پر نظر تعمق ڈالو تو ہندوستان کا باوا آدم ہی نرالا نظر آئیگا۔ اگرچہ ہندوستان
کا بچہ بچہ بابر۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان اور اورنگزیب کے نام سے
واقف ہے لیکن ایسے بہتیرے نکلینگے جو ان نیک نفس۔ خدا پرست۔ صلح
کل۔ عدل گستر۔ رعایا پرور اور راسخ الاعتقاد مسلمان مغل بادشاہوں کے
نا تربیت یافتہ۔ سفاک وحشی اور دشمن اسلام اسلاف کے حالات سے
واقف نہ ہونگے جن کی خونریزی اور مظالم کی داستانوں سے صفحات
تاریخ سیاہ ہو رہے ہیں۔ کامل ابن اثیر نے جہاں ممالک اسلامیہ پر ان مغلوں
کے حملوں کا حال لکھا ہے وہاں لکھا ہے کہ میں نے کئی برس تک اس حادثہ عظیم
اور اسکے ذکر کو ناگوار سمجھ کر اسکے بیان سے پرہیز کیا ہے میں ایسی حالت
میں ایک قدم آگے بڑھاتا تھا اور ایک پیچھے ہٹاتا تھا کیونکہ ایسا کون شخص
ہوگا جو اسلام کی اور مسلمانوں کی موت کی خبر لکھے اور اسکو ایسے حادثہ کا بیان
کرنا آسان ہو۔ کاش میری ماں مجھکو نہ جنتی اور میں اس سے پہلے ہی مر جاتا
اور دنیا مجھکو بھول جاتی۔ الفنسٹن صاحب اپنی مشہور تاریخ ہندوستان میں ایک جگہ
چنگیز خاں کے حملہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں وہ ایسا قوی ہو گیا تھا کہ اس
نے تاتاریوں کے تینوں گروہوں کو۔ اور ایسے لوگوں کو ان گروہوں کے
اضافہ سے بڑھا کر بہت بڑی فوج اکٹھی کی اور یک لخت اہل اسلام کی
سلطنتوں پر ایک ایسی فوج لیکر ٹوٹ پڑا کہ اس سے زیادہ نہ پہلے جمع ہوئی
تھی اور نہ آجتک جمع ہوئی۔ حملوں کی نوبت ایک آفت ناگہانی تھی جو طوفان
کے طور پر نازل ہوئی۔ کیونکہ وہ لوگ کسی دین و مذہب کے پابند نہ تھے کہ اسکی
اشاعت و ترقی میں سعی و کوشش کرتے اور نہ کوئی فن و ہنر رکھتے تھے کہ اسکی
ترقی چاہتے تمام مقصود ان کا یہ تھا کہ آدمی قتل کئے جاویں اور ملک بے چراغ

بڑا ہے چنانچہ ملک کی تباہی کے سوا کوئی داستان اُنکی فتوحات کا زرّیں خاتمہ حقیقت تاریخ الاسلام میں کوئی واقعہ ایسی سفاکی اور غارتگری کا نظر نہ آئیگا جسکا مقابلہ اُن مغلوں کے مظالم سے کیا جائے۔ ایک واقعہ نگار لکھتا ہے کہ جس طرح بلندی سے پہاڑ گرتا ہے اس طرح چنگیز خاں کے وحشی لشکر اُن اسلامی ملکوں پر اُن ٹوٹے جو علم و شائستگی کا مرکز تھے اور جب یہ لشکر کسی ملک کو برباد کرکے رخصت ہوتے تو شاہوں کے قصر و ایوان اور عالیشان شہروں کی جگہ جو خوشنما باغات اور لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں گھرے تھے مٹی اور پتھر کے تودے نظر آتے چنانچہ شہر ہرات چنگیز خاں کے زمانے میں بہت آباد شہر تھا جس کے مضافات کی آبادی شامل کرکے کئی لاکھ کی مردم شماری تھی سنہ ۱۲۲۲ء کے محاصرۂ اوّل کے بعد باشندوں کی جان بخشی کی گئی۔ دوسری مرتبہ سات مہینے تک محاصرہ قائم رہا اور ہرات پر قبضہ کر لیا گیا۔ ایک ہفتہ کامل ہرات میں لُوٹ مار اور قتلِ عام جاری رہا۔ دس لاکھ سے زاید مخلوق خدا کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اصل تعداد جو کچھ بھی ہو جب تک مُغلوں کی فوج نے یقین نہیں کر لیا کہ اب ایک متنفس بھی زندہ باقی نہیں ہے۔ خونریزی بند نہیں کی اُنکے چلے جانے کے بعد تیس ہزار کے قریب بد نصیب باشندے اس تباہ حال موقع پر آئے تھوڑی ہی دیر کے بعد دو ہزار مغلوں کا ایک دستۂ فوج واپس آیا اور ان کو بھی تہ تیغ کر گیا اور سوا سولہ معصت زدہ آدمیوں کے جنہوں نے نالیوں۔ نہروں اور گنبدوں میں چھپ کر پناہ لی تھی ایک متنفس بھی باقی نہ رہا یہی لوگ بالآخر خوف اور دہشت کی حالت میں اُس اُجڑے دیار میں جو پہلے بہت بڑا اور خوبصورت شہر تھا آباد ہوئے۔ ان میں چوبیس آدمی قرب و جوار سے آکر اور شامل ہو گئے اور پندرہ برس تک صرف یہی چالیس آدمی اسکے باشندے رہے

سکے اس بہترین شہر میں آباد ہے جس کی مردم شماری ایک زمانہ میں لاکھوں تک
پہنچی تھی۔ یہی بیت تعداد ویران ہوئی جو صدہا برس تک دولتِ عباسیہ کا
پایہ تخت تھا اور علماء اسلام کے بدولت دنیا میں مشہور تھا۔ ان مغلوں نے
مسجدوں کے صحن میں اپنے گھوڑے باندھے اور قرآن پھاڑ پھاڑ کر ان کی
بے ادبی کی — مسلمانوں کو ان ظالموں نے قصائی بنکر ذبح نہیں کیا انکو
غلام بنا کر لیگئے اور شہروں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ چنگیز خاں کا وہ خط قابل دیکھنے
کے ہے جو اس نے باشندگانِ بخارا کو لکھا تھا۔ یہاں پر اسکے چند فقرے درج کئے
جاتے ہیں۔ ”اے قوم ارشما گناہان بزرگ صادر شدہ۔ خشمِ خداوند تعالیٰ
مرا از بلا ماسے درگاہ آنحضرت بسوئے شما فرستادہ ہرچہ در شہر بجز ظاہر
موجود است احتیاج تقریر نیست از آنچہ مخفی نمودہ اید تسلیم باید نمود“۔ بہت دو
سواروں نے پوشیدہ خزانوں کا پتہ بتا دیا۔ سپاہیوں نے لوٹ کھسوٹ
مچادی۔ شہر کے بدنصیب باشندے میدانوں میں جمع کئے گئے۔ چند دنوں میں
قیدیوں کی تعداد تکلیف دہ ہو گئی۔ صناع اور ذی علم اصحاب علٰحدہ کر لئے گئے
اور تیس ہزار سمرقند بھیجدیئے گئے باقیماندہ قیدیوں کو دس دس بیس بیس کر کے الگ
کر دیا گیا اور ایک مغل سپاہی کو ان کے قتل کا حکم دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ شام کو
دس بیس اس مکروہ خونریزی کے یادگار میں عمارت میں چنوا دئے جائیں۔ فتح بلخ
کے بعد مقتولین کے سروں کے ۱۲۰ مینار چنے گئے تھے۔ صاحب روضۃ الصفا
لکھتے ہیں۔ ”یکے از بخارائیاں بعد از واقعہ بخراسان آمد از وے
پرسیدند کہ حالِ شہر شما بکجا رسید۔ گفت آمدند و کندند و سوختند و کشتند و
بردند“۔ یہی حال سمرقند، بلخ اور وسط ایشیا کے اور شہروں کا ہوا جن سے اسلامی
تہذیب اور تمدن کی شان تھی اور جو عالموں کا مسکن اور علم کا مخزن تھے۔

مغلوں کی نسبت کہتے ہیں کہ روضۃ الکبریٰ کے سال ہجری سے صدیوں بعد مشرق کے انتہائی حصہ میں تاتاریوں اور مغولیوں کے فرقوں نے زبردست سپہ سالاروں کی ماتحتی میں بڑی قوت جمع کر لی تھی اور پولینڈ سے لیکر خلیج فارس اور ہندوستان تک قسطنطنیہ سے بحیرۂ چین تک۔ گویا سے دریا سے گنگ تک تسخیر کر لیا تھا۔

پندرھویں صدی کے اخیر میں مغل اور چغتائی فرمانرواؤں کے خاندان والے ادھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے اور یگانہ لوگوں کے ساتھ اختلاط و ازدواج سے ان کا خون گھل مل گیا تھا اُن میں بہت سے لوگ کئی نسلوں تک ترکی ممالک میں مقیم رہے اُنکی زبان ترکی ہو گئی اور طرزِ معاشرت بھی انہیں جیسا ہو گیا۔

ولیم ڈی روبروکس ایک عیسائی راہب جو سنہ ۱۲۵۳ء میں بطور ایلچی کے تاتار گیا تھا وہاں کے باشندوں کے متعلق لکھتا ہے "اُن کا کوئی مستقل مکن نہیں ہے اُنکے مکانات نمدہ اور کھپاچوں کے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ چراگاہوں میں اپنی زندگی بسر کرتے اور مکانات بڑے بڑے چھکڑوں پر لئے پھرا کرتے ہیں۔ اپنے ہمراہ ایک چھوٹا سا ٹٹ بھی رکھتے ہیں جو کل مکان کا محافظ خیال کیا جاتا ہے۔ جو جانور ضعف یا بیماری سے مر جاتے ہیں۔ اُن کا گوشت بلا تکلف و بلا امتیاز کھا جاتے ہیں۔ بحرِ تاندیانہ اور صورت خاص سرا میں ہیں۔

صاحب روضۃ الصفا لکھتے ہیں "منازلِ مغول در طرفِ مشرق است ملک البلاد مغول از جہت ہشت ہر راہ طرف شرقی و بید پایشان منتہی میشود و سرحد چغتائی و جنوبی ولایت متصل بر بین العوزبست و شمالی بحدود قرقز و سنگانی اتصال دارد و چون بسبب اکثر قوتِ آنجماعت گوشت شکار بود و لباس ایشان از پوستِ سباع و بہائم" مورخین سلاطینِ مغلیہ کا سلسلۂ نسب یوں لکھتے ہیں۔

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بن نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ بن ظہیر الدین محمد بابر

بادشاہ بن عمر شیخ میرزا بن سلطان ابوسعید میرزا بن سلطان محمد میرزا بن میران شاہ
بن صاحبقران قطب الدنیا والدین امیر تیمور گورگان بن امیر طراغائی بن امیر برکل بن ایلنگر
بہادر بن انجل نویان بن سوغوچین بن ایردمچی برلاس بن قاچولی بہادر بن تومنہ خان
بن بایسنقر خان بن قایدو خان بن دوتومین خان بن بوقا قاآن بن بودنچر قاآن بن
النقوا ایست جو جبینہ بہادر بن یلدوز بن منگلی خواجہ بن تیمور تاش و ہو از نسل قیان بن
ایل خان بن تنگز خان بن منگلی خان بن یلدوز خان بن آئی خان بن کُر خان
بن اغوز خان بن قرا خان بن مغل خان بن النجہ خان بن کیوک خان بن دیب
یاقوی بن النجہ خان بن ترک بن یافث بن نوح علیہ السلام۔

تیمور کا پردادا چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی کا سپہ سالار و وزیر اعظم تھا۔ النقوا جو چنگیز خان اور تیمور دونوں کی مورث اعلیٰ تھی۔ اُسکا خارق عادت طور پر حاملہ ہونا تیمور کے دربار کا ایک مذہبی عقیدہ تھا۔ دُنیا کے بہت سے عجیب واقعات روایت کے سلسلہ میں منسلک ہو کر تاریخی اجزا بن گئے ہیں۔ زمانہ حال کے مورخین جو فلسفانہ نقطۂ خیال سے دقیقہ سنجی کرتے ہیں اس قسم کی روایتوں کو یا تو نظر انداز کر جاتے ہیں یا سرے سے مزخرفات سمجھ کر انکا ابطال کر بیٹھے ہیں۔ مگر بعض مواقع پر واقعہ نگاری کا فرض ادا کرنا بھی پڑتا ہے۔ النقوا کا حاملہ ہونا بھی اسی قسم کی ایک روایت ہے جسکو قریب قریب ہر مورخ نے بڑے وثوق سے بیان کیا ہے۔ ظفرنامہ کے دیباچہ میں یہ قصہ درج ہے کہ ایک روز ایک وقت نور اسکے دہن میں ظاہر ہوا اور جس طرح مریم بنت عمران روح الامین کے سانس کے ذریعہ سے حاملہ ہوئی تھیں اُسے بھی حمل کے آثار معلوم ہوئے۔ اس طور پر بانجہ خان جو اپنی ماں کے بطن سے بغیر کسی باپ کے پیدا ہوا تھا دُنیائے مغل کا دوسرا مسیح ٹھہرا!! علامہ ابوالفضل اکبرنامہ میں لکھتے ہیں کہ النقوا دختر جوسینہ بہادر ہست از

قوم قیلت برنسل بلاس ... چوں بحدِ کمال رسید امما ... بہ خدمتِ کہ دراں فرمانروائے مغلستان و پسرِ عم او بود پیوند کردند۔ از آنجا کہ او ہمسر بود بلکہ مبتنی نشناخت۔ حضرت آلنقوا کہ آسائش عالمِ معنی بود از آرزش ملک دینی نیز گذشت و بصورت بظاہر امور پرداختہ بسروری و سرکرائی الوس خود متوجہ شد۔ شبے آں نور دیدۂ الٰہی بر بستر استراحت پہلو نہادہ چادر بالش استراحت بکشیدہ بود کہ ناگاہ نورے شگرف در خرگاہ پرتو انداخت و آں نور درکام و دہانِ آں سرچشمۂ عرفاں و حضور در آمد و آں عفت جناب بر منوال حضرت مریم بنت عمران ازاں نور آبستن شد۔ سہ فرزند گرامی سعادت ولادت یافت۔ اولاد بوزنجر قاآں پسر سوم را نیرون گویند یعنی پدید آمدہ از نور

یہ امر کہ مغلوں میں اسلام کی اشاعت بتدریج کیونکر ہوئی اور چغتائی خان کی اولاد میں جسکے حصہ میں چنگیز خاں کے تقسیم کے روسے بلادِ متوسطہ آئے تھے تعلق تیمور خاں نے کس طرح یہ اسلام قبول کیا تھا ہم کسی اَور موقعہ پر ظاہر کرینگے

ماخوذ از ہندوستان کے سلاطین مغلیہ
مصنفہ مسٹر ویلئم ارمن

سید عبدالسبحان

تم پوچھتے ہو میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نہیں بتا سکتا مگر جا رہا ہوں۔ اگر راہ سیدھی ہو تو گمراہ نہ ہونگا۔ اتنا جانتا ہوں کہ صبح صادق اور روز روشن میرے آگے ہیں۔ اور شب تاریک میرے پیچھے۔ یہ میرے لئے کافی ہے۔ نہ اِس سے زیادہ کچھ مجھے نظر آتا ہے نہ اِس سے کم۔ مگر میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ مستقبل کی نسبت مجھے کچھ تردد نہیں۔

ترجمہ از وکٹر ہیوگو

نسیم بھرت پوری

نام سید نصیر حسین، تخلص نسیم۔ میر الماس حسین صاحب مرحوم کے اکلوتے بیٹے ہیں قصبہ پہرسر ریاست بھرت پور میں ایک مردم خیز سادات کی بستی ان کا وطن ہے ولادت ۱۲۵۱ھ میں ہوئی۔ تاریخی نام نظیر حسن قرار پایا۔ عربی و فارسی کی تعلیم مولوی سید محمد سونی پتی سے حاصل کی۔ یہ حکیم مومن خاں مومن اور امام بخش صہبائی کے مشہور شاگردوں میں تھے۔ نسیم کو عروس سخن کی دلفریبیوں نے پندرہ ہی برس کی عمر میں اپنا وارفتہ و شیدا کر لیا۔ جو کچھ کہتے استاد کو دکھاتے مولوی صاحب مشق سخن کو ہر چند ترک کر چکے تھے۔ ہونہار شاگرد کی طبع موزوں میں کمال کے آثار دیکھتے اور خوش ہوتے۔

نسیم نے فیاض ازل کی سرکار سے حافظہ قوی اور ذہن رسا پایا تھا۔ عرصۂ قلیل ہی میں عربی و فارسی۔ عروض اور طب سے بہرۂ تمام حاصل کیا سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔

۱۲۶۷ھ میں سن رسیدہ استاد کے ایما سے نواب میرزا داغ دہلوی کو غزل بغرض اصلاح بھیجی۔ اور پھر بہت انہیں کی شاگردی کو مایۂ ناز و افتخار سمجھا اس زمانہ میں داغ رامپور تھے۔

نسیم جو غزلیں اصلاح کو بھیجتے اُن میں ایک خاص مسرت اور غیر معمولی جدت دیکھ کر داغ کو اپنے نادیدہ شاگرد کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ بلایا۔ انہیں بھی بکمال استاد کی زیارت کی آرزو تھی۔ پہنچے۔

رامپور میں ان دنوں ایک عجیب و غریب اور دلچسپ صحبت کمال موجود تھی

یہاں تمام باکمال جمع ہوتے مصرع طرح دیا جاتا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سب غزلیں لکھتے حسن کلام کی داد پاتے۔

داغ ہونہار شاگرد کو اس صحبت میں لے گئے۔ کاملین فن سے ملایا۔ جودت طبع اور حسن فکر کی تعریف کی۔ خواجہ اسد قلق ذکی طرف مخاطب ہوکر بولے "سید صاحب کچھ ہم کو بھی سنائیے۔" نوجوان شاعر کا دل بڑھا۔ فوراً تعمیل ارشاد کی۔ شباب کا عالم۔ چلبلی طبیعت۔ مشق سخن ترقی پر۔ سنگلاخ زمین میں ایک غزل سنائی۔ جس کا قافیہ سقار، اور ردیف مٹھی میں اٹھی۔ اس میں دو تین شعر ایسے پایہ کے تھے کہ حاضرین کو خیال ہوا ہو استاد داغ نے شاگرد کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ خواجہ اسد قلق اس خیال کو چھپا بھی نہ سکے۔ بولے "میاں صاحبزادہ۔ غزل تم نے لکھی ہے؟ تمہاری کہی ہوئی ہے تو دو چار شعر اسی زمین میں اور بھی نکال سکتے ہو؟" ان کو ایسا سننے کی تاب کہاں؟ نوجوانی اور پھر زور طبیعت کی روانی۔ سر تسلیم خم کر کے جواب دیا کہ حاضر ہوں۔ دوات قلم لے ایک طرف ہو بیٹھے۔ بات کی بات میں سترہ شعر کی غزل کہ ڈالی۔ مطلع ہے ؎

دکھائے مجھے گر وہ بت حنا پا چٹکی میں ۔۔۔ تو لوٹے طائر رنگ حنا ہر اک چٹکی میں

جلسہ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ تحسین و آفرین کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں۔ ارباب ذوق سنتے اور سر دھنتے رہے۔ تھوڑی سی دیر میں وہ رنگ جمایا کہ مشاعرہ کو محفل حال و قال بنا کر اٹھے۔ اس موقع پر چند اشعار ہدیہ ناظرین ہیں جو خالی از لطف نہ ہوں گے۔ حسن مطلع ملاحظہ ہو ؎

حنائی قدمیں ہیں رنج ہے رفتار چٹکی میں ۔۔۔ کھلایا ہے مرے قاتل نے کیا گلزار چٹکی میں

جو ہوتے پل بوسوں کے تو بتا دو آشنا ہے ۔۔۔ لے ہیں غیر نے تیرے گل رخسار چٹکی میں

بہار زخم دامن دار میں ہونے لگی کاوش ابھی کس نے پکڑا دامن دلدار چٹکی میں
خلش تیری مرے دل میں کہ گویا بوسہ لیتی ہے مزا ایسا کہاں ہے دادھی پر خار چٹکی میں
لیا تھا اس زمیں میں امتحان طبع یاروں نے کئے موزوں یہ ہم نے اے نسیم اشعار چٹکی میں

نوعمر شاعر کے استادانہ طرز میں مستعدی کے ساتھ استاد کے روبرو فخریہ انداز میں غزل پڑھنے نے مخالفین کے دلوں پر گولے کا کام کیا ہوگا۔ خلق نے بڑی تعریف کی۔ ہونہار نوجوان کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ امیر مینائی نے اٹھ کر گلے لگایا۔ داغ نے محبت استادانہ سے پیشانی چومی۔ سب نے ترقی علم کمال اور خیر و برکت کی دعائیں دیں۔ تلق کے کہنے سے مذکورہ زمین میں جو غزل نسیم نے مشاعرہ میں پڑھی تھی اس کے بعض شعر یہ ہیں۔

دلِ بیتاب کا آنا ہی تھا دشوار چٹکی میں وگرنہ مثل گل ملتا بجز جو ہوا چٹکی میں

یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

چھٹوں اے ہمصفیرو پنجۂ صیاد سے کیونکر دبے ہیں بال و پر مٹھی میں اور منقار چٹکی میں
نہیں کرتے نہیں کچھ دیر لگتی ہے ہاں کرتے ابھی انکار چٹکی میں ابھی اقرار چٹکی میں
ستاری ہے ہماری پاک نغموں کا خزانہ ہے یہی مضراب بھی منقار کو ستار چٹکی میں
نسیم اب دیکھئے ہوتا ہے کس کا مرغ دل بسمل کماں ہے دوش پر صیاد کے سوفار چٹکی میں

بزرگوں کی دعائیں اور استاد کا فیض کہیں رائگاں جاتے ہیں۔ دو تین سال ہی میں کلام پر ایک خاص قدرت حاصل کر لی۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں استاد کی خدمت میں حسب الطلب گئے ہوئے تھے کہ اُس زمانہ میں امیر مینائی مرحوم نے اپنے شاگرد رشید جلیل کی غزل داغ کے ملاحظہ کو بھیجی۔ جواب میں داغ نے اس زمین میں نسیم کی غزل امیر کو روانہ کی۔ طرح یہ تھی۔

یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

نسیم نے کیسے شعر نکالے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں سب کی گنجائش کہاں۔ چند لکھتا ہوں۔

برا ہے عشق یہ میں جانتا ہوں — مگر ناصح سے ضد سی آ پڑی ہے
بہت دیکھا شب غم کو گھٹا کر — تمہاری زلف سی یہ بھی بڑی ہے
ٹھٹھولی کیا ہے ایک اپنا — غضب کی پھوٹ چھاتو میں پڑی ہے

طرح کے مصرعہ پر کیا مصرعہ لگایا ہے۔

تمہاری زلف جو دل مانگ لیگی — یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے
تہ و بالا کیا ہے تو نے ظالم — قیامت کی جوانی پھٹ پڑی ہے

سنہ ۱۸۸۱ء سے سنہ ۱۹۰۳ء تک داغ کے کلام پر جس قدر اعتراض ہوئے باکمال شاگرد نے سب کے دندان شکن جواب دیئے۔ پہلے اعتراضات کے جواب دہلی پنچ لاہور میں (جس کے مولانا فضل الدین ایڈیٹر تھے) باوقات مختلفہ شائع ہوئے۔ پچھلے اعتراضات کے جواب میں ایک جداگانہ رسالہ موسومہ "تازیانہ" لکھا ہے جو ابوالعلائی پریس آگرہ میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

نسیم فطرتاً سخن فہم اور ساحر تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ صغر سنی ہی کے زمانہ میں رشتہ داروں کو منظوم خطوط لکھا کرتے تھے۔ لیکن اس سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے کہ داغ سا سخن سنج و سخن فہم ان کا معترف تھا۔ چنانچہ وہ اعتراف عقیدت کے درجہ تک پہنچ گیا تھا جو غالب مرحوم کے شاگرد مصطفےٰ خاں کے سوا شاید ہی کسی اور خوش نصیب شاگرد کو نصیب ہوا ہو۔ دیوان سوم یعنی مہتاب داغ کے طبع کرانے کا جب خیال ہوا تو شاگرد رشید کو بھرت پور میں حیدرآباد بلایا اور انہیں کے ہاتھوں دیوان کو ترتیب دیا۔ داغ کو اپنے شاگرد کی سحر گستری پر ناز تھا اور اس نونہال کو اپنے شاداب

اور سارا بہار ریاض کا بہترین شعر سمجھتے تھے۔ یہ انتہا کے حاضر طبیعت بذلہ سنج اور
ظریف تھے۔ ایک دفعہ تو "نسیم" کی سرخی میں ایک مضمون اخبار "دبدبۂ" مراد آباد میں چھپا
فصیح الملک کی نظر سے ہو گذرا۔ اتفاق کی بات ہے اسی ہفتہ میں کوئی غزل اصلاح کے لئے
بھیجی تھی۔ مضمون دیکھ کر داغ ذرا گھبرائے۔ خط لکھا کیوں صاحب یہ تو کہیں
ہم کو بھی اُمید نہ تھی کہ ہمارا نام روشن کرو گے

جس طرح داغ کو نسیم کا یہ خاطر ان کی اُستادی پر نازاں تھا اسی طرح نسیم کو داغ کے
تلمذ پر بیحد فخر اور اپنے کمال کو اُستاد کی دلسوزی اور شفقت میں تمام عمر منسوب
کرتے رہے ؎

فلک ہوں کیوں نہ نسیم کے شعر شاگرد ہے داغ دہلوی کا
نسیم استاد رکھتا ہوں جناب داغ سا ایسا جہاں میں کیوں نہ پھروں کیوں نہ فلک آسا ہو کر

منشی رکن الدین دہلوی جادو جب ریاست بھرت پور میں نائب سررشتہ داری
کے عہدہ پر مامور ہوئے اپنا کلام فصیح الملک کے پاس بغرض اصلاح حیدرآباد بھیجا
داغ نے لکھا نسیم آپ کے پاس بھرت پور میں موجود ہیں اُن سے مشورہ لے لیا
کیجئے۔ خشک حیدرآباد میں جو غزلیں اطراف و اکناف سے بغرض اصلاح آتیں
جب تر نسیم کو بھیج دیتے ہیں کہ اُستاد کی جانب سے اصلاح کریں۔ سبحان اللہ
کیا خیال ہو کہ سوائے اس کے پانچ سال ورچا طرح جمع نہیں ہوئے۔ جسے
دیکھا ریاست کا حال ابتر ہوتا دیکھا۔ نسیم بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ ہو سکے اگرچہ
ریاست بھرت پور میں عہدہ سررشتہ داری پر فائز تھے اور آبائی جاگیر کی
آمدنی جداگانہ تھی لیکن گذارا مشکل سے ہوتا تھا۔ مگر سید قانع اور مستغنی المزاج تھے۔
تاہم تنگی پر آمادہ نہ ہو کر لبوں تک آہ کبھی نہ آئی ہو ؎

کبھی حسرت ہمیں ہوئی نہ کسی مال کی نسیم جس لیے میں تیرے کنارے رہے

تسیمؔ دل ہی ٹھکانے نہیں کچھ میں کیا کہوں
کہاں کے شعر کہاں کی غزل کہاں کی طرح

ملازمت ایسی ملی کہ اُنکی طبیعت کے بالکل خلاف تھی کہاں اُنکی سعید کی علم منکسر المزاجی۔ اخلاق کی فراخی کہاں سب سیکرٹری اور وُہ بھی ریاست کی۔ بھلا فرائض ملازمت فکر سخن اور علمی مشاغل کی کسے مہلت دیتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

تسیمؔ اور کچھ فکر کیجے خدارا
اس نوکری میں گزارا نہ ہوگا

۳ مارچ کو بمقام سورت پھر اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی پھر سر میں اپنے ابا و اجداد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ خدا مغفرت کرے۔ ؎

کہتے ہیں آکے میری قبر پہ سُنا ہے وُہ
تجھ کو لے آئیں کہاں سے مرے مرنیوالے

مشقِ سخن وصل کمال کو پہنچی تھی۔ جوہر شناسوں کو انکی فکر رسا کہنہ مشقی اور علو الکلامی میں جو جو اُمیدیں تھیں اُنکے پورا ہونے کا وقت اب آیا تھا۔ مشیتِ ایزدی میں کون دم مار سکتا ہے۔ مگر آہ یہ سب دلیل نہیں۔ مرحوم کی ایک درد انگیز غزل کے چند شعر یاد آگئے ہر شعر بجائے خود مرثیہ ہے ؎

یوں مٹا دو کہ نشاں تک نہ ملے پھر اُسکا
کہتے جاتے ہیں مری قبر بنانے والے

اس مرے سایہ میں ڈرتے ہیں جسے اپنی قدرت
دوڑ کر خود میری آغوش میں آنیوالے

اِس شعر کی کیفیت بیانی نہیں وجدانی ہے ؎

مل گئی لاش مری۔ قبر کو ٹھوکر۔ لگا
کون ہے دیکھ کے چل۔ راہ میں چلنے والے

ہائے یوں کھڑی قبر پہ جو ٹوٹ پڑا
دیکھتے رہ گئے مُنہ پھیر کے جانیوالے

گل ہو جائے کہیں شمع لحد ہی میری
سو آئیں۔ مری قبر پہ آنیوالے

حسن عابد جعفری

گلاب کی دو ہنستی جاگتی پنکھڑیاں - ہلکی ہلکی سُرخی کی جھلک لیے ہوئے رخسارے!
یہ نظریں مئے سے بھی تیز جانے والی یہ نشیلی اچھوتیاں - موہنی اور سُرمگیں آنکھیں!
یہ آن واحد میں نشیب و فراز عشق کا خاکہ اُتارنے والے خنجر - کمان ابرو اور پیوستہ
بھنویں، یہ بیتِ عاشق اور رشکِ دیدہ کا عکس - سرچشمے والے گیسو، یہ چلتے
نک پلک سا یہ والی اصفہانی تلوار - نازک اور تنگ کمر، یہ دوشیزگی کا
عالم، یہ بھولے پن کا سانچہ - کمسنی کی کیفیت، شعلہ اور شعلۂ جوالہ، آفت
اور آفتِ ناگہاں!! فتنہ اور فتنۂ قیامت!!

صبر و تحمل برباد، عقل و ہوش ندارد! یہاں میں بیقرار ہونے والے دل! نکل جا
نکل جا اور یہ کہتا ہوا نکل جا - کہ ہش سے، یا رب، دل صبر و تحمل! اس قیامت بپا
کرنے والی چال کو، فتنۂ محشر کو جگانے والی حال کو، سکون ہو، چشمِ مخمور
کی بھولی بھالی نظر انگڑائی لیتی ہوئی گوشۂ چشم سے نکلی - لبِ نازک کو -
چمن کی دو ننھی سی پتیوں کو، نسیمِ گفتار نے جنبش دی! اور - اور کچھ نہ پوچھیے
کہ کیا ہوا؟ دلِ حزیں کا جھگڑا طے، دلِ بے چین کا معاملہ ختم، اختتام اور دو
لفظوں میں ختم!! -

بگفتا "قیمتش" گفتم "نگاہے"!
بگفتا "کمترش" گفتم "ترک نگاہے"!

پاداش بخیر، ایک نظرِ غلط انداز پر، ایک تبسم فتنہ زا پر، ایک قاتل قیامت خیز
پر، دلِ ناداں کی تباہیاں، الاماں، الاماں!! اس ناداں کی ضد، لاکھ
مصیبتوں کی ایک مصیبت! اس بیدل کی بیقراری، لاکھ عذابوں کا ایک
عذاب!! اب سے دور، کسی کمسن کے بھولے پن اور ناسمجھی سے پیدا
ہونے والی جفائیں، یہ تڑپنے والا دیوانہ، کسی کے عصمت میں ڈوبے

ہوتے ہیں، دوشیزگی کے چشم و ابرو کا تصور، اور پہاڑ جیسی راتیں، حسرتوں کا مچلنا اور
ارمانوں کی فریاد، بیکسی کا عالم، اور دل ناشاد۔ خدا نہ دکھائے وہ راتیں جب کہ
آنکھوں نے خون جگر کو آنسوؤں کی صورت میں بہایا! اور خدا نہ لائے وہ دن
جب کہ نفس نے سینہ کی آگ کو تیز ہوا سے بھڑکایا!!

مصیبت کی انتہا تھی، ہر حالت کو انقلاب، شکست! اگر دل وحشی
کی وحشت میں فرق، ناممکن قطعی ناممکن!! چشم بد دور، وہ کسی کی وہ اول
اظہار مہربانیاں! وہ کسی کا بے حجابانہ برتاؤ! اور وہ کسی کا بات بات پر مسکرا
دینا، دل نا عاقبت اندیش کے ساتھ وہی کر گیا، جو ہوا آگ کے، اور بارش
طغیانی کے ساتھ کرتی ہے۔ دل کی لگی اور بڑھی، شعلہ عشق اور بھڑکا۔ آتش
شوق تیز ہو گئی!! مگر نہیں، وصال کے بعد بھی عشق کے مقاصد کی کامیابیوں
کے بعد بھی، اور اور خلوت کی بے کھٹکے چاندنی راتوں کے بعد بھی تسکین قلب
نہ ہوئی، دست حنائی اپنی ٹھنڈک سے سینہ کی آگ کو نہ بجھا سکا، اور بادۂ نیم
رات رات بھر نظروں کے سامنے رکھی سیراب نہ کر سکا!!

یا الٰہی میرا یہ دیوانہ مستقل، دل ناصبور، اب بھی ہزاروں حسینوں کو چھوڑ کر
اور انجو رنگی کی کیفیتوں کے مزے لوٹنے کے بعد بھی ایک ہی نظر، ایک ہی
تبسم، ایک سے ناز و ادا کا خواہاں ہی رہا۔ آہ اے کم بخت بوالہوس کوئی
ظالم قوت تامہ کے سبب چڑھانے والے دل، دیوانگی کو بڑھا، وحشت کو
ترقی دے، مجنوں ہو، پاگل بن، اور حد انسانیت سے کوسوں بھاگ کر جا!!

ایک حسن لازوال کو ڈھونڈھ، ایک ہر روز نئے جلوہ میں ظاہر ہونے والے
کی جستجو کر، ایک ایسے جلوہ گر کی تلاش کر جو آن واحد میں ہزاروں کرشمے دکھا کر
تجھے از خود رفتہ بنا دے، جو پھول میں، نسیم سحر میں، نیم شگفتہ غنچوں میں، اور

کلمبس کا مدفن

کلمبس کا حال کئی نمبروں میں شائع ہوا جسکا سلسلہ نمبر ۹ سنہ ۱۹۰۹ء میں ختم ہوتا ہے
مگر اس کے دفن کا حال جو کہ مشتبہ ہے۔ نہ لکھا گیا اس لئے میں ناظرین مخزن کی دلچسپی
کے لحاظ سے کچھ لکھتا ہوں

یہ بالکل درست ہے۔ کہ باوجود اس قدر تکلیفات کے برداشت کرنے کے جو کلمبس نے ملک سپین اور شاہ سپین کے واسطے اٹھائیں بادشاہ نے آخر عمر میں اس کی کچھ قدر نہ کی جیسا کہ ہمارے دوست سید علی احمد صاحب نے لکھا ہے "کہ آخر عمر میں سراؤں میں رہا کرتا اور قرضخواہوں میں گھرا ہوا ستر برس کی عمر میں مئی سنہ ۱۵۰۶ء کی بیسویں تاریخ عالم آخرت کو راہی ہوا" وہ بڑھاپے میں نہایت تنگدستی و افلاس کی حالت میں رہا اور آخرکار ایسا مشہور شخص ایسے رنجوں میں گھل گھل کر مر گیا۔ مگر اس کے دفن کی بات عجب روایت ہے۔ اصل یہ ہے کہ یقین کرنا بہت مشکل ہے۔ کہ کلمبس اصل میں کہاں دفن ہے۔ عام خیال تو یہ ہے کہ وہ جزیرہ کیوبا کے شہر ہوانا میں ایک گرجا میں دفن ہے۔ مگر حال میں ایک انگریزی مؤرخ کے مقولے پر گمان ہے۔ کہ شاید وہاں دفن نہیں کیا گیا۔ اول ہی اول وہ ویلاڈولڈ (سپین کا ایک شہر) میں دفن کیا گیا تھا۔ کیونکہ انتقال تو یقینی طور سے سپین میں ہی ہوا تھا۔ اسکے تھوڑے عرصہ کے بعد اسکی ہڈیاں شہر سیول کو پہنچا دی گئیں۔ چنانچہ بہت سے بلکہ کل جغرافیہ والوں نے شہر سیول کو ہی کلمبس کا مدفن قرار دیا ہے۔ مگر سنہ ۱۵۲۱-۲۹ء میں اسکی ہڈیاں جزیرہ ہسپانیولہ کو بھیجی گئیں اور شہر سان ڈومنگو کے گرجا میں دفن ہوئیں۔ اس کے متعلق

ہونے کی وجہ یہ بیان کیجاتی ہے۔ کہ کلمبس کے بیٹے کی بیوی نے یہاں دفن کرنیکو
کہا تھا کیونکہ کلمبس نے وصیت کے طور پر اپنی بہو سے کہا تھا کہ میں نئی دنیا
جس کے لئے میں نے اتنی تکلیفیں اُٹھائی ہیں اور دریافت کیا
ہے۔ دفن کیا جاؤں۔ پس اس کی بہو نے اس کی وصیت پر
عمل کیا۔ مگر جب جزیرہ ہائیٹی سنہ ۱۷۹۵ء میں فرانس کو دیدیا گیا۔ تو گورنمنٹ
سپین نے کلمبس کی ہڈیوں کو ہوانا میں لیجانے کا حکم دیا۔ تاکہ اس کی ہڈیاں
اور خاک ہمیشہ سپین کی حکومت میں رہیں۔ پس ایک بڑا صندوق اس بڑے
اور مشہور شخص کی خاک اور ہڈیوں کا بھر کر ہوانا کو بھیجا گیا۔ مگر اس سے قبل
کلمبس کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں سپین سے منتقل کر کے سین ڈومنگو کے
گرجا میں اپنے باپ کے پہلو کے پاس دفن کی گئی تھیں۔ پس وہی انگریزی
مصنف پورا پورا یقین کرتا ہے۔ کہ سین ڈومنگو سے ہوانا کو منتقل کرتے
وقت کلمبس کی ہڈیوں کے بجائے غلطی سے اس کے ایک بیٹے کی ہڈیاں
صندوق میں بھر کر ہوانا کو بھیجی گئیں۔ اور یہ مشہور شخص ابتک سین ڈومنگو کے
گرجا میں دفن ہے۔ اس کے ثبوت میں انگریزی مورخ لکھتا ہے۔ کہ اس نے
خود خوب غور سے ایک صندوق سنہ ۱۸۷۷ء میں سین ڈومنگو کے گرجا
میں دیکھا تھا جس پر کلمبس کا نام لکھا تھا اور جس کو وہاں کے لوگ معلوم
کرنے والا کہتے تھے۔ اور اس کا پورا ثبوت یہ ہے کہ کلمبس نے اپنے مرنے
سے پہلے شاہ سپین کو لکھا تھا کہ میں ایک زخم سے سخت تکلیف میں ہوں
جو کبھی اچھا نہ ہوگا اور نہ اسکے اچھا ہونے کی اُمید ہو سکتی ہے اور اسی حال کے
صندوق میں جس میں انسان کی خاک بھری ہوئی تھی۔ ایک گولی بھی جو سیسے
کی پرانی ساخت کی تھی پائی گئی۔ اور یہ سب جانتے ہیں۔ کہ سیسے کی گولی

انیسویں صدی پر تنقید

نظر عائر سے مشاہدہ کرنے والا انیسویں صدی کے خاتمہ میں بات حیرت انگیز
دیکھتا ہے۔ تمام تعلیم یافتہ اشخاص باتفاق رائے کہتے ہیں کہ صدی مذکورہ بہت
صورتوں میں سابق صدی سے بے انتہا مفید ثابت ہوئی۔ جس کے دوران میں
وہ لاینحل عقدے کھل گئے جو اس کے آغاز میں ناممکن سمجھے جاتے تھے۔ اس کی
بدولت موجودہ تہذیب کو بالکل باستعجاب تعجب ہوا۔ صرف اس وجہ سے کہ نیچر کے
خالص علم میں حیرت انگیز بیاسی ترقی عمل میں آئی مگر علم مذکورہ کا عملی استعمال۔
صنعت۔ سائنس۔ صنعت۔ حرفت تجارت وغیرہ میں کئے جانے سے خیر
اور سودمند نتائج پیدا ہوئے برخلاف اس کے اخلاقی و معاشرتی زندگی میں بمقابلہ
گذشتہ صدیوں کے ہم سے کچھ ترقی نہ ہو سکی۔ اور بسا اوقات شدید مخاصمت
پیدا ہوئی اور بس صریح مخاصمت سے صرف نفاق اور جھوٹ کامیاب کرنے والا
نتیجہ ظہور میں آیا۔ بلکہ پولیٹکل اور سوشل دنیا میں سخت مصیبت برپا ہونے کا اندیشہ ہو گیا
لہذا ہر ایک راستباز اور انصاف پسند اور محب انسان کا مقدم فرض ہے کہ مخاصمت
مذکورہ کے طے کرنے میں سرگرمی سے مصروف ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ خطرات
پیش آنے والے ہیں ان کو روکنے کی کوشش کرے۔ ہمارے یقین میں جب تک
حوصلہ اور بہادری سے اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اور موجودات دنیا
کی بالکل صاف تحقیقات عمل میں نہ آئے۔ یہ مدعا حاصل نہیں ہو سکتا اور تحقیقات بھی
ایسی جس میں خالص سچ اور اصل حقیقت کے سوا جھوٹ اور تصنع کا گمان نہ ہو۔
اگر ہم انیسویں صدی کے آغاز میں سائنس کی ناکامل حالت یاد کر کے اس کا

اصول مذکورہ کو بدیہی بنیاد پر قائم کرنے اور اسکا عالمگیر تصرف بتلانے کی لازوال عزت چارلس ڈارون سائنس کے نامور فاضل کا حصہ ہے۔ یہ شخص ہے جس نے سنہ ۱۸۵۹ء میں "تھیوری آف ڈیسنٹ" یعنی نسل انسان کی تحقیق کا قیاس مستحکم بنیاد پر قائم کر دیا جسکو اس کے لائق فاضل "جین بسمارک" نے سنہ ۱۸۰۹ء میں اپنی تصنیف میں خاکے کے طور پر کھینچا تھا۔ اور جسکی حقیقت سنہ ۱۷۹۹ء میں جرمنی کے زبردست شاعر اور بلند خیال مصنف "ولف گینگ گوئٹی" نے پیشگوئی کے طور پر ظاہر کی تھی۔

اس تھیوری سے ہم کو تمام سوالوں کے ایک زبردست سوال کی کنجی ہاتھ لگتی ہے اور وہ موجوداتِ قدرت میں انسان کی جگہ اور اس کے فطری نشو و نما کا [illegible]

اگر ہم آج قانون ارتقا کا تسلط پہچان سکتے ہیں اور نیچر کے ہر ایک شعبہ میں وحدت آمیز ارتقاء دیکھتے ہیں اور تمام عجائبات قدرت کی سادہ تعبیر بیان کرنے کے لئے اسکو "قانون مادہ" کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ تو یہ تمام قابلیت ہم کو ان تین تھیوریوں یعنی فطری تواریخ کے فاضلوں کی بدولت ہوئی۔ جو تین زبردست ستاروں کی حیثیت میں انیسویں صدی کے بڑے آدمیوں میں چمکتے ہیں۔

جس حالت میں کہ ہم اس ترقی پر جو انیسویں صدی میں موجوداتِ قدرت اور اس کے علمی استعمال میں ہوئی فخر کے ساتھ نظر کرتے ہیں۔ تو ہماری نظر موجودہ زندگی کے دوسرے صفحہ پر پڑ جاتی ہے۔ جو کسی دلیل سے غیر ضروری نہیں ہو سکتا۔ اس وقت بدقسمتی سے بالکل مختلف اور مکروہ تصویر دیکھتے ہیں جسکو دیکھکر ہمیں بے اختیار بحث افسوس کے ساتھ الفریڈ ویلیس کے الفاظ کی تصدیق کرنی پڑتی ہے۔ جو حسب ذیل ہیں۔ بمقابلہ اس حیرت انگیز ترقی کے جو ہم نے طبیعیات اور اسکے علمی استعمال میں کی ہے۔ ہماری قومی تعلیم ہمارا کل معاشرتی اور تمدنی انتظام ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہے۔ ہم زبردست الزام کی صحت کا یقین کرنے کے لئے ہم کو نقطۂ غیر متعصبانہ نظر معاشرت عامہ پر ڈالنی چاہئے۔

[illegible]

ریویو

دیوان وحشت

مولوی رضا علی صاحب "وحشت" کی مہربانی سے اُنکا دیوان جو ابھی ابھی چھپا ہے کلکتے سے میرے پاس پہنچا ہے۔ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مَیں سب سے پہلے یہ کہہ دیتا ہوں کہ مجھ سے اور حضرت "وحشت" سے شناسائی بھی نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو کچھ مجھے اس دیوان کے متعلق لکھنا ہے اُسے لوگ محبت یا مروت پر محمول نہ کریں۔

اگرچہ مَیں کبھی کبھی غزل کہتا ہوں مگر بہ نسبت مجھے غزل کی جانب رغبت بہت کم ہے۔ کبھی کسی کی فرمائش سے مجبور ہو جاؤں یا کبھی دل خود ہی کسی زمین کو پسند کر اُٹھے تو دوسری بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے کئی برسوں سے میں نے کسی کا دیوان نہیں دیکھا مگر اب دیکھا تو حضرت وحشت کے دیوان کو۔

دیوانِ "وحشت" مَیں کیا ہے جسکے سبب سے وہ وحشت جو مجھے غزلوں کو دیکھ کر ہوا کرتی تھی رغبت سے بدل گئی اور میں نے اُسے اول سے آخر تک بہت شوق سے دیکھا۔ اب ہم تو آج کل ہندوستان میں حضرت غالب اور حضرت میر کی تقلید کرنے والے زبان کے دعوے سے تو اکثر پائے جاتے ہیں مگر کلام کے رنگ سے کم۔ میں نے کم کا لفظ صرف اس بنا پر لکھا ہے کہ پوری تقلید حضرت غالب کے رنگ کی حضرت وحشت ہی کی ہے اور انکی ذات "واحد کم ہی" کے لفظ کی مصداق ہو سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس تقلید میں اپنی قوتِ طبع اور جودتِ فہم سے کامیاب ہوئے ہیں۔ یہی بات ہے جس نے جدتِ رنگ سے مجھے اس دیوان کی جانب کھینچا۔

میں نمبر نظر انتخابی کے چند اشعار حضرت وحشت کے لکھے دیتا ہوں جو خود ہی
اپنے رنگ کی خوبیوں سے دل لُوٹینگے۔

عالم عجب سے پیدا تھا اک عدم انقلاب — کبھی سر کی بھی لیسا تھا جو جھاتا دل تھا

جان دینے سے مجھے داد وفا کی مطلوب — یہ وہ چار گھڑی بھی تو نہیں جاں سے رہا

قدر دانی کی کیفیت معلوم — عیب کیا ہے اگر ہنر نہ ہوا

اُسی کا بے وفا دل کاش اس کا فکر سمجھا دے — سمجھ میں اُسکی آتی ہی نہیں بات اہل دل

پیمانِ وفا کے یار ہیں ہم — یعنی ناپائدار ہیں ہم

کسکو خبر نہیں ہے کہ دیتا ہے وہ فریب — ہاں وہ فریب کھانیکی عادت ہے کیا کریں

بگڑا ہے گی ہوس سے کم ظرفیٔ دہر — ہم دل میں جو حسن کی ہوس کا خار رکھیں

مطلب ہے سیر باغ سے افزائش جنوں — ورنہ دھرا ہی کیا ہے نسیم بہار میں

رباعی

تم وعدے بھی کرتے ہو مکرتے بھی ہو — تم آپ بگڑتے بھی سنورتے بھی ہو
عاشق سے جفا کے بعد کرتے ہو وفا — کیا خوب! ڈراتے بھی ہو ڈرتے بھی ہو

میں نے اوراق کو الٹ پلٹ کے یہ اشعار لکھ دیئے ہیں جو خوبی تقلید اور
حسن معانی کے ثابت کرنے کو کافی ہیں ورنہ اسا تا بد ہی کوئی شعر ہو جو جدت -
لطف سخن - طرز فصاحت اور عشق یا حسن کے پُر اثر جذبے سے خالی ہو۔

میں نے اس خوبی کے ساتھ اور بھی ایک دلچسپی پائی کہ حضرت "وحشت" کلکتے
کے رہنے والے ہیں لیکن انہوں نے زبان کو اس قدر صاف - درست اور با محاورہ
کیا ہے کہ گویا وہ دہلی یا لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں رہے ہے۔

دیوان میں قطعے - مسدس - جدید رنگ کی نظمیں بھی ہیں اور آخر میں فارسی
زبان کی نظموں کا حصہ ہے۔

میں طول کو مختصر کر کے آخر میں اس قدر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ دیوان وحشت
شعرا کے ہر معنی سے لطف ہے اور اسکا ہر شعر قابل دیکھنے اور داد دینے کے ہے - سچ
یہ ہے کہ حضرت "وحشت" اپنی طبیعت کی جولانیوں سے اپنے ارادوں میں پورے طور پر
کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ دیوان علاوہ ٹائٹل پیج کے ۲۰۸ صفحوں پر ہے قیمت فی جلد عہ
حضرت مصنف سے اس پتے کے ساتھ مل سکتا ہے۔

نمبر ۴۱ - کرایا روڈ ڈاکخانہ بالیگنج - کلکتہ

احمد علی شوق قدوائی لکھنوی

آدمی جب دل سے کام کرے اور اپنے فرض کے ادا کرنے میں اپنی بہترین ہمت
صرف کرے تو اسے خود بخود ایک اطمینان حاصل ہوتا ہے - اور وہ بشاش نظر آتا ہے -
مگر جو کام بے دلی سے کئے ہوتے ہیں - اُنکا اثر بالکل اسکے خلاف ہوتا ہے -
(ایمرسن)

تعلیم سنسکرت کی ضرورت

ریاست کپورتھلہ کے "رندھیر کالج" کے پروفیسر مولوی محمود علی صاحب نے مندرجہ ذیل مضمون ہال کے اسٹڈی کے ایک جلسے کے روبرو پڑھا۔ یہ مضمون نہایت غور و فکر کا نتیجہ ہے اور غور سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔

گھر کے مال و اسباب اور دیگر حالات سے ایک تو وہ شخص واقف ہوتا ہے جو اس گھر میں رہتا ہو اور اسکی ہر چیز کو روزانہ برت کر دیکھتا ہو اور ایک وہ شخص بھی کسقدر واقف ہوتا ہے جو اس گھر سے تعلق نہیں رکھتا مگر اس میں چوری کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ گھر کے مالک کی واقفیت مکمل اور یقینی ہوتی ہے لیکن بعض اوقات چور بھی اس اشتیاق کے سبب سے جو گھر کے مال و اسباب کے متعلق رکھتا ہے گھر کی ظاہری عظمت و شان اور اسکے باشندوں کی طرز روش سے اندر کے مال و اسباب کا بڑی حد تک اندازہ قائم کر لیتا ہے اور کبھی کبھی وہ اندازہ صحیح بھی ہوتا ہے۔ سنسکرت کے فوائد و منافع کے متعلق بھی اسی طرح پوری واقفیت اور اگر چاہیں تو اس کا پورا اظہار وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس زبان کے ماہر اور اس گھر کے مالک ہیں اور مجھ جیسا شخص اور اس زبان سے بالکل ناآشنا اگر کچھ واقفیت رکھ سکتا ہے تو وہ اسی چور کا سا اندازہ ہوگا۔ اپنے تئیں چور سے تشبیہ دینا شاید کسی کو گوارا نہ ہو لیکن چونکہ ایک علمی خزانہ کا ذکر ہے اس لئے تشبیہ ایک طرف اگر کبھی میں واقعی اس گنجینہ سے کچھ چرا سکوں تو اسکو اپنا فخر سمجھونگا اور اس لئے اسوقت اپنے تئیں ایک ناکام چور سے تشبیہ دیکر عرض کرتا ہوں کہ میں نے اس خزانہ کی دولت کا کیسا کچھ اندازہ کیا ہے۔

الفاظ ـ میں نے اکثر سنا ہے کہ سنسکرت بہت وسیع زبان ہے اس لئے سب سے پہلے میرا خیال وسعت کی طرف گیا مگر اندازہ نہیں سکتا کہ وسعت کی پیمائش کروں۔ اس لئے جو دوسری وسیع زبانیں دیکھی ہوئی ہیں ان کا خیال آیا اور ایک حکایت یاد آئی کہ ایک دفعہ خلیفہ عبدالملک نے ایک علمی دربار میں کہا کہ تم میں سے کون شخص انسانی اعضا کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر بیان کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص اٹھا اور اس نے اعضائے انسانی میں سے تیس نام اس طرح پر کہ پہلا الف سے شروع ہو اور دوسرا ب سے اور تیسرا ت سے گن دیئے۔ اس کے بعد ایک اور شخص اٹھا اور بولا کہ میں ایک ایک حرف کے دو دو نام گن سکتا ہوں۔ پہلے شخص نے کہا کہ ہوسکے کہ ایک ایک حرف کے تین تین نام اور بھی ہو سکتے ہیں اور اس نے اعضائے انسانی کے نوے علاوہ پہلے ناموں کے نام پیش کئے۔ میرے فاضل استاد قاضی ظفرالدین مرحوم نے اپنے اخبار میں یہ قصہ لکھا تو انہوں نے علاوہ ان ناموں کے اور بہت سے نام بھی درج کئے اور اس طرح کسی حرف کے چار اور کسی کے پانچ اور کسی کے چھ سات نام پائے گئے۔ اور میں نے شمار کئے تو ۲۹۲ لفظ اعضائے انسانی کے نئے پائے اور پھر بھی بید الفاظ لکے۔ حال میں آئے حیوان کے علاوہ اور اس طرح جہاں ہماری زبان میں ہاتھ کے اندر ہتھیلی۔ انگوٹھا۔ چھنگلیا وغیرہ بھی چند اعضا علیحدہ نام رکھتے ہیں وہاں عربی میں ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کے نام الگ الگ ہیں۔ انگلی کے تین حصے ہوتے ہیں ان میں سے ہر حصے کا نام جدا ہے اور اگر ہم کو کہنا ہو کہ میری چھنگلیا کے پاس کی انگلی کے درمیانی جوڑ میں درد ہے تو اردو میں جہاں پانچ لفظوں اور بہت دفعہ 'کا' اور 'کے' لانے سے کام نکلتا ہے وہاں عربی میں بنصر (انگلی کا نام) اور برجمہ (درمیانی جوڑ کا نام) کل دو لفظوں میں یہی مطلب ادا ہو جاتا ہے۔ اردو میں عربی کے یہ الفاظ داخل نہیں ہوئے اس لئے بولیں تو بدنما معلوم ہوں گے

نہ کہوں تو ہمک جائے اور جنگل میں جل جائے — حباب پانی نہ جلے جس میں آہ سمائے

اس قسم کا درد ہم کو فارسی میں بھی نظر آتا ہے چنانچہ شاعر کہتا ہے

شب ز گرمی ہائے اشکِ دست بپا سوختیم — چون بسراغ ناخدا رفتیم دریا سوختیم

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنین حائل — کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

مگر اصل میں فارسی کا حصہ صرف خیالات ہیں اور ان میں درد اکثر ہوتا ہے اس لیے بالواسطہ فارسی سے درد بھی پیدا ہو گیا لیکن ہندی زبان میں ایسے درد کو ہمیشہ نمایاں طور پر ادا ہوتے دیکھا ہے اور چونکہ یہ زبانیں سنسکرت کی نسل سے ہیں اس لیے میں گمان کرتا ہوں کہ غالباً درد انگیز خیالات انکو ورثہ میں ملے ہوں گے۔ یہ میرا اپنا گمان ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو لیکن اس قدر تو ہوگا کہ سنسکرت کو عام قاعدے کے مطابق کسی نہ کسی قسم کے خیالات سے لگاؤ ہوگا۔ ادھر ہماری مروجہ زبان ابھی عالمِ طفلی میں تھی اور بچپن کے زمانہ میں حسن و عشق اور بے سروپا مبالغوں کے ساتھ کھیلنے اور بالواسطہ اپنی قوت کو بڑھانے کے سوا اور کچھ کیا نہیں۔ مگر طبیعت ہونہار تھی اور مختلف خیالات اور الفاظ کو اخذ کرنے کی قابلیت ابتدا ہی میں اس لیے جب کچھ ہوش سنبھالا تو دبیر و انیس کی بدولت میں شجاعت اور رنج و غم کے منظر مگر مبالغوں میں گھرے ہوئے اور غالب کی تعلیم سے کلام میں تعاہب اور حالی کی کوشش سے عربی سادگی اور معاملہ بندی پیدا کر لی۔ مگر ابھی تک اس زبان کو بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس لیے سنسکرت کی اشاعت سے میں گمان کرتا ہوں کہ جو خیالات اس سے مخصوص ہو گئے وہ کچھ بھی ہوں اردو کے ذخیرہ میں انکے آنے سے قیمتی اضافہ ہوگا۔

مبالغہ — پہلے الفاظ اور شاعرانہ خیالات کے متعلق گفتگو تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس حیثیت سے سنسکرت کی اشاعت ہر طرح مفید ہے لیکن قرائن سے

ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت میں مبالغہ کا استعمال بھی نہایت کثرت سے ہے چنانچہ رامائن اور
مہابھارت کا ترجمہ جب کبھی سُننے کا اتفاق ہوا ہے تو تعریف اور مذمت کے
مضامین میں حد سے زیادہ غلو نظر آیا ہے۔ مجھے اصل میں مبالغہ سے ایسی نفرت
نہیں جس قدر آجکل ایشیائی شاعرانہ مضامین کو سُنکر ظاہر کیجاتی ہے اور مَیں
جانتا ہوں کہ کلام کو آراستہ کرنے کے لئے کسی نہ کسی حد تک مبالغہ کی ضرورت ہے
اور استعمال بھی سہی۔ باتوں میں ہوتا ہے "خوف کے مارے دم بند ہوگیا" "خوشی میں
پھولا نہیں سماتا" "آسمان سے آگ برس رہی ہے" "رات کاٹنی پہاڑ ہوگئی" یہ
مبالغے ہیں مگر انکی جگہ سادہ لفظوں کو رکھ کر دیکھ لو۔ کلام کیسا پھیکا ہو جاتا ہے
اس لئے سنسکرت کے مبالغوں سے مجھے ایسی وحشت نہیں ہوتی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ
مبالغے کی شکل میں لانا اور بات ہے اور کسی شخص کو دیوکل کہنے میں۔ مضائقہ
نہیں لیکن مبالغہ کو تاریخی واقعہ کی شکل میں بیان کرنا جس سے معلوم ہو کہ واقع
میں کسی شخص کے دس سر تھے۔ اور گدھے کا سر بھی لگا ہوا تھا۔ ناک کے سوراخ
ایسے بڑے تھے کہ اونٹوں کی قطاریں جا گھسیں یا کسی شخص کے رتھ کے پہیے
اتنے بڑے تھے کہ آسمان پر کہکشاں اُنکی رگڑ سے بن گیا۔ ایسے خیالات اور
انکو ادا کرنے کا یہ ڈھنگ میرے نزدیک کلام کے اثر کو تباہ کرنے والا ہے۔
اور مَیں چاہتا ہوں کہ سنسکرت کی اشاعت تو ہو مگر اس طرزِ کلام سے اجتناب
کیا جائے۔ اور مجھے تعجب ہوتا ہے جب سُنتا ہوں کہ رامائن اور مہابھارت
کی کتابیں نوجوانوں کو سنائی جاتی ہیں تاکہ اُن میں قومی سپرٹ اور بہادرانہ
ولولہ پیدا ہو۔ حالانکہ جب ان بزرگوں کے حالات اس شکل سے بیان کئے گئے
ہیں کہ وہ انسانی طاقت سے بہت زیادہ غیر معمولی قوت اور زور رکھتے تھے
اور دیووں اور بھوتوں پر غالب آسکتے تھے تو انکے کارنامے سُنکر انکی

[illegible] کرنے والوں جیسے جوہر پیدا کرنے کا حوصلہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ [illegible]
[illegible] خیال کرتا ہے کہ وہ لوگ سوپر نیچرل طاقت کے مالک اور اسلئے ایشور کے
[illegible] تھے اور ہم چونکہ ویسے نہیں اِس لئے ہم میں وہ جوہر بھی پیدا نہیں ہو سکتے اُو
[illegible] ان کتھاؤں کے سُننے سے اُنکے دماغ غلط خوش اعتقادیوں سے تو
بھر جائینگے لیکن قومی جوش اور بہادرانہ ولولہ پیدا ہونے کی ہرگز توقع نہیں
سچا قومی جوش ہو یا کوئی اور احساس اپنی کارناموں کو سُنانے سے پیدا ہو سکتا ہے
جو سچے تاریخی ثبوت پر مبنی ہوں اور انسانی طاقت کو انسانی حد تک ظاہر کریں
البتہ کلام کو موثر بنانے کے لئے اُس پر ہلکا سا شاعرانہ رنگ چڑھا دیا جائے۔
غرض ہر حال میں کہتی سے راست بازی پیدا ہونے کی امید رکھنی چاہئے اور
غلطی سے راستی کی آسودہ کامیابی کا راستہ نہیں اور اس لئے میرے نزدیک
ایسے مصنفوں کی قدردانی اسی قدر ہونی چاہئے کہ سنسکرت جاننے والے انکو
پڑھکر شاعرانہ بلند پروازیوں کی سیر کیا کریں۔ لیکن عوام الناس کو راون اور
ہنومان کے سچ مچ دیو ہونے کا یقین نہ دلائیں۔

علوم۔ الفاظ اور خیالات کے بعد مضامین ہیں۔ سُنتا ہوں کہ سنسکرت
بہت سے علمی ذخیرے رکھتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں جو کچھ ہو گا اپنے
زمانہ کے لئے بیشک قابلِ فخر ہو گا۔ مگر یہ خیال کہ جو کچھ اب تک دریافت ہو چکا
ہے اور علومِ عقلیہ پانچ سات ہزار برس کا راستہ طے کر کے جس منزل تک اب
پہنچ گئے ہیں۔ ویدک یا ریشیاں یا گرانتھ میں سنسکرت والے وہ سب کچھ پہنچ
چکے تھے۔ میں اس کو مذہبی خوش اعتقادی سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ میں
کہتا ہوں کہ علومِ عقلیہ میں بہت سے ایسے مسائل سنسکرت کتابوں میں ثابت [illegible]

مان گئے ہونگے جن کا غلط ہونا آج یقیناً ثابت ہو چکا ہو اور بہت سے مسائل ایسے
اِس بدلنے والے صداقت کی صرف ابتدائی جھلک دیکھنے پڑے ہونگے اور اُنکی
حقیقت کا انکشاف زمانہ مابعد پر منحصر رہا ہوگا۔ کیونکہ زمانہ کی علمی رفتار علم طرح
اسی طرح واقع ہوئی ہو اور کسی مسئلہ کو سمجھنے یا اس سے کام لینے کی قابلیت دنیا کی
جس قدر عمر گذرنے کے بعد ہو سکتی ہو وہ اس وقت سے ایک دن پہلے بھی نہیں ہو سکتی
میں سنسکرت علوم کو اس خیال سے پڑھنا کہ جو کچھ آج دریافت ہو رہا ہے۔
پہلے سے اِن کتابوں میں موجود ہو ہرگز مناسب نہیں اور اس غرض سے سنسکرت
کی اشاعت بجائے کچھ فائدہ پہنچانے کے سخت نقصان دیگی۔
مگر اس صورت میں جو سنسکرت علوم کی تعلیم سے میں روکتا ہوں وہ خاص اسی
نیت سے مشروط ہو۔ ورنہ جس طرح میدانِ جنگ میں ایک شمشیر زن حملہ کے وقت
ایسا قدم پیچھے ہٹاتا ہو تا اور زیادہ زور میں سر کر آگے بڑھے۔ اسی طرح میں سنسکرت
والوں کو روکنا تو چاہتا ہوں مگر ایک اور طرح بر عکس سے بھی زیادہ توجہ دینے کے
لئے۔ کیونکہ میں اگرچہ سمجھتا ہوں کہ سنسکرت کے اکثر علوم موجودہ علمی حالت کے
مقابلہ میں ناکارہ ہو گئے۔ مگر پھر بھی انکی اشاعت سے بہت سے فوائد کا یقین رکھتا ہوں۔
اولی فائدہ۔ اوّل تجربہ نے دکھایا ہے کہ جن لوگوں نے پہلے عربی زبان کے
علوم عقلیہ کو پڑھا ہو اور اسکے بعد موجودہ علوم کو اُن کی ترقی یافتہ شکل میں مطالعہ
کیا ہو۔ اسکی وجہ چاہے ایشیائی طرزِ ادا کا ہماری طبیعتوں سے مناسبت رکھنا ہو
یا ایک بات ذہن نشین ہو سکنے کے بعد دوسری بار وہی بات کسی قدر اصلاح پا کر سامنے
آنے سے دل پر زیادہ تصرف کرتی ہو یا کوئی اور وجہ ہو۔ اگر قاعدہ یہ ہے تو سنسکرت
علوم حاصل کرنے کے بعد جدید علوم کی طرف آنے سے بھی اسی فائدہ کی اُمید
ہے اور شاستری بی۔ اے صرف بی۔ اے سے غالباً بہتر ہوگا۔

تاریخ علوم ۔ دوسرے علوم کی رفتار ترقی کی جانب نہایت آہستگی کے ساتھ ہوا کرتی ہے اور کسی علم کے گذشتہ حالات کو اور انکی تبدیلیوں کو دریافت کرنا ایسا دلچسپ اور نیز ترقی کے فوائد معلوم کرنے میں ایسا مفید ہے کہ علوم کی ہسٹری فی زمانہ ایک علیحدہ فن قرار پا گیا ہے اور جس قدر دنیا کی قوموں اور انکی کوششوں کا حال معلوم ہوتا جاتا ہے اسی قدر علوم کی تاریخ تکمیل کے قریب آتی جاتی ہے لیکن علوم کو ترقی دینے میں جس قدر حصہ اہل ہند نے لیا ہے اور ترقی کے جس درجہ تک پہنچا دی میں یہ لوگ کام آئے ہیں اسکا مجمل تذکرہ سب کی زبان پر ہے مگر تفصیلی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ اس لئے سنسکرت کی اشاعت سے دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ علوم کی تاریخ میں جو کمی ہند کے حالات نہ معلوم ہونے سے ہے وہ دور ہو جائیگی اور دنیا دیکھ لیگی کہ یہاں والوں نے علم کی خدمت کس حد تک ادا کی تھی۔

تاریخ ہند ۔ تیسرے نہ صرف علوم کی تاریخ کا ہندوستانی حصہ بلکہ خود ہندوستان کی تمام تر قدیم تاریخ آجتک ایک راز ہے اور اسکو دریافت کرنے کے لئے باہر والے تو مدت سے بیقرار تھے۔ اب خود یہاں والوں کو بھی اس کمی کا احساس ہوا ہے اور میں سنتا ہوں کہ اس غرض کے لئے اہل ہند کسی طرح کی متفقہ کوشش بھی کر رہے ہیں۔ مگر جو حالت ہم اہل ہند کی اسوقت ہے مجھے اس کے ہوتے تاریخ ہند مرتب ہو جانے میں بہت تامل ہے۔ کیونکہ میں فخر سے نہیں کہتا بلکہ امر واقعہ کا اظہار کرتا ہوں کہ جس وقت سے مسلمان ہندوستان میں آئے میں جب سے آجتک کی تاریخ آئینہ کی طرح روشن ہے اور اس عرصہ کے ہر ایک حصہ کے لئے اسقدر متعدد شہادتیں موجود ہیں کہ کسی واقعہ کو دریافت کرنے میں دقت نہیں ہوتی۔ مگر سیلا ہے باہمی اختلاف کا کہ خود اس زمانہ کے لئے بہت سی غلط باتیں جو عداوت کو ترقی دینے میں مفید ہیں۔ بغیر کسی ثبوت کے بطور ایک تاریخی ٹکٹ

کے تسلیم کرینگی میں اور جب دلوں پر یہ رنگ چڑھا ہوا ہو تو اس سے جہاں اپنی قوم
کے بعض ناموروں کو ممتاز کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ وہاں قدیم زمانے کے حالات
دریافت کرتے ہوئے اکثر گمناموں کو نامور بنانے کا کام لیا جائیگا۔ اور سچی تاریخی
روشنی اگر پھیل سکیگی تو جب کہ سنسکرت کی عام اشاعت ہو۔ اور اس کے علوم۔
زبان کے ناٹک۔ اسکی نقلیں۔ اس کے سب ہندوستان والے ان تمام تاریخوں
کو چھاپنے کے کام کے قابل اور اطمینان کے قابل واقعات چننے کے قابل ہو جائیں
اور یہ مصالح ایسا عام ہو کہ پھر تعصب اور طرفداری کا رنگ رکھنے والوں کا کھوٹ
رکھنے والوں کو بھی معلوم ہو سکے۔ غرض میرے نزدیک سنسکرت اور اس کے
تمام علوم کی اشاعت کے بہت بڑے فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ ہو کہ ہندوستان
قدیم کی سچی تاریخ کا مرتب ہونا محض اسپر منحصر ہے۔

ویدک طبابت وغیرہ۔ چھٹے۔ اگرچہ میں قدیم زمانے کے بہت سے
عقلی علوم کی نسبت جدید علوم کو بہتر سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ پیشتر کے بہت
سے مسلمات آج غلط ثابت ہو گئے ہیں مگر تاہم علوم قدیمہ کے بہت سی کتابیں
ایسے پختہ بھی ہیں جو کبھی غلط نہ ہو سکیں اور ان سے آگاہ ہونا ایسا ہی مفید ہوگا
جیسے جدید تحقیقات کو دریافت کرنا۔ مثلاً طب کے علمی حصہ میں گو آجکل بہت
بڑی ترقی ہو گئی ہے اور اعضائے جسمانی کی تشریح اور دواؤں کی کیمیائی
تحلیل و ترکیب کے متعلق جو باتیں آج معلوم ہیں وہ پہلے کہاں تھیں لیکن اسکے
عملی حصہ کی کیفیت کچھ اور ہے۔ اس میں بھی بیشک بہت سی نئی دوائیں اور
بہت سے نئے طریقے دواسازی اور علاج کے دریافت ہوئے اور ہوتے
جاتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ہی جو دوا کسی مرض کے لئے خاص حالات کے
اندر پانچ ہزار سال پہلے مفید ثابت ہوئی تھی وہ دوا اگر حالات وہی ہوں تو

کام آنی مفید ہو اسلئے سنسکرت اور دیگر قدیم زبانوں کا طبی حصہ جہاں تک عمل اسکا ہو
سکتا ہو وہ ہمیشہ کے لئے مفید اور ہمیشہ کے لئے صحیح ہے اور نیز انسانی زندگی
کی حفاظت کے لئے طریقے جس قدر بھی رائج ہوں کم ہیں۔ اس لئے میں سنسکرت
کی اس علمی شاخ کو ضروری ہونے میں جدید میڈیکل تعلیم اور دیگر علوم کے
برابر سمجھتا ہوں۔

الہٰیات۔ پانچویں میرا یہ عقیدہ نہیں کہ آجکل کی تہذیب نے گزشتہ زمانے
کے تمام علوم میں اصلاح کی ہے۔ نہیں بلکہ آجکل کی تہذیب مادی تہذیب ہے لہٰذا
اُس نے مادی علوم کو بیشک ترقی دی۔ لیکن روحانی علوم کے لئے موجودہ عہد
زمانہ وحشت اور تاریک زمانے سے بھی بدتر ہے۔ اور باوجود یورپ نے الہٰیات میں کچھ بھی کر کے
نہیں دکھایا۔ وہاں جسمانی علوم میں سے ہر ایک علم اور علم کی ہر ایک شاخ اور
شاخ در شاخ کے لئے مختلف سکول آف تھاٹ موجود ہیں اور تلاش و تحقیق میں
ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہوئے کہیں سے کہیں نکلے جاتے ہیں۔ مگر
میٹافزکس[1] کی طرف خیال کو لانا اسقدر ناگوار ہے کہ اسکے متعلق کم از کم میرے کانوں تک
صرف کانٹ کی تھیوری کا نام پہنچا ہے یا سپنسر کے بعض خیالات دیکھے گئے ہیں
مگر اس کو بھی الہٰیات کی اصلاح اور ترقی کہنا ایک طرف یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان دونو
کا فلسفہ اس علم کو کچھ روشنی میں لایا ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ خدا ثابت تو نہیں ہوتا لیکن
ہم سب کام اس طرح کرتے ہیں گویا خدا رکھتے ہیں اور سپنسر کہتا ہے کہ دلِ خدا کا متقاضی
تو ضرور ہے مگر ایسی باتیں علم کا موضوع نہیں ہو سکتیں۔ غرض ان دونوں کے فلسفہ کو
اگر الہٰیات کہا جائے تو اسے ثابت کرنے کی بجائے یہ فلسفہ اس علم کو نابود کرنے کے لئے
وضع ہوا ہے۔ اس لئے روحانیت کا شائق اس سے کوئی لطف نہیں اٹھا سکتا
اور اسکے بخلاف ہندوستان کا ویدانت اور اسکے مختلف سکول الہٰیات کا

[1] لفظی معنے خیال یا ذات کے ماورا۔ جسمانیات سے ماورا الہٰی کی حقیقتیں۔ حکمت اور عمل کے طریقے۔

[illegible] رکھتے ہیں۔ اس مضمون پر عمدگی سے تو وہی بحث کر سکتے ہیں جو سنسکرت
کے ماہر ہوں۔ میں سوامی شنکر اچاریہ۔ سوامی رامانوج اور ایک اَدویتی مذہب کے
جو غالباً سوامی مادھو ہیں۔ اور مہاتما بُدھ کے کچھ کچھ خیالات سے [illegible]
واقفیت رکھتا ہوں۔ ان میں کون حقیقت تک پہنچ سکا ہے اور کون نہیں پہنچا
بلکہ [illegible] کس نے میرے دل پر قبضہ کیا ہے؟ یہ دوسرا سوال ہے سر دست اس قدر کہنا
چاہتا ہوں کہ جس قدر عالمانہ موشگافیاں اور صوفیانہ بلند پروازیاں قابل دل و دماغ
کیا کرتے ہیں۔ وہ اس فن میں ان لوگوں کو حاصل ہیں۔

الٰہیات اور عبادت۔ اور میں تو ان کی ویدانتی تحقیقات کو ایسا
بلند پاتا ہوں کہ معاف کیجئیگا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مذہبی خیالات اس قدر اعلیٰ
اور مذہبی عبادت کا طریقہ اس سے اس قدر متفاوت! اور میں موجودہ واقفیت
کی بنا پر اس سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ بھارت ورش نے ایسے اعلیٰ دل و
دماغ پیدا تو کئے مگر شاید اُن کی تعداد ہر زمانہ میں محدود رہی ہے اور عوام الناس
تک ان کا اثر نہیں پہنچ سکا۔ بلکہ وہ خود عملی طور پر عوام الناس کے زیر اثر رہے
اور اسلئے مذہب کے عملی حصے یعنی عبادت میں اصلاح نہ کر سکے مگر یہ میرا ایسا
قیاس ہے اور سنسکرت کی اشاعت سے جہاں الٰہیات کے شوق کو پورا
کرنے کا بہت بڑا سامان میسر آئیگا۔ وہاں سنسکرت ہی کی اشاعت
سے یہ عقدہ بھی حل ہو سکیگا۔ اور عقائد اور عبادت میں جو تفاوت نظر آتا ہے
اور جو لا تعلق ہونا چاہئے اسکا نشان بھی انہی کڑیوں کو تلاش کرنے سے
مل سکیگا۔

باقی دارد

[illegible] کے مدیر سے

قطعہ وفاتِ حضور ملکِ معظم ایڈورڈ ہفتم

(از مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی)

رحلتِ ایڈورڈ ہفتم پیش آئی یک بیک — جس کا وہم و گماں نہ تھا ہرگز کسی کو بھی خیال
ہم نہ بھولے تھے ابھی وکٹوریہ عظمیٰ کا غم — کچھ مگر گذرے تھے ابھی اس حادثہ پر چند سال
چند سالہ سلطنت میں شاہ والا جاہ نے — کر دیا سب پر عیاں اپنی لیاقت کا کمال
ملک افریقہ میں قوم بوئر کو بخشا عروج — اور خود مختاری دی چھوڑ دی ملک بحال
کس قدر ہمعصر شاہوں کو بڑھائی آشتی — کس قدر ہمسایہ ملکوں سے رہا اعتدال
بن گئے یارانِ مخلص پیرس و پیٹرس برگ — دھل گئی انگلش کی جانب سے جو تھی گرد ملال
جرمن و اسپین و روم و یونان و ترک — صلح جو ایڈورڈ نے سب کی بدل دی حال چال
جیسی سیکرٹ اعظم میں ہوا اس کا لقب — بڑھ گیا برطانیہ کا اور بھی عز و جلال
اب دعا ہے جارج پنجم جانشینِ سلطنت — مدتوں پھولے پھلے دنیا میں بارور نہال
سب کے دل پر نقش ہیں اس خاندان کی نیکیاں — ان کے حق میں ہے رعایا کا دعا گو بال بال
دودمانِ شاہ کو اللہ دے صبر و سکوں — دولتِ اقبال روز افزوں ہو تا ملک و مال

تاریخِ وفاتِ حضور ملکِ معظم

دریغا آں شہ اڈورڈ ہفتم — کہ بودش در ہمہ عالم تقدم
یکا یک زیں جہاں رختِ سفر بست — ہر کس را شدہ درد و تالم
من ایں خبر موحش چوں شنیدم — شدہ از درد و شیون ہوشِ من گم

شنیدم با خاطر محزون و غمگین	پئے سال مسیحی در تعلیم
صدائے ناگہاں زد ہاتف از غیب	[illegible]

زبان

(از سید محمد حسین صاحب سب ڈپٹی مجسٹریٹ)

اے زباں عضو ہو کیا کوئی برابر تیرے	جرم اصغر ہے مگر جرم ہیں اکبر تیرے
کاٹ ہوتا ہے ترا تیغ و تبر سے بڑھ کر	سینۂ دل رحم ہوا کرتے ہیں نشتر تیرے
گرم فقروں سے ترے جوش کی بو آتی ہے	اور چلتے ہوئے الفاظ ہیں خنجر تیرے
تیغ کے وار تو ہوتے ہیں بدن پر اکثر	وار ہوتے ہیں دل و جان و جگر پر تیرے
پھانس طعنوں کی کبھی دل سے نکلتی ہی نہیں	ٹوٹ کر قلب میں رہ جاتے ہیں نشتر تیرے
باتوں باتوں میں اُڑا لایا ہے ہم بھیدوں ان کو	دیدۂ شوق پہ احساں ہیں سراسر تیرے
تو نے تیزی سے بگاڑا ہے بنے کاموں کو	کام سے ہم پاتے ہیں مگر اکثر تیرے
تو نے نرمی سے کیا موم دلوں کو پتھر	صاف ہوتے نہیں دیکھے ہیں مکدر تیرے
کہتے ہیں اہل سخن ہے حرکت میں برکت	خیر مضمر ہے سکوں میں مگر اکثر تیرے
تو اگر چپ ہے تو ہر عیب نہاں ہے گویا	تو جو کھلتی ہے تو کھل جاتے ہیں جوہر تیرے
خوبیوں کا تو نہیں ہے کسی کو انکار	خوبیوں سے ہیں مگر عیب فزوں تر تیرے
وقت پر مطلب دل کر نہ سکی کچھ بھی ادا	حسرت دل کا مری خون ہے سر پر تیرے
لطف تقریر نہیں بلکہ ملال اور بھی ہے	سحر آمیز یہ فقرات مکرر تیرے
تشنہ کامان محبت کو نہ کچھ لطف ملا	اُن کو خالی ہی ملے شیشہ و ساغر تیرے
مجھ کو عزت [illegible] طول سخن سے ورنہ	جو کہنے تھے ابھی [illegible] تیرے

ملے دہاں کی چھپاتی ہے جنہیں تو سب　　کل ابھی جب سر پہ ٹھیگے سرو قد تیرے

آبشار

سچ بتا اے کوہ و صحرا کے مسافر آبشار
ٹھوکریں کھاتا ہوا کس جا چلا ہے بیقرار

کیوں سراسیمہ ہے کیوں پر لڑکھڑاتی چال ہے
سیلِ اشکِ چشمِ تر کی طرح کیوں پامال ہے

کس کے غم میں ہائے تو گھل گھل کے پانی ہو گیا
حالِ دل آئینۂ رازِ نہانی ہو گیا

زندگی کیوں تیری وقفِ دیدۂ گریاں ہوئی
تیری ہستی نازشِ صد بحرِ پایاں ہوئی

کس قیامت کا ہے تیری زار نالی میں اثر
چاک سینہ ہے زمیں پانی ہے پتھر کا جگر

کیوں کسی پہلو سکونِ دل کو تیرے ہوتا نہیں
ہاتھ اس پر وقت کے رونے سے کیوں ملتا نہیں

تیرے دامن میں ہے دلکش سبزہ و گل کی بہار
میٹھی میٹھی بولیاں ہیں بلبلانِ کوہسار

دشت میں جاری ہیں ہر سو نہریں تیرے فیض کی
ذات تیری بہرِ صحرا وجہِ شادابی ہوئی

چشمۂ حیواں ہے تو تشنہ دہانوں کے لئے
اور ہے رشکِ مسیح افسردہ جانوں کے لئے

اپنا جلوہ دیکھتے ہیں تجھ میں ماہ و آفتاب
آنکھیں پرنور ہیں روشن ہے وہ تیری آب و تاب

لعبتانِ نور کی آنکھیں بچھی ہیں خاک پر
دھوم ہے اک نظربازی کی لبِ افلاک تک

سیل جو تیری ہے وہ چینِ جبینِ چرخ ہے
تجھ کو سب حاصل ہے پھر تو کس لئے رنجور ہے

ہائے کیوں پتھر سے ٹکراتا ہے سر کو بار بار
خاک پر تو لوٹ کر کیوں ہو رہا ہے بیقرار

رات دن تجھ کو تلاشِ بحرِ الفت تو نہیں
تو بھی میری طرح قیدِ بندِ آفت تو نہیں

تو کہاں یہ جستجوئے بحرِ بے پایاں کہاں
دشت پیمائی بقدرِ جوششِ طوفاں کہاں

آرزو مندی وصلِ بحرِ ناپیداکنار
ایں خیال است و محال است و جنوں اے آبشار

پانے کو ساماں میں کچھ اے دوست ہمت چاہئے
سر میں سودا چاہئے دل میں محبت چاہئے

پھرتا ہوں مثلِ نیم بیابان و سرگرداں میں — رات دن تقدیر میں چکر میں غم و غلطاں ہیں

ہوگیا شیدا گمانِ عشق میں تیرا شمار — گوہرِ مقصود کا ملنا رہا اب دیکھنا

سیج لے نے گل کوئی پار اترنے کے لئے — مجھ کو بحر پانی ہے کافی ڈوب مرنے کے لئے

محمد سیف الدین شباب

بلبل اور پپیہا

بلبل

گلستاں میں ہجوم آرائی ہے جب فصلِ بہار — اور ہوتا ہے جوانانِ چمن پر جب نکھار

عین اسی عالم میں صیاد آہ مجھ کو تھام کر — سارے ارمانوں کا خوں کر ڈالتا ہے ایک بار

لوٹتا ہے سانپ دل پر جب یہ آتا ہے خیال — میں اسیرِ دام ہوں اور جوش پر فصلِ بہار!

کیا کہوں اس بیکسی میں جب چمن آتا ہے یاد — ٹکڑے ہوتا ہے کلیجہ اور طبیعت بیقرار

خندۂ گل باغ میں۔ اور میں قفس میں گو حزیں — میں ہوں تصویرِ غم۔ اور فصل ایسی خوشگوار!

پھول گل ہی جب نہیں میرے لئے فصلِ گل کیا کروں — ہے عبث گر لاکھ بار آئے زمانہ میں بہار

اے پپیہے رشک کے قابل ہے آزادی تیری — ہاں۔ مرے حق میں البتہ ترے لیل و نہار

تجھ کو کیا معلوم اسیری کی مصیبت ہم نفس — جانتا ہے جس نے جھیلا ہے کبھی رنجِ قفس

پپیہا

ہاں بجا ہے دوست۔ تو کہتا ہے سچ یکساں — حق بجانب ہے تری فریاد اور آہ و فغاں

پر مری یہ عرض ہے انصاف کر اے عندلیب — درد و ہجر و حسرتیں میری کہاں تیری کہاں

لوٹ لیتی ہے کوئی دن تو بہارِ فصلِ گل — اپنے معشوقوں میں تو رہتی ہے کچھ دن مہرباں

[illegible] — کس نے میرا دل لیا ہے؟ ہے کہاں اس کا مکاں

[illegible] — ہے کس منزل میں بستا ہے مرا آرامِ جاں

کچھ نہیں معلوم دلبر کون ہے کیسا ہے - پر | کہہ رہی ہے ہر اک غلشن ہال لگیا کچھ نئی - ہن
ہو بیاں کس نام کی خاطر یہ ہے یہ غسل گر | پھول شبنم سے ہوں گا تا نظر آئی کہاں
تو نے جب سے ہی لے ہو نگے گلوں کی ہمشیں | ایک میں ہوں صورت طالب بھی کچھ بھی نہیں!

محمد مسلم عظیم آبادی

حُسن

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

تیری تصویر جبرا جنوں کی | تیری تعریف بڑا جسنوں کی
مذہب ترا طرز خود پرستی | مشرب ترا لبے شراب مستی
مرکب ترا عالم جوانی | مطلب ترا شرحِ لن ترانی
بچپن جس میں کشش کی تاثیر | ہر ذرہ ترے بھولے پن کی تصویر
خود بینی ہے تیری ذات کا وصف | شیرینی ہے تیری بات کا وصف
سیرت تری نیکی اور پاکی | صورت تری ضد ہے بدنما کی
رنگت کی بہار سادہ تیرا | سر کی حرکت کنایہ تیرا
دیوانہ بنائے سر پر چڑھ کر | دل میں بیٹھے نظر پہ چڑھ کر
خوبی تیری سپین کی تفسیر | تیزی تیرے چلن کی تصویر
ٹیڑھا ابرو کماں ہے تیری | تیکھی چتوں سناں ہے تیری
عشوہ تری آن بان کا کام | غمزہ ترے خانہ زاد کا نام
جوہر ترا - تیری خوشنمائی | زیور ترا - تیری ہی صفائی
خود تیری ہی خو - ترا کرشمہ | خود تیری ہی آب - تیرا چشمہ
آرائشیں فطرتی ترے ساتھ | زیبائشیں قدرتی ترے ساتھ

بکھرا ہوا سر پہ بال بن کر
ابھرا ہوا پیچ پہ گال ہو کر

پھیلا ہوا عالم صفا میں
چھپا ہوا گوشۂ حیا میں

لپکا ہوا دل پہ بن کے صیاد
سنتا ہوا عاشقوں کی فریاد

جینا تری چاہ میں مزے کا
مرنا تری راہ میں مزے کا

ہونٹوں پہ صدا کراہنے کی
تعزیر ہے تجھ کو چاہنے کی

ہونٹوں پہ جو تیرا ذکر آئے
تہخانوں کے خیمے نصب پائے

آتے ہی بہار جوش خوں کیوں
ہنگامہ طرازئ جنوں کیوں

رخ زرد تو ہے مگر سبب کیا
دل سرد تو ہے مگر سبب کیا

سر نے سودا کہاں سے پایا
دیدوں میں لہو کہاں سے آیا

الجھے ہیں جو بال کس لئے ہیں
نیلے ہیں جو گال کس لئے ہیں

پیراہن چاک چاک کیسا
سر پہ انبار خاک کیسا

شہ دیتا ہے آہ سرد کو کون
پرچک دیتا ہے درد کو کون

ہر وقت سنک الٰہی توبہ
سائے سے جھجھک الٰہی توبہ

جوشش آپ ہی آپ ہے لہو میں
ہونٹ آپ ہی آپ گفتگو میں

دل آپ ہی آپ اچھل رہا ہے
خوں آپ ہی آپ جل رہا ہے

حملہ کیا تقویٰ پہ کس نے
قبضہ کیا پارسا پہ کس نے

ہے کون آخر جنوں کے ساتھ
پھرتا ہے رگوں میں خون کے ساتھ

کھنچتا ہے دل اس طرف تو کیا ہے
آخر اسے کون کھینچتا ہے

پلکیں کس نے یہ کیں ادھر بند
آنکھوں میں جو دل ہوا نظر بند

غمزے ہیں یہ حسن ہی کے سارے
ملتا نہیں چین جس کے مارے

نازک نازک تھے ہاتھ جن کے
ان سے چنوائے اینٹ پھکے

پہلے عشرت کو دی اُداسی — پھر اُس پہ بڑھائی بے حواسی
نقل کیا نیند بھر کے سونا — کانٹوں کا بچھا دیا بچھونا
دِل کو کیا سرد۔ گرم پا کر — رُخ کو کیا زرد۔ رنگ اُڑا کر
کالا کیا خون کو رگوں میں — پھیلایا جنون کو رگوں میں
کی گرمیٔ آہ سے زبان خشک — ہونٹھوں پہ جمائیں پپڑیاں خشک
کی داغ جستوں کی مُہر سر پر — سِکہ بٹھلا دیا جگر پر
دِل چھین لئے دکھا کے جلوے — بھر بھر دیئے آبلوں سے تلوے
ہر شکل سے دِل کی شامت آئی — قد کیا دیکھا قیامت آئی
جھٹکا دیا جنبشِ کمر نے — لٹکا لیا کاکلوں میں سر نے
مارا اسے تیوریوں نے چڑھ کر — لوٹا اُسے گیسوؤں نے بڑھ کر
اُنگلی کبھی گال پر ادا سے — گویا ہُوئی لال وُہ حنا سے
دانتوں سے دیا ہُوا لب تر — قطرے شبنم کے برگِ گل پر
اللہ رے حُسن تیرے نیرنگ — لاتی ہی نیا ہر ایک شے رنگ
گلشن کی ہوا پیام تیرا — پھولوں میں بہار نام تیرا

باقی آیندہ

ہم مارچ کے پرچہ میں مخزن قسم سوم کے بند ہونے کا اعلان کر چکے ہیں۔ موجودہ سلسلہ کا ایک پرچہ کی قیمت درجہ سوم سے قریبًا ۱۰ زیادہ ہی۔ اسلئے جن صاحبوں کے چندہ کی میعاد ابھی باقی ہی۔ وُہ فروری سے تا اختتامِ چندہ فی ماہ ۱۰ کے حساب سے شمار کر کے نائد رقم دفتر ہذا میں بھجوا دیں۔ تاکہ درجہ دوم کے خریداروں کے زمرہ
[illegible]

تازہ غزلیں

(از جناب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر ایٹ لا - لکھنؤ)

ہماری چشم تیری دید کے قابل کہاں
لائق پہلو ترے ہو وہ ہمارا دل کہاں

جستجو تیری کریں یہ پاؤں میں طاقت نہیں
ہو تمنا بس تری ایسا ہمارا دل کہاں

قدسیوں میں تھا یہی چرچا شب معراج کیا
ہو رہی ہے عاشق و معشوق کی محفل کہاں

دل یہ ہے ہو حشر کے دن لطف صحبت خاک در
ہم کہاں اور تم کہاں اور یہ بھری محفل کہاں

چل گیا جادو مرا دیکھا نظر بھر کر اسے
ورنہ یہ دل تھا تری ان آنکھوں کے قابل کہاں

تو وہ نگاہ شوق جو ساتوں فلک کے پار ہو
اسکو روکیں دل کے داغوں یہ محمل کہاں

گرد آلودہ جہاں میں ہے محیط فیض بھی
پاک دریا کا ہوا ہے دامن ساحل کہاں

جب خدا ہو ناخدا اپنا تو بیڑا پار ہے
ورنہ ہم بیکس کہاں اور صورت ساحل کہاں

ہم ترے در پر جو بیٹھے تو غنی ہو کر اٹھے
مفلسی اب ہے کہاں وہ صورت سائل کہاں

ہوشیار و نکو سبق میری ہی غفلت سے ملے
ناصحا یہ ہے اگر غفلت تو میں غافل کہاں

کوہ بھی ہو تو ٹلے اپنی جگہ سے شل کاہ
ہمت مردانہ کے آگے کوئی مشکل کہاں

جب لڑیں آنکھیں تو یہ دونو تمہارے ہو گئے
یہ تمہاری ہیں مری آنکھیں کہاں اور دل کہاں

ہم نے تو دیکھی لڑائی سے بھی نفرت کمال
جب لڑیں آنکھیں تو قابو میں رہے یہ دل کہاں

جستجو تیری ہی میں سلسلہ جاری رہا
لے چلے منزل پہ پہنچے ڈھونڈتی منزل کہاں

[illegible] ہیں کچھ حسن کی توفیق ہے
ڈھونڈتی ہیں جسکو آنکھیں وہ [illegible] کہاں

سادگی میں ہے وہ عالم زینتیں سب ہیچ ہیں
[illegible] حامد یہ [illegible] قابل کہاں

ترقی اُردو

کی

جو کوشش رسالہ ادیب الہ آباد کے ذریعہ سے شروع کی گئی ہے وہ ہر علم دوست کی اعانت اور سرپرستی کی مستحق ہے۔ اس میں علاوہ ان ادبی مضامین کے جو مسلّمہ قابلیت کے اہل قلم سے لئے جاتے ہیں اور ہندو مسلمان مرد و عورت ہر فرقے ہر طبقہ کے لئے یکساں خوشگوار ہوتے ہیں۔ ہر مرتبہ ایک اعلیٰ درجہ کی رنگین اور سات عکسی تصاویر بھی دیجاتی ہیں۔ جن میں مشاہیر حضرات کے فوٹو تاریخی عمارات کے نقشے اور آثار قدیمہ کے مرقعے ہوتے ہیں سائز ماڈرن ریویو وغیرہ انگریزی رسالوں کے مطابق ہے اور کاغذ وغیرہ بھی بیسے ویساہی عمدہ اور چکنا لگایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ادیب عمدہ سے عمدہ انگریزی رسالوں سے ہمسری کرسکتا ہے۔ مضامین نظم و نثر کا اتنا سرمایہ ہر مرتبہ ہوتا ہے جو کئی روز تک پڑھنے کے لئے کافی ہے بایں ہمہ قیمت سالانہ صرف

چار روپیہ۔ فی پرچہ ۶؍

نمونہ مفت نہیں دیا جائے گا۔ ملک کے تمام نامور اخبارات اور اہل الرائے نے بالاتفاق اس کوشش کی داد دی ہے۔

المشتہر

[illegible]

اِقبال دُلہن

مصنفہ جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب ابن شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب دہلوی

کتاب کیا ہے سچے حالات اور روزمرہ کے واقعات کی ہوبہو تصویر ہے مولوی نذیر احمد صاحب کی تصانیف نے جو نام اور قدر حاصل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ کتاب بھی انکی نظر سے گذر چکی ہے۔ اور اب مخزن پریس سے شائع ہوئی ہے جب شمس العلما مولینا نذیر احمد صاحب۔ شمس العلما خان بہادر منشی محمد ذکاء اللہ صاحب۔ مولوی وحید الدین صاحب سلیم اڈیٹر علیگڈہ انسٹیٹیوٹ گزٹ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ۔ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی صاحب کی تقاریظ سے اس کتاب کی قدر و قیمت بڑھا چکے ہیں تو پھر سمجھ لیجئے کیسی کتاب ہوگی۔ درخواستیں منیجر مخزن پریس لاہور کے نام آنی چاہئیں

قیمت اعلیٰ قسم کے کاغذ پر عا۔ دوم قسم کے کاغذ پر عہ (علاوہ محصولڈاک)

طب یونانی کی بقا کیلئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب رئیس اعظم دہلی

نے

جو خدمات نمایاں انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطراف ہند میں اس کام کیلئے سب کی نظریں ان ہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کچھ امیدیں ہیں تو وہ ان ہی کی ذات سے ہیں اور ان ہی کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ جناب حاذق الملک حساس [illegible] کے ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی اس مہتم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔

ہندوستانی دواخانہ انکے احساس فرض کا ثبوت اور انکی مستقل اور پرجوش کوششوں کا ثمرہ ہے۔ گو اسکی ظاہری حیثیت ایک تجارتی کاروبار کی حیثیت ہے لیکن حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں طب یونانی کی بقا کا سامان ہے۔ مخصوص اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے جس غرض سے یہ قائم ہوا ہے اسکے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا۔ اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکے طرز شناخت میں تہذیب و ترقی دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے عام طور پر اطباء برتتے ہیں بلکہ جنکے وہ اصلی نسخے جو صرف رؤسا و امراء کو میسر آتے تھے اصل اصل اس دواخانہ میں تیار رہتے ہیں اور واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ زنانہ شفاخانہ کو دی جاتی ہے

نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص مجربات بھی اس دواخانہ کو عطا فرمائی ہیں [illegible] ایک جوہر ہوا اور ہر ایک انسانی جسم [illegible] اہل وطن کو ان [illegible] اور ویدک ادویات [illegible] دواخانہ [illegible] تمام [illegible] اور انکے ساتھ [illegible] مدد کا [illegible] ہو سکتا ہے۔ خوبی انتظام اور عمدگی کار کے سبب تھوڑے عرصہ میں اس دواخانہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔

مخزن
نظم اقبال
شاہی گورستان
تازہ غزلیں
دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

مخزن

نظمِ اقبال

ایک عرصہ سے ہمارے دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے بیرسٹر ایٹ لا کی نظم کے مشتاق منتظر تھے کہ جس طرح ممکن ہو انکی کمی فرصت کے باوجود اُن سے کچھ لکھوایا جائے۔ یہ خیر کا ایک وقت ہوتا ہے۔ گذشتہ ایام میں وہ دکن تشریف لیجائے اور وہاں کے ارباب فضل و کمال کی صحبتوں نے انکی طبیعت کو ایسا گدگدایا کہ یہ دو نظمیں جو آج شائع کیجاتی ہیں اس سفر کی یادگار ہیں اُن میں سے ایک جو پہلے درج کیجاتی ہے ایک قصیدہ ہے جس کے ممدوح خود شاہ دکن کے وزیر شاہ ہیں۔ یہی خصوصیت اس قصیدہ کو عالی مرتبت بنانے کے لئے کافی تھی۔ مگر مزید لطف یہ ہے کہ قصیدہ کی تشبیب میں حقِ شاعری ادا کیا گیا ہے۔ دکن کے علم دوست اور ہنر پرور وزیر اعظم کی اس خوبی کی جس قدر تعریف کیجائے کم ہے کہ اہل علم کی قدردانی اُنکا شیوہ ہے۔ اور مشاغل علمی سے انہیں شغف ہے۔ اُنہوں نے جو الطاف نامہ شیخ محمد اقبال صاحب کو لکھا۔ اس سے نہ صرف شیخ صاحب موصوف کی قدر افزائی مقصود تھی بلکہ اُن کی شاعری کے لئے ایک زبردست تحریک۔ اس کے لئے ہم بھی خاص طور پر مخزن کے ناظرین کی طرف سے ہز ایکسلنسی مہاراجہ صاحب بہادر کا شکریہ ادا کرتے ہیں

دوسری نظم جو گورستان شاہی کے عنوان سے شائع کیجاتی ہے۔ سچی الہامی نظم ہے جو فی الحقیقت اقبال کے دیرینہ سکوت کی تلافی کرتی ہے۔ اسکا ایک ایک مصرعہ ایسا درد بھرا

اور معنی خیز ہے کہ دل سے داد نکلتی ہے۔ اس نظم کے میسر آنے کے لئے ہم اپنے قدیم عنایت فرما مسٹر حیدری کے ممنون ہیں جنکے صحیح مذاقِ علمی نے شیخ محمد اقبال صاحب کو حیدرآباد میں چیزیں دکھائیں۔ جو ایک خلقی شاعر کے دل پر قدرتی طور سے اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں سلاطین قطب شاہیہ کے مزار۔ انکے قرب گولکنڈہ کا تاریخی حصار۔ شب ماہ۔ مگر ایسی شب ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور ظلمت میں لڑائی ٹھن رہی تھی۔ سچے شاعرانہ جذبات کے نشو و نما کے لئے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان کیا ہوگا۔ ان جذبات کا عکس جس خوبی اور صفائی سے جناب اقبال نے اتارا ہے انہی کا حصہ ہے۔

ان دو نظموں کو انکی اہمیت کی وجہ سے ہم سب مضامین سے اول جگہ دیتے ہیں خصوصاً اس لئے کہ اگر ہم انہیں حصہ نظم میں رکھنا چاہتے تو شائقین کو اگلے مہینے کے رسالے کے شائع ہونے تک اور انتظار کرنا پڑتا +

(ایڈیٹر)

شکریہ

گذشتہ ماہ میں مجھے حیدرآباد دکن جانیکا اتفاق ہوا۔ اور وہاں کئی ساعت دربار میں حاضر ہونے اور عالیجناب ہز ایکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ یمین السلطنت پیشکار و وزیر اعظم دولت آصفیہ متخلص بہ شاد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونیکا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسلنسی کی مہمان نوازی کریمانہ اور وسعتِ اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا وہ میرے لوح دل سے کبھی نہیں مٹیگا۔ مزید الطاف۔ کہ جناب ممدوح نے میری مراجعت حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت لطف آمیز خط لکھا۔ اور اپنے کلام شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت نہایت کے شکریہ میں دل سے زبان پر بے ساختہ آگئے۔ انہیں اس قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں۔

(اقبال)

جھانکتی ہے زیرِ دامانِ اُفق سے آشکار | صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر | کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر | محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار
شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے | بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے | سب سے پیچھے جاتے کوئی عابدِ شب زندہ دار
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی | کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار
مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح | جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار
ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح | شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہمکنار
جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج | ہے ترنّم ریز قانونِ سحر کا تار تار
گرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا | آنکھ وہ بخشی کرے نظّارہ آشامِ بہار
کھینچ کر سوئے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر | عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کوئے یار
گل نے بلبل سے کہا اے ہم صفیر آیا ترا | کہتی تھی بلبل کہ اے مقصودِ تبسم انتظار
اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے | کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھ کو شکار
کس سے کہتے راز اپنا لالہ ہائے شعلہ پوش | کس پہ کرتے رازِ دل اپنا عنادل آشکار
پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگسِ شبنم فریب | ہو گیا غائب کہاں اپنے چمن کا راز دار
پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے | دیدۂ قمری یہاں تھا صحنِ گلستاں خار زار
غنچۂ نوخیز کو یہ کہہ کے بہلاتی تھی میں | ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصلِ بہار
کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا | لے گیا تجھ کو کہاں تیرا دلِ بے اختیار

کس تجلی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل
تیری مشتِ خاک نے کس دیس میں پایا قرار

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کا | جس کے پھولوں میں ہوا اے ہم نوا میرا گزر

جس کے قدسے مہر عالمتاب کو سامان فخر
جسکی ضو افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار

جسکے بلبل عندلیب عشق گل کے ہمصفیر
جسکے غنچوں کے لئے رخسار حور آئینہ دار

خطۂ جنت فضا جسکی ہوا دامن گیر دل
عظمت دیرینہ ہندوستان کی یادگار

جس نے اسم اعظم محبوب کی تاثیر سے
وسعت عالم میں پایا صورت گردوں وقار

قد کے ذروں کو قسمت نے سکھائی زمیں
آسماں جھکے دکن کی خاک اگر پائے قرار

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گزر
بڑھ گیا جس سے مرا ملک سخن میں اعتبار

اسقدر حق نے بنایا اسکو عالی مرتبت
آسماں اس آستانے کی ہے اک موج غبار

کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے ہیں نثار

مسند آرائے وزارت راجۂ گردوں حشم
روش اسکی رہے روشن سے نگاہ روزگار

اسکی تقریروں سے رنگیں گلشن ناز عربی
اسکی تحریروں پہ نظم مملکت کا انحصار

لیلی معنی کا محمل اس کی طبع رسا
نظم اس کی شاہد راز ازل کی پردہ دار

اس کے فیض عام کی سب جا ہے اعجاز خبر
ہے گہر آفرین دست کرم سے شرمسار

سلسلہ اسکی مروت کا یونہی لا انتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحر ناپیدا کنار

دلربا اسکا تکلم خلق اس کا عطر گل
غنچۂ دل کے لئے ہے موج نفس باد بہار

ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبر کو کہاں
جسکی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے بیاں شان امارت پر وہ ایسان فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیر قبائے زرنگار

خاکساری جوہر آئینۂ عظمت بھی
دست وقف کار فرمائی و دل مصروف یار

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مرور روزگار

شکر احساں کا اے اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

گورستانِ شاہی

حیدرآباد دکن میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما حضرت مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی اے معتمد محکمۂ مال سرکار عالی جن کی قابلیت و وسیع نظر سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے۔ مجھے ایک رات اس شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی جذبات و تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اسکو میں اسی سفر حیدرآباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی لائق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جنہوں نے میری مہمان داری اور میرے قیامِ حیدرآباد کو پرلطف بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ (اقبال)

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
یعنی دُھندلا سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں

کس قدر اشجار کی حسرت فزا ہے خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

فطرتِ نظارۂ امکان سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

آہ! جولانگاہِ عالمگیر یعنی وُہ حصار
دوش پر اپنے اُٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار

زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کی ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

ابر کے روزن سے وُہ بالائے بامِ آسماں
ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں

خاکبازی وسعتِ دُنیا کا ہے منظر اسے
داستاں ناکامیِ انساں کی ہے ازبر اسے

ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا
آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا

گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے   فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لئے

گرچہ باغِ زندگی سے گل جدا من ہے زمیں

سینکڑوں گم گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

خاکِ شاہوں کی ہے یہ منزل حسرت فزا   دیدۂ عبرت با خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے   آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر   جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر

کہہ رہی ہے کوئی ایامِ کہن کی داستاں   چاندنی کرتی ہے میناروں سے کیا سرگوشیاں!

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں

جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش - آبادی کے ہنگاموں سے دور   مضطرب رکھتی تھی جنکو آرزوئے ناصبور

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک   جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل   جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال

رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری   ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور

جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورشِ بزمِ طرب کیا عود کی تقریر کیا   قیدیٔ زندانِ غم کا نالۂ شبگیر کیا

عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا   خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں

سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

روح مشتِ خاک میں زحمت کشِ بیداد ہے   کوچہ گردِ نے ہوا جس دم نفس فریاد ہے

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ نو کش نوا   شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

آہ! کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے   زندگی کی شاخ سے پھوٹے۔ کھلے مرجھا گئے

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے

اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار   اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار

اے ہوس خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار   یہ شرارے کا تبسم یہ خسِ آتش سوار

یہ قمر جو ناظمِ عالم کا اک اعجاز ہے   پہنے سونے کی قبا محوِ خرامِ ناز ہے

چرخِ بے انجم کی دہشت ناک وسعت میں مگر   بیکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقتِ سحر

اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے جو مہتاب تھا

آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار   رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے انکی بہار

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار   رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں   دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار   ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو

مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگزر   چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور!

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں   دفترِ ہستی میں اُنکی داستاں تک بھی نہیں

آدبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے   عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا

آسماں سے ابرِ آذاری اُٹھا۔ برسا۔ گیا

صبح کے تارے پہ تھی مشرق کے رہزن کی نظر   وُہ اُڑا کر لے گیا آویزۂ گوشِ سحر!

شب کے اختر پیۂ خورشید سے [illegible] — جیسے شبنم کا دل کر سیرِ گل کرتے ہیں یہ

ہے رگِ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی — کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی

سینۂ دریا شعاعوں کے لئے گہوارہ ہے — کس قدر پیارا لبِ جو مہر کا نظارہ ہے

رات یہ تاروں بھری ذوقِ نظر کی عید ہے — ریزہ ریزہ ٹوٹ کر پیمانۂ خورشید ہے

اُگ گئے ہیں شاخِ چمن سے شعلۂ بے سوزِ گل — روح کا فردوس ہے حسنِ نظر افروزِ گل

محوِ زینت ہیں صنوبر جوئبار آئینہ ہے — غنچۂ گل کے لئے بادِ بہار آئینہ ہے

نغمہ زن رہتی ہے کوئل باغ کے کاشانے میں — چشمِ انساں سے نہاں پتوں کے عزلت خانے میں

اور بلبل مطربِ رنگیں نوائے گلستاں — جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے — خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں — وادیِ کہسار میں نعرے شبانوں کے ہیں

زندگی کی مے سے مینائے جہاں لبریز ہے — منظرِ حسرت بھی ہے کوئی تو حسن آمیز ہے

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح — دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں — اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

اشکباری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در — گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم — آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں — برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

وادیِ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ — خواب سے امیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

خندۂ ظلمت سے ہے اس کی چمک محبوب تر — چھو نہیں سکتی اسے صرصر کی موجِ پرخطر

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

ریحانہ

تمہید

خدا شاہد ہے، اگر ہماری نیت یہ ہو، کہ ریحانہ کو بے گناہ ثابت کریں، عیوب کی گٹھڑی، برائیوں کا محضر، الزاموں کی پوٹ، غرض تمام مکمل الوجوہ نقائص کا بار حمزہ کے سر رکھ دیں، ہماری رائے قطعاً و یقیناً، ارادتاً و دیانتاً جو تھی، وہ ہے، اور، جو ہے، وہ رہے گی

حمزہ رئیس و تعلقہ دار تھا تو اس کے کنبہ والوں کے بھاگ۔ اور ریحانہ مصیبت ماری تھی تو اس کی تقدیر۔ ایک توے کی روٹی کوئی چھوٹی کوئی موٹی۔ وہ امیر تھا تو ہوا اور بے نظیر بھی تو ہوا کرے، ہمیں یہ کہنے میں ڈر کس کا، اور خوف کس سے، کہیں، علی رؤس الاشہاد کہیں، ڈنکے کی چوٹ کہیں، مرجاتا وہ باپ اور پیوند زمین ہو جاتی وہ ماں اس سے پہلے کہ ریحانہ جیسی بیٹی پیدا ہو۔ کمبخت اس باپ کی بیٹی جس نے بڑے بڑے تہ زوروں کی مونڈ مال دم سے میں رگڑ دیں، اس دادا کی پوتی جس کے نام سے بستی تھرتھرائے۔ اس بھائی کی بہن جس کی تلوار سے خون ٹپکتا، اور، ایسی بے حیا اتنی بے غیرت یہاں تک بے خوف اس درجہ بے لحاظ کہ دنیا کیچڑ ڈالے اور وہ ٹھٹھے لگائے، حقیقی ماموں اور وہ ماموں جو فقیر ہوا فاقے کئے، بھیک مانگی، مگر بنی اسرائیلیوں کو بیٹی نہ دینی تھی اور نہ دی۔ اپنی آنکھ سے دیکھے کہ یہ حقیقی بھانجی کھلے خزانے عدالت پہنچی ہے اور خون کے سے گھونٹ پیکر چپکا ہو جائے۔

پاکدامن تھی یا بد اطوار اور بے گناہ تھی یا گنہگار، ہمیں اس سے بحث نہیں،

ہمارا قیاس یہ ہے کہ جیسی بھی تھی اور جو کچھ بھی تھی ننگ خاندان تھی، یا اسی کمبخت کا وجود تھا کہ عقیلی جیسے خاندان پر جو باعتبار شرافت اپنا جواب نہ رکھتا تھا ایسا دھبہ لگا گئی کہ آج نو سو برس بعد بھی دنیا اسکو فراموش نہیں کر سکتی۔

لیکن عمری بصیرے جو چار و ناطرف شیخی بگھارتے ہیں اور لمبے لمبے چوڑے چوڑے دعوے کرتے پھرتے ہیں آنکھ ملا کر بات کریں اور اس سوال کا جواب دیں۔

یہی ریحانہ جس نے قبا بیہ کی ناک جڑ سے کاٹ دی۔ دس پانچ پورے اٹھارہ سال ماں کی آنکھوں میں پلی۔ رات دن دھوپ چھاؤں اندھیرے اجالے اٹھی بیٹھی آئی گئی رہی سہی مگر ایک متنفس تو خدا کو حاضر ناظر جانکر کہدے کہ کبھی اس کی شکایت کان تک آئی ہو۔ یہ اس جاہل ماں ہی کی صحبت کا اثر تھا۔ کواریتہ اس شان سے گذرا کہ فرشتہ تک درود پڑھتے بیاہی گئی تو یہ بہتر پڑے کہ شیطانوں تک نے لاحول بھیجی۔ اب اس دعوے کی تائید میں کسے کلام ہے اور کیوں کلام ہے۔ عزت دار تھی پائے عزت گر گئی تو عورت بلیت میں آزادی طبیعت میں جوش ماں کا آسرا گیا ٹوٹ۔ باپ کی روک ٹوک کا ہوا خاتمہ۔ خاوند ملا تو ایسا صورت کا دلدادہ ناز برداری کو آمادہ۔ ہاں جی کا نوکر تعمیل کو تیار۔ سہیلیاں ملیں تو ایسی کہ جوتی کی نوک پر عزت اور بہنوں کی لاج پر لعنت۔ ساتھی وہ کچھ صحبت یہ کچھ شرم و حیا ہوئی غارت خوف خدا ہوا رخصت مادہ تھا موجود میاں ہونے کی دیر تھی ہوئی اور ہوتے ہی کھل کھیلی

یہ صحیح کہ حمزہ قطعی سادہ لوح تھا اور یہ درست کہ اس کا تعلق درجہ محبت سے متجاوز۔ فراست نہ تھی بصارت تو تھی دیکھ سکتا تھا اور دیکھتا تھا کہ یہ شیر عیش روز بد دکھائیگی۔ سمجھ سکتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس ابتدا میں خطرناک انتہا اور اس آغاز میں تکلیف دہ انجام پنہاں ہے لیکن ایسی آنکھوں پر پٹی باندھی

کوتاہ اندیشی تو درکنار اتنا تک نہ سوچا کہ یہ رستہ کدھر جا رہا ہے۔ دلداری کرتا کرتا ضرور کرتا۔ پر وہ توڑتا توڑتا شوق سے توڑتا۔ مگر موقعہ پکڑ اور وقت پہچان کر اسی لاپروائی کا نتیجہ اور کوتاہ اندیشی کا انجام تھا کہ جس حمزہ کو دن عید اور رات شبرات تھی۔ بڑھاپا سوہان روح اور زندگی وبال جان ہو گئی۔

افسوس ہی تو اتنا کہ ابتدا تا انتہا باوجود تلاش اور کوشش کے ایک واقعہ ایسا نہ ملا کہ ریحانہ ہمدردی کی مستحق ہوتی لیکن جہاں ہمارا خیال از سرتاپا بدنصیب کے خلاف ہی وہاں یہ کہہ دینا بھی ہمارا فرض ہی کہ ریحانہ کے ساتھ ہی ساتھ حمزہ پر بھی اتنا زبردست الزام ہو کہ کسی کے چھٹائے نہ چھٹیگا۔

قبرستان

یوں تو موسم اور مہینہ کیا کوئی ہفتہ ہی ایسا منحوس گذرتا ہوگا کہ سیرات کے بیلکڑ ایک آدھ تہوار دو ایک جلسے، کوئی چھوٹی موٹی شادی نہ رچاتے رہتے ہوں مگر نوشابہ کی تخت نشینی تو مدتوں کی آرزو اور برسوں کا ارمان تھا منہ مانگی مراد دلی خواہش نوشابہ جیسی ملکہ کی سلطنت اور سیرات کے زندہ دل لوگ جن کانوں میں شام ہوتے ہی الو اور گیدڑ بولنے لگتے تھے۔ منہ سے بول اٹھا۔ پورے ڈیڑھ مہینے تک دن عید اور رات شبرات رہی۔ فرات کے کنارے جشن نوروز ہوا بہار کا موسم صبح کا سہانا وقت دریا کی لہریں رعیت کی خوشی پرندوں کے نغمے عجیب پرلطف سماں تھا کہ تمام سیرات سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گیا جو جس سے ہو سکا حیثیت کے موافق اور شان کے لائق نذریں دیں پنجہاور کی انعام لئے چلے پائے۔

خیمہ شاہی سے میل ڈیڑھ میل مشرق کی طرف ایک پختہ قبرستان میں وہ

جانباز آرام کر رہے ہیں جن پر سرزمین مصرات ہمیشہ ناز کرے گی۔ وہ پہر کا سنسان
وقت ہوا کا جھکڑ اور قبرستان کے تناور درخت بے شاخ و نیا کے نوحے
گا رہے ہیں۔ دفعتہً ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی ہاتھ میں پھولوں کا دونا
سر پر میلی برقعہ احاطہ قبرستان میں داخل ہوئی۔ ایک حسرت زدہ نظر
چاروں طرف ڈالکر برقعہ اتار الگ رکھا اور ایک مٹی کے ڈھیر سے چمٹ کر
لپٹ گئی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور شرگیں آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں
بہ رہی تھیں۔ فرط محبت اور جوش خون سے بیچین ہو کر قبر سے لپٹ رہی
تھی اور ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھر کر آسمان کی طرف یاس و ناامیدی کی
نظریں اُٹھا رہی تھی۔ برابر ہی ایک سنگ سرخ کی قبر تھی اس کا کتبہ دیکھا پڑھنا
شروع کیا تو یہ لکھا تھا۔

اجتماع کا نتیجہ فراق یقینی ہے

صدمہ تازہ اور سامنے باپ کی قبر پہلو میں دل مضطرب جو جذبات
بمشکل ضبط کئے تھے پھر ابھرے اٹھی پاس گئی پڑھا اور رو دی۔ لڑکپن ضرور تھا
مگر نا آشنا کہ تقاضائے نظام عالم یہ سمجھ سکے۔ تعلقات پدری کا انقطاع پہلا
اتفاق بیشک تھا لیکن ایسا غیر متوقع کہ قبل از وقوع امکان کا وہم و گمان بھی نہ ہو۔
باپ کی یاد ہر چند دل کو بیقرار کرتی تھی مگر کچھ مذہب کی تعلیم کچھ مجبوری اور معذوری
صبر کرتی اور چپ ہو جاتی۔ مگر اس وقت کتبہ کا ہر مصرع دل مجروح پر نشتر تھا بھولی
بھولی صورت پر پسینہ کے قطرے اور آنسوؤں کے موتی رواں تھے پورا
کتبہ پڑھا تو یہ لکھا تھا۔

"اجتماع کا نتیجہ فراق یقینی ہے"

"مگر کسے خبر تھی کہ عائشہ مجھ سے جدا ہو گی"

"اے وہ پھولوں میں تلنے والی بیگم"

"جس کے قدموں کے نیچے میں آنکھیں بچھاتا تھا"

"آج اس ہزاروں من مٹی کے نیچے دبی پڑی ہے"

"اور میں تیری قبر پر آنسو بہا رہا ہوں"

ثریا جتنا تڑپا گیا اور روئی جہاں تک رو سکی مگر نابکے رو دھو چکی تو اُٹھی اور کنوئیں پر آئی۔ حقوق پدری لاکھ ادب سہی مگر حسرت نصیب بیچاری کے نازک ہاتھ اس قابل نہ تھے کہ خود پانی نکال کر باپ کی قبر کو ٹھنڈا کرتی۔ ڈالنے کو تو ڈول ڈال سا مگر ستر پچھتر فٹ گہرا کنواں بھاری ڈول۔ پانی بھرا ہوا دو ہاتھ بھی نہ چل سکے عجب منظر تھا۔ کنوئیں میں ڈول ہاتھ میں رسی حیران پریشان ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ کوئی رستہ چلتا آکر ڈول سنبھال لے۔ چادر ڈھلک کر کندھے پر آئی۔ پریشان بالوں سے ہوا نے چھیڑ چھاڑ شروع کی سامنے سے گھوڑے کی ہنہنانے کی آواز سنائی دی اور آناً فاناً ایک گھوڑے سوار سرپٹ جاتا ہوا دکھائی دیا۔ سڑک اور کنوئیں کے بیچ میں قبرستان کی چھوٹی سی دیوار حائل تھی۔ سوار کا سامنے سے گذرنا اس منظر کا نظر آنا اور ثریا کی آنکھوں کا دوچار ہونا تھا۔ ٹھٹھکا اور اندر آیا۔ سڑک سے کنوئیں تک آنا دو تین منٹ کا کام ہوگا مگر حاجتمند لڑکی کے لئے خدا معلوم یہ دو تین منٹ کیسے تھے تخیلات کا دریا دماغ میں اُمنڈ آیا۔ ضرورت کہتی تھی کہ طلبگار رعایت ہوں حیا کہتی تھی کہ اس تنہائی میں اجنبی سے بات کرنا قرین مصلحت نہیں۔ سوار کا قریب پہنچنا تھا کہ وہ آنکھیں جو چاروں طرف مددگار ڈھونڈ رہی تھیں شرم سے نیچی ہو گئیں ہاتھ رسی کے ساتھ اوپر اور گتھے بازوؤں کے نیچے چھپا ہوا تھا جسم کانپ رہا تھا دل

دھڑک رہا تھا طرح طرح کے خیال آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔

سوار کو یہ حالت دیکھکر بے اختیار ہنسی آئی۔ کنوئیں کی مینڈ پر چڑھا چاہتا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر رسّی کو پکڑے۔ سوار کا قریب پہنچنا تھا کہ لڑکی جھجک کر ہٹی۔ رسّی اور ڈول دونوں کنوئیں میں اور لڑکی مینڈ سے پیچھے

(باقی آئندہ)

راشد الخیری

سیاحتِ ہند

حافظ عبد الرحمن صاحب امرتسری سیاحِ بلادِ اسلامیہ کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کا سفرنامۂ روم و شام چھپکر مقبول ہو چکا ہے۔ انکی صرف و نحو عربی کی کتابوں کے علاوہ انکی چند کتابیں صحابۂ کرام کی سیر میں بہت پسند ہیں۔ حال میں اُنہوں نے ہندوستان کا سفرنامہ شائع کیا ہے۔ اس سفرنامہ کی تیاری کے لئے حافظ صاحب کو محکمۂ ریلوے کے افسرانِ اعلیٰ نے ملک بھر کی سیر بغیر کرایہ کرنے کے لئے پاس عنایت کیا تھا اور انہوں نے اپنے مشاہدات کو اس کتاب میں جمع کیا ہے۔

یہ کتاب ۴۲ عکسی تصویروں اور نقشہ ہندوستان سے مزین ہے اور علاوہ دلچسپ ہونیکے مفید بھی ہے۔ پنجاب گورنمنٹ نے اسکو پسند فرما کر حافظ صاحب کو چار سو روپے انعام عطا کیا ہے اور پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے پنجاب کے سکولوں کی لائبریریوں کیواسطے اس کا ایک ایک نسخہ خرید کیا ہے۔ ہم حافظ صاحب کو اس کتاب پر اور اسکی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ قیمت عہ علاوہ محصولڈاک ۵

ملنے کا پتہ منیجر اشیشر ایجنسی۔ لاہور

مجوّزہ محمڈن یونیورسٹی

کے

مقاصد اور اسکو عملی صورت میں لانیکی تدابیر

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ ہے جس میں اسلامی تعلیم گاہوں کے مہتمم اور عہدہ دار اور دیگر وہ بزرگ جو مسئلہ تعلیم سے عملی دلچسپی رکھتے ہوں جمع ہوکر مشورہ کرتے ہیں اور اسکی ترقی سوچتے ہیں۔ اس کانفرنس کا جلسہ اس مرتبہ علیگڈھ میں ۲ ماہ اپریل میں نہایت کامیابی کے ساتھ ہوا۔ اس کے پروگرام میں علاوہ اور دلچسپیوں کے ایک دلچسپ چیز یہ تھی۔ کہ مجوزہ اسلامی یونیورسٹی کے موضوع پر کالج کے طلبہ سے انعامی مضمون لکھوائے گئے تھے اور وہ جلسہ میں پڑھے گئے۔ پانچ جج مضمون کے لئے مقرر تھے۔ سب نے غور و فکر کے بعد اوّل درجہ کا انعام مولوی انیس احمد صاحب متعلم بی۔ اے کلاس کے لئے تجویز کیا۔ اور اُنکے مضمون کو بحیثیت مجموعی اور اس کی تحریر کو باعتبار فصاحت و طلاقت بہترین قرار دیا۔ مولوی انیس احمد صاحب کا یہ مضمون میں نے اشاعت کے لئے مانگ لیا ہے۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں۔ کہ لوگ ایسے مستعد نوجوانوں سے روشناس ہوں۔ جو علاوہ خدمت قومی کے جوش سے متاثر ہونے کے تحریر و تقریر میں نہایت ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ — مدیر الناظر

مضمون زیر بحث کے دو حصے ہیں۔

(۱) مجوزہ یونیورسٹی کے مقاصد۔

(۲) کن تدابیر سے ہم یونیورسٹی بنا سکتے ہیں؟

تو اول میں پہلے حصہ کے متعلق اور پھر دوسرے حصہ کے متعلق کچھ کہوں گا۔
مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق سیکڑوں مضامین بڑے بڑے زبردست مسلمان فاضلوں کے شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے زیادہ یا اُن کے برابر عمدگی سے بیان کرنا کا دعویٰ تو میری قابلیت سے باہر ہے۔ میں نے وہ پیرایہ اختیار کیا جو خود میری سمجھ میں آیا۔ مجوزہ محمڈن یونیورسٹی کے مقاصد کو اچھی طرح واضح کرنے کے لئے موجودہ یونیورسٹیوں کے نقائص کا ثبوت دینا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ اس سبب میں یہ ثبوت بھی پیش کرونگا مختصر لفظوں میں مجوزہ محمڈن یونیورسٹی کے مقاصد یہ ہیں کہ مسلمانوں کو مغربی علوم و فنون کی اس عمدہ طریقہ سے تعلیم دے جس طرح آج کل یورپ میں دی جاتی ہے تاکہ وہ علوم جدیدہ کے ماہر بن سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ انکو مذہبی تعلیم بھی اس طرح سے دے کہ وہ سچے اور پکے مسلمان رہ سکیں۔ اور اس طریقہ سے مسلمانان ہند کو برباد اور تباہ ہونے سے بچائے اور اُن میں وہ علمی اور قومی رُوح پھونکدے جسکے ذریعہ سے وہ از سر نو ایک زندہ اور معزز قوم بنجاویں۔

اس موقعہ پر میں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ مجھے یقین کامل ہے کہ مسلمانانِ ہند کی آج کل بہت خراب حالت ہے لیکن ابھی تک اُن میں از سر نو ایک زندہ اور معزز قوم بننے کی استعداد فنا نہیں ہوئی ہے لیکن اگر ہماری غفلت کا حال یہی رہا تو عنقریب یہ استعداد بھی فنا ہو جائیگی۔ نیز میرا یہ یقین ہے کہ سوائے مجوزہ محمڈن یونیورسٹی کے کوئی اور ذریعہ ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کو من حیث القوم تباہی سے بچائے اور از سر نو سرسبز و شاداب کردے۔ صاحبو! یہ ایک امر واقعی ہے جس کے خلاف کوئی نظیر پیش نہیں کیجا سکتی کہ اس زمانہ میں معزز قوم بننے کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط اعلیٰ تعلیم سے فیض حاصل کرنا ہے۔ جب تک کوئی قوم اعلیٰ تعلیم سے

نہیں حاصل نہ کرے وہ معزز قوم نہیں بن سکتی۔ اعلیٰ تعلیم سے میرا منشا اس نام نہاد اعلیٰ تعلیم سے نہیں ہے جسکو ہماری موجودہ یونیورسٹیاں دیتی ہیں۔ اس تعلیم سے ایک مہذب اور معزز قوم بننے میں ہم اپنی ناکامی کا خود احساس کر رہے ہیں۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم سے میری مراد اس قسم کی تعلیم ہے جو امریکہ، یورپ یا جاپان وغیرہ میں دیجاتی ہے جس سے دل و دماغ منور ہو جاتے ہیں اور جس سے ترقی کرنے کے حوصلے اور امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ جاپانی [illegible] اسی کے [illegible] سے تھوڑے عرصہ میں جاپانی بھی آج یورپ کے ہم پلہ ہو گئے۔

ہندوستانی یونیورسٹیاں نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے تعلیم دے رہی ہیں۔ اگر یہ تعلیم عمدہ ہوتی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندوستانی بھی معزز قوموں کے دائرہ میں شامل ہو جاتے۔

ممکن ہے کہ آپ کے دل میں خیال پیدا ہو کہ ایسا کونسا طریقہ ہو سکتا ہے جس میں کوئی قوم ترقی کر سکے برائے مہربانی جاپان پر نظر ڈالئے۔ الفرڈ سٹیڈ صاحب اپنی کتاب "گریٹ جاپان" میں صفحہ (۱۲۶) پر تحریر فرماتے ہیں کہ "۱۸۶۶ء سے پہلے جاپان میں تعلیم نہایت محدود حالت میں تھی۔ صرف ایک خاص فرقہ اس سے مستفید ہوتا تھا اور اس وقت تک جاپانیوں کی تعلیم [illegible] چینی اور جاپانی لٹریچر تک محدود تھی"۔ مگر اب اس لحاظ سے جاپان نے صرف چالیس برس میں زندگی کے ہر شعبہ میں اس قدر ترقی کی کہ وہ آج یورپ کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ تعلیم و تربیت۔ تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ خوبیوں میں بیحد پیچھے ہیں۔ اس کہنے سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم کو جاپان کے برابر ہو جانا چاہئے تھا۔ جاپان اور ہندوستان میں بہت فرق ہے۔ کیونکہ جاپانی حکمران قوم ہیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ موجودہ یونیورسٹیاں حقیقی اعلیٰ تعلیم دینے میں ناکام رہی ہیں۔

اس مطلب کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے مسٹر گوداس بنرجی کی رائے کو پیش کرتا ہوں۔ گورنمنٹ بھی ان کو تعلیمی معاملات میں ایک زبردست مبصر خیال کرتی ہے اور اسی سبب سے وہ سنہ ۱۹۰۲ء میں یونیورسٹیز کمیشن کے ممبر مقرر کیے گئے تھے۔ مسٹر گوداس بنرجی اپنی اس تقریر میں جو حال میں اپنے نیشنل کالج کے افتتاح کے وقت اُنہوں نے دی تھی فرماتے ہیں "ہندوستانی یونیورسٹیوں کا طریقہ تعلیم ہم جانچ چکے ہیں اور اس وجہ سے ہم اس کے عیوب سے واقف ہو گئے ہیں اور ہم اس طریقہ تعلیم میں اصلاح کر سکتے ہیں اور بلاشبہ وہ وقت آپہنچا ہے کہ ہم موجودہ طریقوں کو تبدیل کر دیں"۔

مرحوم مسٹر بنک بھی ان یونیورسٹیوں کے بارے میں اپنی رائے ظاہر فرما چکے ہیں۔ لاہور کانفرنس کے موقعہ پر اُنہوں نے فرمایا تھا کہ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کا انتظام نکما اور بگڑنے والا ہے اور اس انتظام کی یورپ میں اب کچھ وقعت نہیں رہی ہے نیز ان یونیورسٹیوں کے امتحانات میں تنگی اور خود مختاری پائی جاتی ہے اور یہ امتحانات قابلیت کے عمدہ اور سچے معیار نہیں ہیں"۔

سنہ ۱۹۰۲ء کی یونیورسٹیز کمیشن بھی ان الفاظ میں موجودہ طریقہ تعلیم کا ناقص ہونا تسلیم کرتی ہے:۔

ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اکثر ہندوستانی گریجوایٹوں کی قابلیت ناکافی اور سطحی ہوتی ہے (انڈین یونیورسٹیز کمیشن رپورٹ صفحہ ۵)

علاوہ ازیں خود گورنمنٹ بھی تسلیم کرتی ہے کہ موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم اور انکا طریق امتحان ناقص ہے (گورنمنٹ آف انڈیا رزولیوشن ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۰۴ء مندرجہ ایجوکیشنل کوڈ یوپی سنہ ۱۹۰۱ء۔ صفحہ ۶ و ۱۴۲)۔

مزید برآں ماہرانِ فنِ تعلیم اور گورنمنٹ تسلیم کرتی ہے کہ بلا مذہبی تعلیم کے کوئی تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی اور موجودہ یونیورسٹیوں میں چند وجوہ سے مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں ہو سکتا (از اسپیچ نواب محسن الملک در اجلاس ہشتم کانفرنس علیگڈھ)

اس وجہ سے بھی موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم ادھوری ہے۔ غیروں کی شہادتیں موجود ہوتے ہوئے میں نے مسلمانوں کی رائیں اس وجہ سے بیان نہیں کیں کہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھ لیں کہ مسلمان اپنی یونیورسٹی بنانے کی وجہ سے موجودہ یونیورسٹیوں کو خواہ مخواہ بُرا کہتے ہیں۔ ورنہ سب سے پہلے میں سر سید کا موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم کے بارے میں یہ قول پیش کرتا کہ "یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو صرف چپڑ بناتی ہے" (حیاتِ جاوید حصہ اول صفحہ [illegible])

جنابِ والا! ہندوستان اور جاپان کے مقابلہ سے سرگرو داس بنرجی اور مسٹر بیک کے اقوال سے۔ یونیورسٹیز کمیشن کی رائے سے اور گورنمنٹ کے اعتراف سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہماری ان یونیورسٹیوں میں ایسی ادھوری تعلیم دی جاتی ہے جس سے نہایت دشوار ہے کہ ہم ایک معزز قوم بن سکیں۔ اگر ہمارے دل میں یہ غلط خیال کہ ان یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے ہم پھر معزز بن سکیں گے پیدا ہو بھی تو وہ نہایت آسانی سے مٹ سکتا ہے۔ ہندوؤں کی حالت پر غور کرنا چاہیے۔ موجودہ تعلیم میں وہ ہم سے ساٹھ برس آگے ہیں کیونکہ راجہ رام موہن رائے نے جنکو ہم ہندوؤں کا سر سید کہہ سکتے ہیں۔ ہندوؤں کو انگریزی تعلیم دینے کے لئے سنہ ۱۸۱۷ء میں پہلا کالج قائم کیا تھا (انڈین یونیورسٹیز کمیشن رپورٹ صفحہ ۲) اور علیگڈھ کالج کی بنیاد سنہ ۱۸۷۷ء میں پڑی ہے تو اس لحاظ سے ہندو موجودہ تعلیم میں ہم سے ساٹھ برس آگے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر مسلمان انہیں یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے ہندوؤں

کی طرح سے تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے تو وہ ساٹھ برس بعد اس مقام
پر پہنچینگے جس مقام پر آج ہندو ہیں۔ ورنہ ہندو اس بات کے قائل ہیں کہ وہ
دنیا کی بہترین اقوام کے دائرہ میں شامل نہیں ہیں بلکہ خراب حالت میں ہیں
تو کیا ساٹھ برس بعد یہ نتیجہ ہمارے لئے دلخوش کن ہوگا۔ کیا ہم اس رفتار سے
کبھی قیامت تک بھی دنیا کے معزز قوموں کے برابر ہو سکتے ہیں؟

اِن دلائل سے ثابت ہوا کہ اگر موجودہ نظام تعلیم جاری رہا تو ہم کبھی
دنیا کی معزز قوموں کے برابر نہیں ہو سکتے۔

علاوہ اس مصیبت کے اِن یونیورسٹیوں سے ایک اور نہایت ہولناک
مصیبت ہم پر نازل ہو رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم
سے ہم اپنے مذہب کو چھوڑتے جاتے ہیں۔ یونیورسٹیاں ایک طرف تو
مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کر سکتیں اور دوسری طرف مختلف مضامین
کی بھرمار سے طلبار کو اس قدر مہلت نہیں دیتیں کہ وہ اپنی مذہبی تعلیم حاصل
کر سکیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے مذہب کی پاک تعلیم اور روحانیت
سے محروم ہوتے جاتے ہیں اور جو کچھ اخلاقی خوبیاں ہم میں باقی رہ گئی ہیں
وہ بھی دن بدن کم ہوتی جاتی ہیں۔ ان مصیبتوں کے علاوہ ایک تیسری مصیبت
یہ ہے کہ موجودہ یونیورسٹیوں کے طریقہ تعلیم اور طریقہ امتحان سے ہماری
جسمانی حالت اور صحت کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے جسکو سنہ ۱۹۰۲ء کی یونیورسٹیز
کمیشن بھی ان الفاظ میں تسلیم کرتی ہے۔ "کوئی شبہ نہیں ہے کہ بصارت کی
کمزوری عام ہوتی جاتی ہے اور بعض نوجوان مطالعہ کی کثرت سے اپنی صحت
کو دائمی نقصان پہنچاتے ہیں" (انڈین یونیورسٹیز کمیشن رپورٹ صفحہ ۵)

ان مصیبتوں کے اظہار سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان یونیورسٹیوں سے

ہمیں کوئی بھی نفع نہیں پہنچا ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم ان یونیورسٹیوں کی تعلیم پر قناعت کرینگے تو ہم دنیا میں معزز قوموں کی برابری نہ کرسکینگے اور ہمارا مذہب ہم سے چھوٹتا جائیگا اور ہماری صحتیں رفتہ رفتہ اور زیادہ خراب ہوتی جائیگی۔ صاحبو! یہ نقصان کچھ کم نہیں ہیں بلکہ ایک زبردست سے زبردست قوم کو خاک میں ملا دینے کے لئے کافی ہیں۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ یہ مصیبتیں یونیورسٹیوں کے منتظمین کی بدنیتی سے پیدا ہوئی ہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ ہماری ضروریات کا عمدہ طور سے علم نہیں ہوسکتا اور یہ ہماری سخت نادانی اور بدقسمتی ہے کہ تعلیم جیسی چیز کو جس پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے ہم نے ایسے اصحاب کے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے جو ہماری اصلی ضروریات کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ سکتے اور ہم بے بسی کے عالم میں بیٹھے ہیں۔ پس اب ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جس سے ہم ایسی تیز رفتار سے ترقی کریں کہ موجودہ بہترین قوموں کے برابر ہوجائیں اور پکے مسلمان بھی رہیں۔ صاحبو! محمڈن یونیورسٹی کا مقصد یہی ہے کہ وہ ہمیں ان یونیورسٹیوں کے نقصانات سے نجات دے اور ایک طرف تو ہمیں موجودہ علوم و فنون کی تعلیم اس طریقے سے دے جس طرح یورپ یا جاپان میں دیجاتی ہے اور جس ذریعہ سے ہم حقیقی تعلیم یافتہ قوم سمجھے جانے لگیں اور ہماری صحتیں عمدہ اور جسم تندرست رہیں اور دوسری طرف وہ ہمیں مذہبی تعلیم اس طرح پر دے جس سے ہم سچے اور پکے مسلمان رہیں اور ہمارے دلوں پر اسلام کی خوبیاں اس طریقہ سے نقش ہوجائیں کہ ہم اُنکے موافق عمل کریں۔

صاحبو! ہمارے مذہب کی حقیقی تعلیم وہ تعلیم ہے جس نے عربوں جیسے جاہلوں کو تھوڑے عرصہ میں ترقی کے آسمان پر پہنچا دیا تھا اور اسی وجہ سے ہمیں اُمید ہے کہ موجودہ علوم و فنون کے ساتھ ہی ساتھ اگر ہم اپنے مذہب کی

تعلیم سے بھی فیض حاصل کریں۔ تو تھوڑے زمانہ میں ہم بھی دنیا کی بہترین اقوام
میں شمار ہونے لگیں۔ ہماری یہ آرزو ہرگز پوری نہیں ہو سکتی جب تک تعلیم
ہمارے ہاتھ میں نہ ہو۔ مثال کے طور پر علیگڈھ کالج ہی کو دیکھئے۔ باوجود اس کے
کہ علیگڈھ کالج ایک عمدہ اور ریزیڈنشل کالج ہے۔ اور اس کو سوائے تعلیم کے
اپنے ہاتھ میں نہ ہونے کے بہت سے فوائد حاصل ہیں اور تیس برس سے
یہ کالج قائم ہے۔ اب غور کرنا چاہئے کہ کس قدر اسکالر۔ کیسے مسلمان مصنف۔
سیاست دان۔ مورخ۔ سائنٹسٹ فلاسفر۔ ایثار کرنے والے۔ سچا درد رکھنے
والے۔ عملی کام کرنے والے اس نے پیدا کئے ہیں۔

مشکل سے آپ مجھے چند مثالیں دے سکتے ہیں۔ کیا یہ رفتار جانب
ترقی تصور کی جا سکتی ہے؟ علیگڈھ کالج کے نتائج سے بھی ہم یہ نتیجہ نکال سکتے
ہیں کہ جب تک تعلیم ہمارے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ہم کبھی کامیاب نہ ہونگے۔ اس
معاملہ میں یونیورسٹیوں سے زیادہ قصوروار ہم ہیں کہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے
مکانوں میں آگ لگ رہی ہے اور ہم تاپ رہے ہیں۔ موت کا بازار گرم ہے اور
ہم بے فکر بیٹھے ہیں۔ گھر میں ماتم ہو رہا ہے اور ہم ہنس رہے ہیں۔ قیامت
آگئی ہے اور ہم بے خبر ہیں۔ آنکھ رکھتے ہیں مگر نہیں دیکھتے۔ کان رکھتے
ہیں مگر نہیں سنتے۔ دل رکھتے ہیں مگر نہیں سمجھتے!!! غرض یونیورسٹی کا
مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پکا مسلمان بنا دے اور یہ صرف
اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو تاکہ ہم اپنی قوم کی ضروریات
کو سمجھ کر جیسا مناسب ہو اسی طرح سے تعلیم دیں۔ جب تک تعلیم ہمارے ہاتھ
میں نہ ہوگی ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونگے۔ تعلیم کے اپنے ہاتھ میں ہونے
اور نہ ہونے کے فرق کو زیادہ واضح کرنے کے لئے میں ایک مصری فاضل کے

مضمون سے جو حال ہی المؤید میں چھپا تھا حسب ذیل اقتباس کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔
فاضل موصوف لکھتے ہیں کہ انگلستان کے بچوں کو اور مصری بچوں کو ابتدائی جماعت میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ اُن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ انگلستان کے بچوں کو ابتدائی جماعت میں اس قسم کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

۱۔ ہم وہ ہیں جسکو انگلستان نے پیدا کیا۔
۲۔ ہم اپنے ملک پر کیوں فخر کرتے ہیں۔
۳۔ ہم اپنے ملک کے دوست کیونکر بن سکتے ہیں۔
۴۔ خالص وطنی محبت۔
۵۔ مصائب پر صبر۔
۶۔ رشتۂ علم۔
۷۔ آزادی اور غلامی۔
۸۔ ہم نے آزادی کیونکر حاصل کی۔
۹۔ انگلستان منتظر ہے کہ اُس کا ہر ایک فرزند اسکا حق ادا کرے۔

ان مضامین کے مقابلہ میں مصری بچوں کو اس قسم کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں:۔

(۱) گائے اور چڑیا کی کہانی۔
(۲) ایک مرد کی کہانی جو معہ بچوں کے اسکندریہ جا رہا تھا۔
(۳) ولیم اور ازبکیہ اسٹیشن۔
(۴) بچوں کی حکایت جو جزیروں میں کھیلتے ہیں۔
(۵) لباس۔

(۶) مصر کی چاروں فصلوں کی حالت۔

(۷) قاہرہ۔

(۸) ابن مکانس کی نظم۔

ان مختلف مضامین کا مستقل اثر جو کچھ بچپن کے زمانہ میں جذبات پر ہو سکتا ہے اسکو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم اپنی یونیورسٹیوں کا آکسفورڈ یونیورسٹی سے مقابلہ کریں تو ہمیں یہ فرق اور عمدہ طرح سے معلوم ہو سکتا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں صرف ایک مضمون کا پڑھنا جس سے طالبعلم کو دلچسپی ہو۔ لازمی ہے۔ تاکہ اس طریقہ سے کسی خاص مضمون میں کامل لیاقت حاصل ہو۔ لیکن ہماری یونیورسٹیوں میں مضامین کی ایسی بھرمار ہے کہ کسی مضمون میں درجہ کمال حاصل کرنا مشکل ہے اور لہذا ہم نیم تعلیم یافتہ رہ جاتے ہیں۔ آکسفورڈ میں طالب علم کو اس قدر آزادی ہے کہ اگر یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں کوئی خاص حصہ کسی مضمون کا نہ ہو اور وہ طالبعلم اس حصۂ مضمون سے دلچسپی رکھے تو صرف اس طالبعلم کی دلچسپی کی وجہ سے وہ خاص حصہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل سمجھا جائیگا اور اس حصہ میں اس طالب علم کا امتحان ہو سکیگا (از کتاب لائف اٹ آکسفورڈ بائی مہدی حسین) اور یہاں کی یہ حالت ہے کہ بسا اوقات ناموزون اور غیر دلچسپ کتب درسی کی زنجیروں سے طلبا جکڑ بند کئے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے گریجوایٹ نکلتے ہیں جیسے کہ دیکھنے میں آتے ہیں۔

غرض کہاں تک رونا رویا جائے ؎

رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہئے کہاں کہاں کی

(باقی آئندہ)

سنسکرت اور اُسکی ضرورت

گذشتہ اشاعت سے آگے

رسوم - اور صرف عبادت کی فلاسفی بلکہ ہندو اقوام کے بہت سی رسوم اور عادات
جو دنیا کے لئے معما اور ہمارے لئے کم فہم ہیں وہ سب قدامت کی یادگاریں اور قدیم
لٹریچر ہی اُن پر روشنی ڈال سکتا ہے اس لئے اُنکے پیدا ہونے کے اسباب یا اُن کی
ضرورت ان سب کا پتہ بھی سنسکرت ہی کے کھنڈروں میں تلاش کرنا چاہیئے
اور وہیں سے اس قسم کے تاریخی اور تمدنی نکتے حل ہونے کی توقع ہے - مثلاً میں
ٹائمز آف انڈیا کا ہفتہ وار ایڈیشن دیکھا کرتا ہوں - اس میں تصویریں ہوتی ہیں -
یورپین لوگوں کے گروپ یا مشاہیر ہند کی تصویریں تو ہوتی ہی ہیں - اُس میں
ہندوستان کے ادنیٰ طبقہ کی تصویریں بھی کثرت سے ہوتی ہیں - لکڑہارا لکڑیاں
لا رہا ہے - مزدور بوجھ اُٹھا رہے ہیں - چرواہے بکریاں چرا رہے ہیں - جو کچھ بھی نظر
آئے اس کی تصویر اخبار میں دیدیتے ہیں - مگر سب یا لنگوٹ بند یا دھوتی باندھے
ہوئے اور ننگے بدن - ان تصویروں کو دیکھکر اگر میں ہندوستان میں نہ رہتا
تو ضرور خیال کرتا کہ ہندوستانیوں کو ذلیل کرنے کے لئے ایسی ننگی تصویریں
دیجاتی ہیں مگر اب ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ادنیٰ طبقہ کے لوگ عموماً اسی
شکل میں کام کاج کیا کرتے ہیں اس لئے خیال ہوتا ہے کہ یا الٰہی ہندوستانیوں
پر کیا آفت ہے کہ بدن پر چیتھڑا تک نہیں ہوتا اگر کہا جائے کہ ایک تو لوگ غریب ہیں
کپڑے کی استطاعت نہیں اور دوسرے ملک بھی گرم ہے کپڑے کے بغیر گذر ہو سکتی ہے
اس لئے یہ عادت ہو گئی تو پھر بھی شبہ باقی رہتا ہے - کیونکہ عرب اور ایران کے

اور فی الحقیقت کی تصویریں بھی اکثر دیکھنے میں آئی ہیں اور مہاتماؤں کے سلسلے اور منجموں وغیرہ والے بھی سر سے پاؤں تک ننگے بیٹھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ عرب کی گرمی اور غریبی ہندوستان سے بڑھ کر ہے اور ادھر یہاں جن لوگوں کو وسعت ہے وہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ دکانوں پر بیٹھے ہوئے دھوتی کو اوپر کی طرف کھینچ لیتے ہیں اور بے تکلف زانوں تک برہنہ کئے بیٹھے رہتے ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کھانا کھانے یا عبادت کرنے کے وقت عموماً دھوتی کے سوا تمام کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور مدراس میں یعنی سادھو سنت ہمیشہ صرف لنگوٹی پر بسر کرتے ہیں بلکہ شاید تیت ایک ایسا فرقہ ہے جو بالکل برہنہ رہتا ہے اور اس پر بھی قوم انکی عزت کرتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید مذہب نے کپڑے کا نہ ہونا بہتر قرار دیا ہے اور اسی لئے برہنگی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اب اگر یورپ اور دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں کوئی ہندو یہ صورت دیکھ کر آپ کے دل کو بھی وہی صدمہ ہوتا ہے جسکو میں محسوس کرتا ہوں تو اسکو دور کرنے کی خواہش کے ساتھ آپ کو اس کے سبب کی طرف بھی توجہ ہوتی ہوگی اور چونکہ یہ پرانی رسم ہے اس لئے اس کا پتہ بھی پرانے احادیث میں ہی مل سکیگا اور اس لئے آپ کو یہ اور اس قسم کی دیگر تمام مراسم کی اصلاح یا غور و تامل کے لئے سنسکرت کی ضرورت محسوس ہوتی رہیگی۔

میڈیم[1] کی ضرورت عزیز صاحبان یہ وہ فائدے ہیں جنکو میں سنسکرت کی اشاعت پر منحصر سمجھتا ہوں کہ موجودہ زبان کی ترقی۔ علوم کی ترقی۔ تاریخ کی ترتیب اور سوشل ریفارم آپکے سب کام اسی پر منحصر ہیں اور اگر اس سے صرف یہی فائدے نہیں جنکی ملک کو ضرورت ہے اور ان جواہر ریزوں کے سوا جو سنسکرت کے خزانے سے مل سکتے ہیں اور بھی بہت بڑے بڑے ذخیرے دنیا میں موجود ہیں۔

[1] میڈیم۔ انگریزی لفظ ہے بمعنی ذریعہ یا واسطہ۔

جن زبانوں کو حاصل کرنے سے وہ حاصل ہو سکتے ہیں اُن کا علم حسب مدارج ضروری ہے
اور نیز یہ بھی اب ممکن نہیں کہ تمام ملک کی زبان سنسکرت ہو جائے یا یہ کہ تمام لوگ
سنسکرت کے تمام علوم کو تحصیل کر لیں بلکہ اشاعت ہونے پر بھی قوم کی ایک جزو
سنسکرت علم میں ماہر ہو سکیگا اور جو ماہر ہونگے وہ بھی تمام علوم میں ماہر ہو سکینگے بلکہ
جو حاصل کرنے کی شرط ہے وہ ایک شخص ایک دو شاخوں میں ہی پوری کر سکیگا اور
ایسا ہی دیگر زبانوں اور انکے علوم کی پوری واقفیت بھی ایک محدود جماعت
کو ہو سکیگی - اچھا تو اب اگر سنسکرت والے صرف سنسکرت اور دیگر زبانوں کے
ماہر صرف وہی زبان سیکھنے پر اکتفا کریں تو جو شخص کچھ حاصل کریگا وہ اسی کے
پیٹ میں دفن رہیگا اور ملک کو فائدہ جب پہنچ سکتا ہے کہ ہر شخص اپنی واقفیت
سے دوسروں کو آگاہ کرے - اسلئے علاوہ سنسکرت کے اور علاوہ اُن زبانوں
کے جن سے علوم کو اخذ کرنا ہے سب کو کسی ایسی زبان کی بھی ضرورت ہے جو تبادلہ
خیالات کے لئے میڈیم اور واسطہ کا کام دے - مگر ہمارے ملک میں ہندی کا اشتیاق
مشکل پیدا ہو گیا ہے - لیکن ابتک صحیح رفتار بہت کم ضرورتوں کے واسطے اختیار
کی گئی ہے - بیشک ایک غیر زبان کو حاصل کرنے کے لیے جس میں بہت سی
علمی دولت موجود ہے ملک کا اشتیاق، و نا آوروں ہو گئے ہیں جنہوں نے سوا
کسی قدر ظاہری تقلید کے اس زبان کے علوم سے حقیقی فائدہ حاصل کرنے کو
مدعا قرار دیا ہے - اور جبتک اپنی گذشتہ عظمت کی یاد اہل ملک کو ہمیشہ
پریشان رکھتی ہے مگر کتنے ہیں جنہوں نے اسکو حاصل کرنے کے حقیقی وسائل
مہیا کئے ہیں - جو لوگ ترقی کے اصلی رستہ پر چلے ہوئے ہیں وہ تو یورپ
جیسے براعظم کی تمام مختلف اور علم سے مالامال زبانوں کو اپنی ترقی کے رستہ
میں رکاوٹ سمجھکر اسپرنٹو ایک ایسی زبان ایجاد کرنیکی ضرورت تسلیم کرتے ہیں جو

تمام برِعظم میں یکساں بولی اور سمجھی جا سکے۔ مگر یہاں ملکی زبان کو ترقی دینے کا
شریف خیال پیدا ہوا تو اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ کاروباری۔ دفتری اور علمی تمام
ضرورتوں کے لئے پنجاب والے پنجابی کو کشمیر والے کشمیری کو اور پشاور والے
افغانی زبان کو اختیار کریں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ہند کے ایک عمدہ حصہ میں چھوٹے
چھوٹے ٹکڑوں کے اندر ایک شخص اپنا خیال دوسروں کو سمجھانے کے قابل نہ ہو سکے
اپنی زبان کی محبت اور اسکو علوم سے سیراب کرنے کی خواہش بیشک اچھی ہے مگر
ابھی تک شاید بنگالیوں کے سوا کسی نے اپنے علاقہ کی زبان کو تصنیف و تالیف
سے مالدار کیا ہوگا۔ لیکن سوا چند ور علاقہ بنگال کے انکی اس کوشش سے ملک کو
کیا فائدہ پہنچا اور اگر وہ ہندوستان کی لنگوا فرنکا زبان کو تسلیم کرتے اور یہی
کوشش اسکو ترقی دینے میں صرف ہوتی تو کوشش اتنی ہی کرنی پڑتی جتنی اب کی
ہے۔ مگر فائدہ تمام ملک کو حاصل ہوتا۔ پس اگر انکی تقلید سے اسی قسم کی کوشش
گجراتی۔ دکنی۔ سندھی اور پنجابی وغیرہ کے لئے کی گئی تو بجائے خود کوشش
ہر ایک کو بجید کرنی پڑیگی اور فائدہ صرف ایک علاقے تک محدود رہیگا۔ غرض
میرے نزدیک یہ رائے غلط ہے جسکو ملک نے پسند کیا ہے اور وہی ذاتی فوائد کا
خیال جسکو ہم اکثر قومی فوائد سے مقدم رکھنے کے عادی ہیں وہی خیال قومی
رنگ میں اپنے علاقے کو فائدہ پہنچانے کی دھن میں تمام ملک سے اپنے
تئیں بیگانہ سمجھنے اور اپنی کوشش سے مادر وطن کو محروم رکھنے میں ظاہر ہو رہا
ہے اور خواہ انگریزی کے ماسٹرپیس یا سنسکرت کے دفینوں پر تصرف کریں۔ مدعا یہ
ہے کہ پھر بھی اپنے گرد و پیش کے چند گاؤں کے سوا ملک والوں کے سامنے
گونگے بنے رہیں اور اپنے خیالات سے انکو فائدہ نہ پہنچنے دیں۔ خیال تو کیجئے
اگر بالفرض پنجاب کے لئے پنجابی زبان کو میڈیم قرار دیا جائے تو اُس کی حکومت

ایک طرف انبالہ سے آگے نہ بڑھیگی اور دوسری طرف راولپنڈی انتہائی حد ہوگی
اور اسی طرح پر کشمیر اس سے محروم رہیگا اور سرحدی علاقہ اور سندھ اس سے
الگ رہ جائیگا۔ اور علمی سرمایہ اس میں لانے کے لئے جو عرق ریزی کرنی پڑیگی
دوسروں کو اسکی ہوا تک نہ آئیگی اور اگر کوئی لنگوا فرنکا اختیار کیجائے تو علمی
کوشش کا بار نہ صرف ستلج سے جہلم تک بلکہ کشمیر سے راس کماری تک سب پر
تقسیم ہوجائیگا اور ہر ایک علاقہ بقدر ضرورت کا دسواں حصہ بھی کوشش
کرے تو ہندوستان علمی سرمایہ میں کسی مہذب ملک سے کم نہ رہیگا۔

اردو اور بھاشا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر کسی زبان میں کسی فرقے
کی مذہبی کتابیں ہوں تو خاص اس فرقے کو ایسی زبان کا سیکھنا تاکہ اپنے مذہبی
احکام سے واقف ہو ضرور ہے۔ مگر یہاں ذکر علمی ضرورت کا ہے اور جس طرح
علمی اوصاف کی وجہ سے سنسکرت کی ضرورت ہر شخص کو ہے خواہ وہ کسی
مذہب کا ہو اور جس طرح تمام دیگر زبانوں کی ضرورت سب کے لئے مسلّم ہے۔
جو علوم و فنون رکھتی ہوں۔ اسی طرح ایک ملکی زبان کو ترقی دینے کی بھی ضرورت
سب کو ہے کیونکہ اس کے بغیر علمی زبانوں کے ذخیرے حاصل کرنے کے بعد
بیکار رہے جاتے ہیں اور اکثر سمجھا جاتا ہے کہ انگریزی خواں انگریزی کے بہت
سے مفید مضامین کا ترجمہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ ملکی زبان میں انکو وہ مہارت
نہیں جو انگریزی میں حاصل ہے۔ پس جب کسی ملکی زبان کی ضرورت ایسی محسوس
ہوتی ہے اور بدقسمتی سے ملک کسی ایک زبان کو تسلیم کرنے پر متفق نہیں ہے تو
اسکو انتخاب کرنے کے لئے کسی قسم کے اوصاف کو معیار قرار دینا پڑیگا۔
اور چونکہ اس میں علمی سرمایہ کو لانا ہے اس لئے اسکا پہلا وصف یہ ہونا چاہئے
کہ وہ علوم کو اخذ کرنے کی قابلیت میں سب سے اعلیٰ ہو اور چونکہ اسکی وساطت سے

سے ملک کو فائدہ پہنچا ہو۔ اس لئے دوسری شرط یہ ہونی چاہئے کہ وہ دیگر زبانوں کی
نسبت ملک کے بیشتر حصہ میں بولی یا سمجھی جا سکے اور ظاہر ہے کہ گجراتی یا سندھی وغیرہ
خاص علاقوں کی زبانیں یہ خصوصیت نہیں رکھتیں اور نہ قرین قیاس ہے کہ کبھی یہ زبانیں
ملک کی لنگوا فرنکا بن سکیں گی۔ اس لئے اس کام کے واسطے صرف دو نام لئے جا سکتے
ہیں اردو اور بھاشا۔ گو بعض ہیں کہ ملک انکو دو سمجھتا ہے اور اس باب میں بہت
اختلاف رکھتا ہو اور میں انکو دو سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں پاتا اس لئے کہ ایک پنجابی
کی اردو جس میں پنجابی الفاظ مخلوط ہوتے ہیں۔ یا عربی خوان کی اردو جس میں
عربی فارسی کی آمیزش ہوتی ہو۔ یا انگریزی خوان کی اردو جس پر انگریزی رنگ
غالب ہوتا ہو یا دلی والوں کی اردو جس میں تھوڑا تھوڑا سبھی کچھ ہوتا ہے۔ یہ سب اردو
ہیں اور فرق اگر ہے تو فصاحت کی کمی بیشی کا تو پھر جب کوئی زبان ایک پنڈت
بولے اور اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کرے تو اسکو الگ زبان کیوں
کہا جائے اور جب پنجابی۔ انگریزی۔ عربی اور فارسی الفاظ کے ملنے سے زبان کا
نام نہیں بدلا تو سنسکرت کی آمیزش پر نام بدلنے کی کیا ضرورت۔ یہ ممکن ہو کہ اردو
نہ کہیں کچھ اور کہیں لیکن جو نام رکھیں سب کے لئے ایک ہی ہونا چاہئے۔ غرض میرے
نزدیک یہ زبانیں دو نہیں ہیں اور ان میں اختلاف صرف اس قدر ہو کہ ایک فارسی شکل
میں لکھی جاتی ہو اور دوسری سنسکرت خط میں اور اس لئے اگر بھاشا کتاب کو فارسی
خط میں اور اردو کتاب کو سنسکرت کی شکل میں لکھ دیا جائے تو بھاشا سے اردو اور
اردو سے بھاشا بن سکتی ہو۔ اور اس لئے اگر ان دونوں زبانوں۔ نہیں بلکہ اگر ان
دونوں خطوں کے حامی آپس میں یونہی جھگڑتے رہیں۔ جیسے اب ہیں اور
کوشش دو طرفہ جاری ہے تو اگرچہ یہ ملک کی بدقسمتی ہو گی لیکن اس سے اتنا نقصان
نہیں جتنا مختلف علاقوں کی زبانوں کو رواج دینے سے متصور ہے۔ کیونکہ ایک

علاقے کی زبان کو وہ سوا بغیر ترجمے کے سمجھ نہیں سکتا مگر اردو اور بھاشا بولنے کے وقت
بے تکلف سمجھی جائیگی اور کتابوں کو صرف خط بدل کر لکھ دینا کافی ہوگا۔ لیکن پھر بھی
یہ اختلاف اگر موجود رہا تو نقصان سے خالی نہیں اور جو کوشش علمی سرمایہ کو اردو
یا بھاشا میں لانے کے لئے کیجائیگی اسکو ایک سے دوسری میں لانا ایک دوسرا
کام ہوگا اور اگر کسی طرح ملک کا اتفاق ہو سکے اور دونوں میں سے ایک خط کو
چھوڑنے پر سب متفق ہو جائیں تو ایک ہی کوشش میں سارا کام نکلے۔ اس لئے ملک
کی علمی ضرورت کو محسوس کرنے والوں کا فرض ہے کہ دونوں خطوں کے بارے میں
غور و فکر اور عالمانہ بحث کو جاری رکھیں۔ تا شاید کبھی کسی ایک رائے پر اتفاق کرنے
کی صورت نکل آئے۔

اردو کا امتیاز۔ اردو اور بھاشا دونوں کی حمایت میں کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا
ہے۔ اردو کو یہ ترجیح حاصل ہے کہ اس میں عربی کا ض ط ع فارسی کی ژ یا گاف انگریزی
کے ٹ یا ڈ ہندی کی ڑ یا گھ ان سب کے لئے شکلیں موجود ہیں اور اس لئے تمام
زبانوں کے الفاظ صاف اور واضح طور پر لکھے جا سکتے ہیں اور سمجھتے ہیں کوئی
دقت نہیں ہوتی اور اس لئے دیسی زبان کو اردو کے ساتھ مخصوص کرنے سے
زبان میں خود بخود وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی لچکداری سے تمام زبانوں
کے الفاظ بولنے اور لکھنے میں نہایت آسانی سے لئے جا سکتے ہیں۔ اور ادھر
سنسکرت خط میں بہت سے غیر زبانوں کے الفاظ نہیں آ سکتے اور اس طرح پر
الم اور علم یا قمر اور کمر دو ہیں۔ مگر بھاشا میں ایک سمجھے جائینگے۔ منصب لکھا
ہوگا اور جوب پڑھا جائیگا۔ اس قسم کی دقتوں سے یا اکثر جگہ مطلب غلط ہو جایا
کریگا یا غیر الفاظ کو چھوڑنا پڑے گا۔ کوئی کہے کہ باہر کے لفظوں کی ضرورت
ہی نہیں۔ سنسکرت خود کافی وسعت رکھتی ہے اور اس کے الفاظ سے کام

نکل آئیگا تو معاف کیجئیگا۔ میں سنسکرت کا ایسا بڑا دعویٰ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ جو چیزیں یا جو خیالات ہندوستان میں موجود ہی نہیں یا جو سنسکرت زمانے میں موجود نہ تھے۔ گو سنسکرت دیومانی ہو ممکن نہیں کہ اُن چیزوں اور اُن خیالات کے لیے اُس میں الفاظ موجود ہوں اور اس سے بھی انکار کرنا عقل کا کام نہیں کہ بعد میں بہت سی نئی چیزیں اور نئے خیالات اپنے الفاظ کو لئے ہوئے ہندوستان میں آئے اور آرہے ہیں اور اسلئے اگر سنسکرت خط کی حمایت میں ایسے تمام الفاظ کو چھوڑ دیا گیا جو اس میں نہیں آسکتے تو اردو خط کا دعویٰ ہو کہ ملک بہت سے اعلیٰ اور علمی خیالات سے محروم رہجائیگا اور ملکی زبان جسے محبت کرنے والے ترقی دینے کی فکر میں رہا کرتے ہیں یہاں غلط محبت کیوجہ سے اور تنزل کی طرف جائیگی اور اپنے موجودہ سرمایہ کا بہت بڑا حصہ کھو دیگی اور اس لئے اگر اُن معبد خیالات کی ضرورت ہو جو باہر سے آئے ہیں تو اُردو خط کا ساتھی و صرف اتنا ہی قصور ہے کہ وہ کبھی باہر سے آیا تھا ورنہ اب تو وہ بھی صدیوں سے برج کا باسی کہلانے کا حقدار ہے۔

بھاشا کا امتیاز۔ دوسری جانب بھاشا خط ایک بڑی خصوصیت یہ رکھتا ہو کہ حرکات کو ظاہر کرنے کے لئے اُس میں واولز کا استعمال ہوتا ہو اور اگر اردو خط الفاظ کا سرمایہ زیادہ رکھتا ہو تو بھاشا خط سے الفاظ کے تلفظ میں غلطی نہیں ہوسکتی اور بیشک یہ خصوصیت بھی قابل تعریف ہو اور تلفظ کی غلطی سے بھی بہت سی دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی اس امر سے چشم پوشی نہیں ہوسکتی کہ سنسکرت حروف کی پیچیدار شکلیں اور انکے ساتھ واولز کا استعمال لکھنے میں اُردو سے زیادہ وقت لیتا ہو اور فی زمانہ عدالتوں کی طول طویل کارروائی اور بڑے پیمانہ کی تجارتی خط کتابت ایکطرف بھاشا خط کو جبتک

کے مہاجنوں نے اپنے نسبتاً مختصر کاروبار میں استعمال کرنا شروع کیا تو وہ اسکے تلفظ کی خوبصورتی کو نباہ نہ سکے اور مختصر کرکے وہ خط ایجاد کرنا پڑا جسکو لنڈے کہتے ہیں وہ اس میں واولز کو حذف کرنے اور حروف و شکل کو سادہ بنانے سے یک طرف اس خط کا ہمسازی وصف یعنی تلفظ جاتا رہا اور دوسری جانب اس کو پڑھنا ایسا دشوار ہوگیا کہ ایک مہاجنی بیٹی آنے پر گروبیش کے دوکا نداروں کا بجث ہو کر پڑھے گئے ہیں۔ ورلکا ضرب المثل ہوگیا ہے۔ پس اگر بھاشا خط کو کتابی تحریر سے نکال کر دفتروں اور تجارتی کوٹھیوں تک پہنچایا جائے تو بعینہٖ اس خط کو استعمال کرنے سے اُردو کی سست کام دہین ہوگا یا واولز کو حذف کرکے لنڈے قسم کی تحریر ایجاد کرنی پڑیگی اور اس صورت میں جس خصوصیت سے بھاشا کو اُردو پر ترجیح دیجاتی ہے وہ دور ہو جائیگی۔ اور اسوقت معلوم ہوگا کہ نقطوں کے ٹیڑے وغیرے کو ہاتھ سے دیکر جس خوبی کو نباہنا چاہتا تھا وہ قائم رہنے کے قابل نہیں اور کام کرنے کی قابلیت میں وہی خط فائق ہے جو واولز کا دردسر نہیں رکھتا۔

غرض جہانتک میں غور کرسکتا ہوں خط کے بارے میں اُردو کو بھاشا سے بہتر پاتا ہوں اور محض اس خیال سے کہ بھاشا سودیشی ہے اور اردو زبان اگرچہ پیدا یہیں کی زبان سے ہوئی ہے مگر اس کے خط کو لانے والے پردیشی تھے۔ بھاشا خط کو اُردو کی بجائے رائج کرنا نہایت غلط پالیسی تصور کرتا ہوں۔ سودیشی خیال اچھی چیز ہے لیکن بیرونی اشیاء کے ساتھ بیرونی خیالات اور خیالات کی سواری میں نئے الفاظ اور خطوط تک کو بائیکاٹ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم سودیشی محبت پہ ملکی ترقی کو بھی قربان کرنا چاہتے ہیں اور غیر ملکی خیالات کو خواہ کیسے ہی ضروری اور مفید ہوں حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور چونکہ ایسا خیال حقیقت میں دشمنی ہوتی ہے کہ محبت اسلئے میرا خیال ہے کہ محبانِ وطن اگر ٹھنڈے دل سے غور کرینگے تو ملک

کے اس نقصان کو محسوس کرنے میں ناکام نہ ہونگے اور ضرور اتفاق کرینگے کہ جہاں زبان کو وسعت دینے کے لئے اور قدامت کے دفینوں کو دریافت کرنے کے لئے سنسکرت کی ضرورت ہے وہاں اس کے ساتھ ہی بیرونی مفید خیالات کو حاصل کرنے کے لئے غیر ملکی زبانوں کو حاصل کرنے کی اور پھر سنسکرت اور غیر زبانوں کے فواید سے ملک کو آراستہ کرنے کے لئے ملک کی متفقہ لنگوا فرینکا جسکا کوئی نام نہیں مگر اس کے مناسب حال خط کا نام اُردو ہے اسکو حاصل کرنے کی سخت ضرورت ہے اور ان سب ضرورتوں کو پورا کرنے میں جس قدر کوتاہی ہوگی اسی تناسب سے ملکی ترقی کو نقصان پہنچیگا۔

میں اس وقت تک جو باتیں لکھ چکا اُن سے اگر کسی کو اختلاف ہوگا تو ملک میں بعض کو میرے ساتھ اتفاق بھی ہے۔ لیکن اب میں آپ سے کچھ وہ باتیں کہنی چاہتا ہوں جو غالباً میرا ہی خیال ہے۔ یعنی میں نے اس وقت تک خیالی طور پر سنسکرت کی ضرورت کا ذکر کیا ہے اور اسی ضمن میں اردو بھاشا کا قصہ چھیڑ دیا تھا جسکی ایک ضرورت میں بیان کر چکا ہوں کہ اس سے ہر قسم کے علوم کو اشاعت دینے میں مدد ملیگی۔ اب میں عملی طور پر سنسکرت کی اشاعت اور متفقہ میڈیم کے ایک اور فائدے کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ملک میں سنسکرت کی اشاعت ایک تو آرٹس فیکلٹی کے امتحانوں میں سنسکرت کو سیکنڈ لنگویج کے طور پر لینے سے ہو رہی ہے اور ایک پنجاب یونیورسٹی یا ہندوستان کی کسی ایک آدھ اور یونیورسٹی میں خالص سنسکرت کے امتحان لئے جاتے ہیں اور کچھ الہ آباد یا کاشی وغیرہ میں سنسکرت کے پرائیویٹ امتحان بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے آرٹس فیکلٹی کے امتحانوں میں جو لوگ سنسکرت لیتے ہیں میں انکی نسبت فارسی اور عربی پر قیاس کرکے کہہ سکتا ہوں کہ انکو سنسکرت کی واقفیت کچھ بھی نہ ہوتی ہوگی اور وہ لوگ بالعموم کسی ناخواندہ مطلب سمجھنے یا کسی کتاب کا مطالعہ

کرنے کے قابل ہوتے ہونگے کیونکہ ان کی تعلیم ہی ناقص ہوتی ہے۔ ہاں جو لوگ کسی زبان میں ایم۔ اے پاس کرتے ہیں وُہ البتہ کسی قدر زبان پر قدرت حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن اُن سے بھی مانگا جاتا ہے کہ اپنے کورس کا انگریزی میں ترجمہ کریں اور اس لئے وُہ پڑھتے تو سنسکرت ہیں لیکن اس تمام عرصے میں اُن کی توجہ سنسکرت کے مقابل انگریزی الفاظ اور محاورے تلاش کرنے میں صرف ہوتی ہے اور یُوں وہ سنسکرت لیکر بھی بڑا وقت انگریزی کے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں اور اس صورت میں نام بیشک سنسکرت کا بدنام ہوتا ہے مگر ظاہر ہے کہ نصف سے زیادہ وقت کو انگریزی پر صرف کرنے میں سنسکرت لیاقت کی کس قدر کمی ہوگی اور اس لئے سنسکرت پڑھ کر اس کے علوم کی تحقیق تاریخی واقعات کی تلاش وغیرہ بڑے بڑے فرائض کی اُمید۔ امرِ فضول ہے۔ کہ آرٹس فیکلٹی والوں سے نہ رکھنی چاہیئے۔ ہاں جو لوگ خاص سنسکرت کے امتحان دیتے ہیں۔ اگرچہ کورس انکا بھی محدود ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے لیکن وُہ اب بھی یا امتحان میں کسی قدر اصلاح کرنے کے بعد مطالعہ کی قوت اعلیٰ درجہ تک پیدا کرسکتے ہیں اور اگر چاہیں تو سنسکرت کے تمام خزانوں کو کھود کر نکال لیں۔ مگر انکی حالت یہ ہے کہ ادھر تو سنسکرت کے سوا وُہ کسی اور زبان سے آشنا نہیں ہوتے اور ادھر انکے واسطے ملک میں کوئی گنجائش نہیں۔ اوّل تو اُن بیچاروں کو مندر سے باہر نکلنا نہیں چاہیئے اور اگر بڑی مہم سر کریں تو سکول میں ٹیچر ہو جائیں لیکن تنخواہ ایف۔ اے۔ بی۔ اے کی تو کہاں انٹرنس پاس کو جس قدر مل سکتی ہے۔ شاستری پنڈت کو اس سے بھی کم ملنا حق بجانب ہے اور سررشتہ تعلیم میں سب سے کم ریٹ عربی سنسکرت کے اُستاد کا ہوتا ہے اور جب سنسکرت حاصل کرنے والوں کی یہ عزّت ہو تو فرمایئے ملک میں سنسکرت کی اشاعت اور اس کے فوائد سے ملکی ضرورتوں کا سرانجام کیونکر ہو اور جو لوگ

سنسکرت پڑھکر ایسی ذلیل حالت میں بسر کرتے ہیں وہ مطالعہ کا سامان کہاں سے لائیں۔ دلی اطمینان کیونکر حاصل کریں اور علمی واقفیت بڑھانے اور اس سے ملک کو فائدہ پہنچانے کا موقعہ کہاں سے پائیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ علم کو علم کے لئے پڑھنا چاہیئے اور بیشک۔ درست ہے لیکن عموماً ایسا ہوتا نہیں اور ایسے پاک ارادے اگر ملک میں فی لاکھ ایک شخص بھی رکھتا ہو تو ملک کو علم کا عاشق کہنا چاہیئے۔ ورنہ ہر زمانے میں اور سب ملکوں میں علم کا شوق اور اسکی اشاعت نہ دھرم کے خیال سے اور خدا کے واسطے بلکہ اکثر اہل ملک کی قدر افزائی سے ہوا کرتی ہے اور اگر یہ ہو تو لاکھ علم کی برکتیں اور ضرورتیں جتائی جائیں اور لوگوں کو دل سے معافی لیں یہ ہوا نہیں کرتا کہ بھوکے پیٹ اور ذلیل حالت والے دماغ کو علمی دولت سے بھر سکیں۔ اور اس لئے اگر یہی لیل و نہار ہیں تو سنسکرت کے پرچار اور بھارت دیش کی انتی کا نام تو ہوگا کام کی امید نہیں۔ اور ایسی غرض حاصل ہونے کی صورت جب ہو سکتی ہے کہ ایک تو سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے والے کسی قدر ہیں بلکہ کام چلانے کے قابل انگریزی اور نیز اردو لازمی قرار دے لیں تا وہ پروہتی اور ٹیچری کے سوا دنیا کے اور کام کرنے کے بھی قابل ہو جائیں اور ادھر ملک یہ غور کرنے کی تکلیف گوارا کرے کہ ایک بی۔ اے کو جب تحصیلدار یا ای۔ اے سی بنایا جاتا ہے تو اس کام میں اس کی ٹرگنامٹری یا فزکس اور کیمسٹری کام نہیں دیتا اور مختلف علوم حاصل کرنے سے جو قوت فیصلہ پیدا ہو جاتی ہے اسکو کافی سمجھ کر ان سے قانون کا امتحان لیا جاتا ہے اور ذمہ داری کے کام سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ پس شاستری جس نے موجودہ فزکس اور کانکس کا درد سر نہیں خریدا اس میں اگر نقص ہے تو اسی قدر کہ جن مضامین کو پڑھ کر تحصیلداری کے عرصہ میں بھولنا تھا اس نے پہلے ہی سے نہیں پڑھے اور ادھر فلاسفی اور دیگر ایک پیچ رکھنے والے مضامین

اس نے سنسکرت میں ایسے حاصل کرتے ہیں جن سے قوتِ فیصلہ کو ترقی ہو اور پھر اگر اسکے ساتھ وہ اردو اور انگریزی کی واقفیت بھی رکھتا ہو تو طلب انصاف کے رو سے تحصیلداری یا اکسٹرا اسسٹنٹی کا حقدار ہونے کے لئے بی۔ اے کو اس پر کون ترجیح حاصل ہو اور کیوں کاروبار کی تمام ایسی شاخوں میں جنکے لئے کسی خاص علم کی ضرورت نہیں اور صرف عالمانہ دماغ درکار ہے یا مروجہ زبان کی مہارت تمام ایسے لوگوں کو برابر نہیں سمجھا جاتا جنہوں نے اپنی عمریں علمی مشغلوں میں لگا دی ہیں اور زبان سے واقفیت رکھتے ہیں۔

قدیم زبانوں کا شوق یا انکی ضرورت کچھ ہندوالوں کو ہی نہیں کہ انو کھے سمجھ کر کوئی انکی بات نہ سنے۔ یورپ میں بھی لیٹن اور گریک مردہ زبانیں ہیں مگر انکو حاصل کرنے والے ایسے ہی زندہ سمجھے جاتے ہیں جیسے اور لوگ۔ نہ انکو لیٹن اور گریک جاننے کے قصور پر دنیا کے کسی کام سے محروم کیا جاتا ہے اور نہ لیٹن یا گریک کا پروفیسر پروفیسر آف انگلش سے کم تنخواہ پاتا ہے اور اس طرح پر اسکے کام کو عزت میں اوروں کے برابر سمجھنے سے وہ لوگ قدامت کے جواہر تلاش کر کے علمی دولت کو بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ مگر یہاں تو بالکل اسکے خلاف عمل ہو رہا کہ قوم کو عملی طور پر اس میں کم عقل ہے مگر تعجب تو یہ ہے کہ اس حاجت کا احساس بھی کسی کو نہیں ورنہ جہاں کانسٹیبل۔ قلی۔ دفتروں کے ادنیٰ کلرک وغیرہ کیطرف اکثر ایسے کاموں کے لئے جن میں عالمانہ قابلیت کی ضرورت نہیں اجرت کی کمی اور نا قدردانی کا چرچا کیا جاتا ہے اور اس قسم کے مضامین پر اکثر توجہ کی جاتی ہے وہاں سنسکرت علوم میں اعلیٰ قابلیت پیدا کرنے والوں کی ذلیل حالت پر کسی کو دل میں افسوس ہوتا ہے تو زبان پر کیوں نہ آتا اور جن کے ہاتھ میں یہ کام ہے انکو اصل حقیقت سے آگاہ کیوں نہ کیا جاتا۔

پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سنسکرت زبان اور اس کے علوم میں بہت سی خوبیاں ہیں جو ملکی ترقی میں مدد دیسکتی ہیں اور نیز اگر تسلیم کر لیا جائے کہ اسکی اشاعت ایک ملکی اور قومی ضرورت ہے تو پھر ضرور اس کے لئے کوشش بھی ہونی چاہئے اور وہ کوشش یہی ہوسکتی ہے کہ ایک تو جو لوگ اس کا شوق اور مذاق رکھتے ہیں انکے لئے تعلیم کا سامان بڑے پیمانہ پر مہیا کیا جائے اور خواہ موجودہ یونیورسیٹیوں سے کام لیں یا الگ انڈین یونیورسٹی بنائیں سنسکرت کو سیکنڈ لنگویج کے طور سے حاصل کرنے پر اکتفا نہ کیجائے بلکہ ایک جماعت کو خاص اسی کام پر لگایا جائے البتہ اگر ایک طرف وہ لوگ سنسکرت سے محبت رکھیں تو ساتھ ہی انگریزی سے نفرت اور اُردو سے دشمنی رکھنی بھی چھوڑ دیں تا وہ دیگر اہلِ ملک کے ساتھ مل کر کام کرسکیں اور دوسری طرف انکے لئے ایسی کوشش کیجائے کہ ملکی اور مالی کاروبار کے لئے برابر کے مستحق قرار پائیں اور اس طرح فارغ البال اور عزت و احترام سے بہرہ ور ہو کر حوصلہ مندی کے ساتھ عالمانہ خدمات کو سرانجام دیسکیں اور اگر یہ نہ ہوگا اور اسی طرح پر کچھ لوگ مندروں میں بیٹھے سنسکرت کو رٹا کرینگے تو نہ انکی آسمانی بولی کوئی سمجھ سکیگا اور نہ افلاس میں بسر کرنے کے سبب انکو علمی ترقی کا حوصلہ ہوگا +

محمود علی (از کپورتھلہ)

اخبار مشرق کی رائے ہے کہ رسالہ عصمت خواتین کیواسطے اردو میں بینظیر ہے ہم سید جالب صاحب دہلوی ایڈیٹر وکیل فرماتے ہیں کہ عصمت زنانہ رسالوں میں اول نمبر پر آگیا ہے کاغذ، لکھائی چھپائی اعلی درجہ کا سرورق سنہری بیل سے مزین - قیمت اول ۱ / تصویر - قیمت دوم ۱۲ / بلا تصویر

منیجر عصمت دہلی سے طلب کیجئے +

غنیمت

"غنیمت از حاکیانِ ہند غنیمت است" یہ فقرہ محمد افضل سرخوش صاحب کلمات الشعرا کا اتنا مقبول ہوا کہ ہر تذکرہ نویس نے مولانا غنیمت کا ذکر کرتے ہوئے ضرور دُہرایا۔ اہلِ ایران ہندیوں کی فارسی پر ہمیشہ ہنستے رہے ہیں، پھر جب وُہ کسی ہندی کے کلام کی داد دینے پر مجبور ہو جائیں تو وُہ شخص واقعی خوش نصیب سمجھا جائیگا۔ مولانا غنیمت نے زمانہ اچھا پایا۔ یعنی آخر دورِ عالمگیری۔ اسوقت ہندوستان اپنے شعرائے عالیمقام پر ناز کرتا تھا۔ میرزا عبدالقادر بیدل جو بلندیٔ مضمون، حسنِ بندش، خوبیٔ الفاظ اور نزاکتِ خیال میں یکتائے فن تھے۔ اسی انجمنِ سخن کی شمع روشن تھے۔ میر محمد زمان راسخ موجود تھے۔ جو ندرتِ مضامین و شوکتِ الفاظ میں بے مثل گذرے ہیں۔ ناصر علی کی اُستادی کا ایک جہان قائل تھا اور بھی بہت سے ایسے شعرا دارالخلافہ دہلی میں موجود تھے جن کی بدولت فارسی شاعری معراجِ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔

مولانا غنیمت کا نام محمد اکرم ہے۔ پنجاب ان کا وطن تھا۔ انکی نسبت مشہور ہے کہ بچپن سے لیکر جوانی تک کا زمانہ جہالتِ محض میں گذارا۔ ایک حرف بھی نہ پڑھا نہ لکھا۔ بیس بائیس برس کی عمر میں ایک فقیر صاحب باطن کی توجہ ہوئی تو یہ خاک سے اکسیر ہو گئے۔ جب سے ان کی شہرت بین الاقران اول اول ہوئی۔ وُہ انکی مثنوی نیرنگ عشق ہے۔ جس میں اُنہوں نے قصہ دو عاشق و معشوق کا لکھا ہے۔ معشوق آخر میں بیوفائی کر کے عاشق سے جُدا ہو جاتا ہے

اور عاشق عشق مجازی کی حد سے گذر کر عشق حقیقی کے دریا میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہ مثنوی ہندوستان میں نہایت مقبول ہوئی۔ اس کے بعض اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ عشق کا مضمون اس مثنوی میں ایک بڑے دردانگیز اسلوب کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک استادانہ شان بھی لئے ہوئے ہے۔ بعض بعض ابیات واقعی نہایت بلند پایہ ہیں۔ بندشیں عموماً اچھی ہوتی ہیں اور رعایت لفظی و معنوی کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ یہاں ہم چند ابیات جو اس مثنوی کی جان ہیں درج کرتے ہیں۔ ابتدا حمد سے ہوئی ہے اور بیت اول میں صنعت براعت الاستہلال خوبی کے ساتھ صرف کی گئی ہے۔ عزیز عاشق کا نام ہے اور شاہد معشوق کا

بنام شاہد ناز کخیالاں   عزیز خاطر آشفتہ حالاں

(ابیات دیگر در حمد)

نسیم بوستانش آہ سرد است   گل گلزار عشقش رنگ زرد است
غبار کاروانش زنگ جستہ   جرسہا بانگ دلہائے شکستہ
خرد در فکر او مجنون و مدہوش   جبیں از سجدہ اش لیلی در آغوش

شاہد جب پیدا ہوتا ہے اور اس کا نام شاہد رکھا جاتا ہے تو مولانا غنیمت فرماتے ہیں

بہار جلوہ اش را عام کردند   رخش دیدند و شاہد نام کردند

شاہد ایک طفل پریزاد تھا۔ ارباب نشاط کا ایک گروہ اسے اپنے ساتھ رکھنے لگا۔ شاہد کی مطربی کا انداز یوں بیان ہوتا ہے۔

دل عشاق مست ناز مطرب   کباب شعلۂ آواز مطرب
نبودہ در کف آن ناز پرور   بجز عاشق نوازی ساز دیگر

شاہد ان ارباب نشاط کے ساتھ عزیز کے شہر میں پہنچتا ہے۔ اس کا حسن

روان شد سوئے مشتاق جگر ریش | مراد خاطر دیوانہ خویش
روان شد از پئے عاشق نوازی | تبسم بالبش در بوسہ بازی
پشیماں گشتہ چشم از کم نگاہی | زمژگاں صد زباں در عذر خواہی

شاہد عزیز کے ساتھ رہنے لگتا ہے عزیز بغرض تعلیم اُسے مکتب نشیں کرتا ہے۔ مکتب طفلان پریزاد کا مجمع ہے جب شاہد پہنچتا ہے تو قیامت ہی ہو جاتی ہے۔ ترانۂ غنیمت قابل دید ہے الحق سحر کاری کی ہے۔

اگر باشد معلم خود فلاطوں | باندک روز خواہد گشت مجنوں
اگر امینت طفل مکتب او | رسد ہر شب بگردوں یارب او
ازیں مکتب تیں طفلاں لبید | یام ماکہ بہ گوید با خوند

- - - - -

سبق خواناں حرف سیرفانی | دعا ام سنسنہ لوح آستانی

- -

یکے بیماری حسیتش بہانہ | معلم در دعائے عاشقانہ
یکے را ماند لب از حرف خاموش | سبق چوں نام آشنا فراموش
بسرعت آں دگر خواں سبق را | نخواندہ صفحہ گرداندہ ورق را

- - - - - - -

- - - - - - - - -

نظر کردند چوں بر روئے شاہد | شدند آشفتہ تر از موئے شاہد
ز طفلاں ہر طرف برخاست فریاد | کہ یاراں آتشے در مکتب افتاد

شاہد نے اپنے مکتب کی صورت کاہیکو دیکھی تھی - حیران رہجاتا ہے - مولانا غنیمت پھر قیامت کرتے ہیں جو فرماتے ہیں -

بُتِ نا دیدہ مکتب آفتِ ہوش | برنگِ غنچۂ گل ماندہ خاموش
چو از روئے حجابش لب لب ماند | شنیدم من کہ استادش ہمی خواند
"الٰہی غنچۂ امید بکشا | گلے از روضۂ جاوید بنما"
اثر جو سفید یعنی غنچہ واشد | دہانِ بستہ اش حرف آشنا شد
شد اول از سر بیتابی دل | بیک بسم اللہ اش استاد بسمل

جب شاہد پڑھ کر مکتب سے گھر جاتا، تو اس کی جدائی میں مکتب کا بُرا حال ہو جاتا تھا -

زمکتب چوں شدے آں سرو آزاد | بروئے خویش میزد سیلی استاد
ہمی شستند طفلاں تختۂ خویش | بآبِ چشم و داغِ سینۂ ریش

اب اس مکتب میں خود مولانا غنیمت تشریف لیجاتے ہیں - ترنم دلنواز شنیدنی ہے ؎

شنیدم دوستے از طرز آشنائی | کہ از مکتب نکوتر نیست جائے
خصوصاً مکتبِ عشق آفرینے | مقام ہمچو شاہد نازنینے
مرا روزے بدل شوق آشنا شد | کتابِ صبر را شیرازہ وا شد
بامید تماشائے نگارے | نمودم جانبِ مکتب گذارے
برآمد بر درِ مکتب خرد شم | کہ من سیپارۂ دل مینروشم
بگوشِ شاہد آمد نالۂ من | بغل پرورد تجنالۂ من
مرا از مہر بانہا درون خواند | خرد از ہمرہی بیرون درماند
ز سر پا کردہ رفتم یک قدم پیش | بلا گردانِ لطف طالعِ خویش

بگفتا پیشتر آ۔ پیشتر رفتم　　تکلف برطرف۔ از خویش رفتم!
ز دستِ من بجام غوا زبر بر داشت　　غلط گفتم۔ بجیدن ناز بر داشت
ز مہر او دل غبارش را بر افشاند　　پس آنگہ سوئے اخلاص بخواند
پسندش کرد و گفتا۔ من خریدار　　بگفتم۔ ار شود طالع مددکار
بگفتا قیمتش۔ گفتم نگاہے　　بگفتا کمتر ک۔ گفتم نگاہے!

مدّت تک عریز کے ساتھ رہنے کے بعد شاہد کچھ دنوں کے لئے وطن کو جاتا ہے۔ رخصت کا سماں جانگداز تھا۔ بیانِ غنیمت سُنیئے۔

عزیز آمد بہنگام سواری　　عنانِ دل بدستِ بیقراری
گہے بیخویشتن میکرد فریاد　　رکاب آسا بپایش بوسہ میداد
ازاں سو گریہ طوفان تلاطم　　وزیں سو آب در چشم ترحم
ازاں سو التماسِ چارہ سازی　　وزیں سو وعدۂ عاشق نوازی

رفتہ رفتہ شاہد خود عاشقی پیشہ ہو جاتا ہے۔ اور ایک پری جمال لڑکی پہ مرنے لگتا ہے۔ اس حُسن کی دیوی کا سراپا جامۂ غنیمت نے بڑی خوبی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ چند شعر یہاں درج ہوتے ہیں جو بلاغت کے بہترین نمونے ہیں۔

نہاں در گیسوئے او لیلۃ القدر　　عیاں از جبہۂ او مطلع الفجر
ز مژگاں چنگل شاہین تقدیر　　ربودہ دل[1] ز دستِ مرغ تدبیر
دہن گفتم ار سیدہ از غنچہ بوئے　　ندیدم من۔ شنیدم گفتگوئے
حنائی پنجہ اش خورشید دلہا　　ہلالِ ناخنش عیدِ تماشا
بصوے سینہ اش سیب و بادہ　　علاجِ قوتِ ضعفِ نظارہ

[1] یعنی دل را ۱۲

آخری شعر بہت مشہور ہے لیکن راقم کے خیال میں لفظ "قوت" مصرعِ ثانی میں بیکار ہے۔

اس لڑکی کے عشق میں شاہد عزیز کو فراموش کر دیا ہے اور اسکو اُس کی حالت پر چھوڑ کر چلا جاتا ہے وہ صدمۂ جدائی سہتا جاتا ہے اور چونکہ عشق پاک رکھتا تھا عشق مجازی کا مرحلہ طے ہو کے عشق حقیقی سے آشنا ہو جاتا ہے۔ خاتمۂ کتاب میں مولانا غنیمت اپنے عشق میں ڈوبے ہوئے کلام کی نسبت فرماتے ہیں

قلم ننوشت جز بیتابیِ دل   دوانم بود جز بسملیِ مرغِ بسمل

ننوشتم چوں حدیثِ عاشقی سر   پر پروانہ شد اوراقِ دفتر

واقعی دردِ عشق ہی کی چاشنی تھی کہ کلام میں حلاوت پیدا ہوئی اور یہ مثنوی مقبولِ خاص و عام ہوئی۔ دیوانِ غنیمت بھی قابلِ سیر ہے لیکن اس میں مثنوی کی بات کہاں۔ اشعار عموماً بے مزہ ہیں اس لئے کہ رنگینی الفاظ کی طرف مولانا کی توجہ بیشتر مائل رہی ہے۔ طرزِ بیدل میں فروغ پانا آسان نہیں۔ پھر بھی مولانا غنیمت غنیمت ہیں کہیں کہیں خوب کہہ گئے ہیں۔ چند شعر جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں یہاں درج ہوتے ہیں۔

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدن ہا   کہ می بالد بخود این راہ چون تاک از بریدن ہا

بامیدے کہ خواہد جلوہ گر شد آتشیں شوخے   سپند ما غنیمت در گرہ دارد تپیدن ہا

دریں بساط بود بے سبب حریفاں را   بسانِ مہرۂ شطرنج خانہ جنگیہا

تو رفتی و نمک خوانِ دیگراں شدہ   کبابِ دل شد ازیں میہماں نوازی ہا

کشتیِ مے روشن پیشِ میگساران است ماہِ نو میدہ کبادِ عیدِ بادہ خواران است
تیغِ موجِ مے ساقی میتواں کشید امروز خونِ تو بہا در کیست تعاقِ یاران است

کشید ہر کہ چو فرہاد مے ز جامِ محبت بکاست آبِ رُخِ تیشہ شیشہ شیشہ شراب است
بکامِ خواہشِ دردی کشانِ بزمِ محبت شکستہ ریزۂ ہر شیشہ شیشہ شیشہ خراب است

جستم بزورِ طاقت زیر دست افتادہ است ہمچو موج از خود بکار من شکست افتادہ است
طاقتِ برخاستن چوں گرد لمسا کم نماند خلق میداند کہ میچو رودہاست مست افتادہ است

از بس خیالِ من شدہ لبریز جلوہ اش ہر جا کہ سر بسجدہ نہم نقشِ پائے اوست

تا زبانم تو بر دست ثنا خوانِ خود است کرد تا یاد تو دل بندۂ احسانِ خود است

میدہد بوئے کہ طاقت رنگ می بازد ازو دستِ گل پنداری است بر گریبانِ تو باد

نشاطے کز وصولِ نامۂ پیغامِ او دیدم نہ در تحریر می گنجد نہ در تقریر می آید

ز خلق آزردہ گشتم دلِ تعلق ز خویش حاصل شد غبارِ خاطرِ آخر توتیائے دیدۂ دل شد

بود مسودہ سرنوشتِ اہلِ وفا ز سجدۂ تو غبارے کہ بر جبیں باشد

بزمِ ما از بادۂ گلفام روشن می شود / خانۂ ما از چراغِ جام روشن می شود
از پئے اظہارِ غفرانِ معصیت درکار بود / نامۂ شمع از دو دامانِ تمام روشن می شود

بوسہ لے او ہم آنقدر آورد ہجوم / کز لبِ لعل ترا وست دشنام نبود!

نسیم آورد پیغامش ہمین گردِ دلی دارد / دماغم بود بوئے از گلستاں دیدنی دارد
اس زمین میں راقم کا بھی ایک مطلع ہے جس کے یہاں عرض کرنیکی جسارت کرتا ہوں۔
چو راحت نیست حاصل خوابِ راحت دیدنی دارد / گلِ اُمید از باغِ تصور چیدنی دارد

خوباں ز روئے ناسپاسی سرِ مرا / با خاکِ کوئے خویش برابر نوشتہ اند

یاد آیا میکدہ داغِ عشق آہنِ تو بود / بر کبابِ ما نمک از شورِ حسینِ تو بود

معلوم تواں کرد کہ جولانگہِ شوخی ست / فریادِ دل از جنبشِ پائے خبرم داد

حدیثِ حالِ غزا تا صد ز لبہائے کہ میگوید / کہ دل صد بوسہ لذت میکند حاصل ز پیغامش
"صد بوسہ لذت" کی ترکیب یہاں کس قدر دلنشیں اور پُر لطف ہے۔

ز دیوانِ قیامت انتخابِ مصرعے کردم / نظر افتاد چوں بر جلوۂ سروِ خرامانش

ہنوز زخمِ جگر منظرِ تجلی تست / بکوئے وصلِ تو راہے کہ کاشتم دارم

بالفت سجدۂ پنہانی او بس کہ بیکردم　　زمین نقش اثر کافتم زیر جبین من!

بشوق عارض چشم امید عاشقان روشن　　ساد جلوہ حسن دست دعا دستان روشن

ازبسکہ نازکست قد دارائے او　　گل شیشہ شکستہ بود زیر پائے او!!

معشوق کی نزاکت کا مضمون اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔

مستم ازاں نگاہ کہ آید برور حشر　　بوئے شراب از دہن داد خواہ او

کردہ ام از مہر لب نغمہ با نہاد گرہ　　بستہ ام چون غنچہ سوسن زبانہا در گرہ

آتشیں روئے نظر بر جلوہ محتاجے نکرد　　چوں سپندم ماند آشوب فغانہا در گرہ

"جلوہ محتاجے" کی ترکیب قابل تحسین ہے۔

ندارد شوخی ایں رنگ اشک ہیچ مجنونے　　تو در دل بودہ ظالم ہما نا کردہ خونے!

چراغ نالۂ مجنوں کہ روشن کردہ بود امشب؟　　کہ صحرا از شکستِ رنگ لیلیٰ داشت مہتابے

صدائے ریزش خونِ دلم مدہوش میدارد　　زخونِ لب کبابِ چو بیتش در ام مے نابے

چو چشمم بود امشب خوابگاہ یار آغوشم　　نمیدانم بخوابش دیدہ ام یا دیدہ ام خوابے!

زقتل بیقراران آں چنانش شاد می بینم　　کہ پنداری غنیمت کیمیا گشتہ سیمابے

رضا علی وحشت (کلکتوی)

خدائی فوجداری

محب کا رعب ہو گیا شہر میں
[illegible]

خدائی فوجدار یعنی (Don Quixote.) کے
قصے اور لطیفیات یورپ [illegible] عام اور مشہور
ہیں۔ ایشیائی حصوں میں بھی اُس کی شہرت ہے۔ جہاں جہاں خدائی
فوجدار کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ لوگ تعجب اور خوشی سے سُنتے ہیں۔
کوئی خدائی فوجدار کی حماقت پر تعجب کرتا ہے اور کوئی اُسے شیخ چلی
سے نسبت دیتا ہے۔ [illegible] کے طبع سے خدائی فوجدار کا ترجمہ
جب سے شائع ہوا ہے ہندوستان میں بھی اُس کی خاص شہرت ہے۔
سچ پوچھو جہاں جہاں اُن کا ذکر ہوتا ہے لوگ ہنستے اور ٹھٹھا
کرتے ہیں۔ اور اکثر کی نگاہوں میں خدائی فوجدار کی حرکتیں اور کارنامے
بزدلی اور حماقت کا نمونہ ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہہ اُٹھتے ہیں کہ کیا یورپ میں
بھی اس قسم کے بے وقوف ہوا کرتے ہیں اور اس سفید سرزمین سے بھی
اس قسم کے سیاہ دل انسان پیدا ہوتے ہیں۔
اگر بالاستیعاب خدائی فوجدار کا قصہ اور کہانی پڑھی جائے تو میرے
خیال میں اس سے بآسانی یہ پتہ لگ جائیگا کہ ایشیا بالخصوص اہل ہندوستان کا
خدائی فوجدار کی ہستی پر پھبتیاں اڑانا بجائے خود ایک حماقت ہے۔ کیونکہ

یورپ میں تو صرف یہی خدائی فوجدار صدیوں کے بعد ہوا ہے اور مصداق اس کے کہ ہزاروں داناؤں اور دانشمندوں کی ایک جماعت میں ایک بیوقوف کی بھی عزت اور آؤبھگت ہوتی ہے۔ خدائی فوجدار کی یورپ کی دانشمند مجلسوں میں پھر بھی ایک عزت اور توقیر ہے۔ کیونکہ اس کا وجود اُن کے لئے ایک نیک مشغلہ اور موجب تفریح ہے۔

وائے بدقسمتِ ہندوستان کہ اس کی گلی گلی کوچہ بکوچہ اور گھر گھر خدائی فوجدار کروڑوں پائے جاتے ہیں۔ ہر کوچہ اور ہر کنبہ اور ہر مجلس میں بیسیوں خدائی فوجدار ہوتے ہیں۔ اُن کی اس سرزمین میں ایسی کثرت ہے کہ یورپین خدائی فوجدار کی رُوح بھی اُن سے راہ و رسم رکھنا اپنے لئے ایک مصیبت اور نحوست سمجھتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہندی خدائی فوجداروں کی نگاہیں سپین کے خدائی فوجدار اور اس کے تفریح نما کارناموں پر جا پڑتی ہیں۔ لیکن اپنی نحوست اور ذلیل نکتہ چینیوں اور کارستانیوں پر نگاہ تک نہیں پڑتی۔ کہ جن سے خدائی فوجدار کیا بُری رُوحوں کی جان بھی لرزتی ہے۔ خدائی فوجدار کے کام اور کارستانیاں تو آخر کوئی بُرا بھلا اصول رکھتی تھیں۔ ہندی فوجداروں کے کارنامے تو سرے سے ہی ذلت لئے ہوئے ہیں۔ اُن میں تفریح کیا تفریح کا نام بھی نہیں۔ اُن کے ذکر سے جان کانپتی اور دل و دماغ پر نحوست چھا جاتی اور زندگی دُوبھر ہو جاتی ہے۔ یورپین خدائی فوجدار کی زندگی تو نیک کاموں سے بھی گاہ گاہ ٹکراتی ہوگی۔ یہاں بدقسمتی سے از صبح تا شام سوائے مصیبت اور بداندیشی کے اور کوئی کام ہی نہیں۔

آپ اب تک یہ نہ سمجھے ہونگے کہ ہمارے مُلک میں اس قدر خدائی

فوجداروں کی کثرت کیسے ہو گئی اور وہ یہاں کثرت کیوں اور کس گلی کوچہ اور سڑک میں
ہیں تعجب نہ کیجئے۔ جس طرح چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں کی کثرت محتاج دلیل
نہیں اسی طرح خوش قسمتی سے ان ہندی خدائی فوجداروں کی کثرت بھی
محتاج بحث نہیں۔ اگر ذرا غور کرو گے تو اردگرد ہی صدہا خدائی فوجدار
دکھائی دینگے۔ خود اپنی ہی جماعت اور اپنے ہی گروہ میں بیسیوں خدائی
فوجدار نکل آئینگے۔ اگرچہ آپ اُن میں خدائی فوجدار سے بھی بڑھ کر بُرائیاں
اور کمزوریاں پائینگے لیکن اُن کی نگاہوں میں اُن کا عمل اور اُنکا طریق محض
دُور اندیشی اور حکمت ہو گا۔

یورپین خدائی فوجدار کی زندگی اور تفریحی کاروبار دُنیا کے لئے سوائے
اس کے کہ موجب تفریح ہوں اور کوئی اثر نہیں رکھتے۔ لیکن ہندی خدائی
فوجداروں کی ساری زندگی اپنے واسطے وبال اور دوسروں کے لئے اکثر
قیامت ہوتی ہے۔ ملک کے واسطے ایک شرمناک ذلت اور قوم کے لئے
ایک خوفناک ندامت۔ یورپین خدائی فوجدار لوگوں کو ہنساتا اور تفریح کے
موقعہ دیتا تھا۔ لیکن یہ ہندی خونخوار خدائی فوجدار لوگوں کو رُلاتے اور مخلوقِ
خدا کو ہلاک کرتے ہیں۔ خدائی فوجدار اپنے ہاتھ اور اپنے قابو میں صرف
اپنا سادہ دل اور سادہ طبیعت رکھتا تھا اور یہ جماعت چودہ طبق کی کُنجیاں
اور ہفت آسمان کی طاقتیں مسخر کرکے دُنیا اور ابنائے جنس پر حملہ آور ہوتی
ہے۔ غریب مخلوق آرام سے گھروں میں سوتی یا اپنے کاروبار اور مصیبتوں میں
مصروف ہوتی ہے اور اس مقدس جماعت کے نام لیوا بیٹھے بیٹھے نام خدا اس کا
جائزہ لیتے ہیں اور اس قدر ظلم و فسق میں منہمک رہتے ہیں۔ گویا ساری دنیا
کا سرد و گرم انہیں کے سر آ رہا ہے۔ اگر اب بھی آپ نہیں سمجھے تو میں اب

آپ کو ذرا اور تفصیل سے ان جانان ملک اور بیان ان قوم سے آشنا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چھاتی پر پتھر رکھ کر سنئے اور مہربانی سے غور کیجئے کہ وہ ملک اور وہ قوم جن میں اس قسم کے لوگ اور اس اس قسم کی مخلوق ہو کس طرح کسی ترقی اور عروج کی مالک ہو سکتی ہے۔ اور کس طرح اسے ان حالات میں مہذب اور ترقی یافتہ کہا جاسکتا ہے اور کس طرح اس جماعت کے ہونے لوگ آسائش سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ایک پرانا شعر ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

جہاں اس قدر مار آستین اور اس قدر زرد و سیاہ بجتریں ہوں جہاں کوئی زندگی کوئی معاشرت کوئی پہلو کوئی روش نکتہ چینی اور ذلیل حرف گیری اور شرمناک گرفت سے خالی اور محفوظ نہ ہو۔ وہاں آزادی اور بے تعلقی اور بہشت کیا وہ ملک یا وہ قوم اور وہ زندگی تو نمونۂ دوزخ اور مقام حسرت ہو۔ جہاں حسد و بغض و رشک و جلن کی روحیں کثرت سے نشوونما پاتی ہوں۔ جہاں خلوص۔ اتحاد بردباری درگزر اور احساس حسن معاشرت کی روح ہی مضمحل ہو چکی ہو۔ وہاں

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

کا کیا موقعہ اور کیا محل ہو۔ جہاں چغل خوری۔ گلہ جھوٹ افترا۔ مند جزو اخلاق ہوا اور اصلی اخلاق مدت سے ملیامیٹ ہو چکے ہوں وہاں۔

کسے را با کسے کارے نباشد

کا مبارک سماں خواب میں بھی نہیں آسکتا۔ جہاں سب سے اوّل مناقص برائیاں
بدیوں اور کمزوریوں پر ہی نگاہیں پڑتی ہوں۔ جہاں سوائے عیب چینی کے کوئی
اور معیار رسوخ اور محک وقار ہی نہ ہو وہاں انسان کی عزت خوش گزران اور
خوش زندگی کا خیال ہی کیونکر آسکتا ہے۔

یہ شکایت کسی خاص شخص یا کسی خاص گروہ کی نہیں ہے۔ ایک دو چار
پانچ دس بیس ہوں تو کوئی انگلیوں پر گنوائے بھی۔ یہاں ہر باغ کا باغ ہی
مارا ہوا اور آفت زدہ ہے ایک جماعت ہو تو کہیں ایک کنبہ ہو تو نام لیں
ایک خاندان ہو تو اشارہ کریں ایک دوست ہو تو بتلائیں۔ یہاں این خانہ
ہمہ آفتاب است۔ جدھر نظر کرو یہی مرض یہی وبا۔ جہاں سے سنو اسی کا
واویلا اسی کا رونا۔ ہر شخص یہی کہتا پھرتا ہے۔ خلوص نہیں وفا نہیں عہد
نہیں وعدہ نہیں حیا نہیں غیرت نہیں ہمدردی نہیں سوز نہیں حرمت
نہیں الفت نہیں۔

روتی ہے ایک گل کے لئے عندلیب تو
آنکھیں تو کھول سارا چمن کل اجاڑ ہے

ملکی معاملات قومی کشمکش اور یہ ہندو مسلمان جان جوکھوں لڑتے
جھگڑے اور مرتے مارتے ہیں۔ بعض قلم سے ایک دوسرے پر وار کرتے
اور ایک دوسرے کی تخریب کے درپے رہتے ہیں لیکن انہیں یہ خبر تک
نہیں کہ ان کی ذات ان کا ادبار کسی بیرونی آفت اور حملہ آور کی وجہ سے
نہیں بلکہ اندرونی خدائی فوجداروں کی وجہ سے یہ نحوست و ادبار
آرہا ہے ؎

بلبل نہ کوس اپنے نصیبہ کو اس طرح   خود دام بن گئے ترے نغمے ترے لئے

ایک خدائی فوجدار ہو تو اس سے کوئی نپٹے بھی۔ جہاں قوم کی قوم چھوٹے بڑے یہ کمال رکھتے ہوں۔ کیا پیش جا سکتی ہے جسے دیکھو اسی دھن میں مگن۔ اسی لئے ہر فرد اسی سُر تال کا شیدائی۔ غریبوں اور عوام پر کیا موقوف۔ خواص اور اُمرا میں یہی عارضہ چھوٹوں میں بھی یہ مرض اور بڑوں کو بھی یہی علت۔ ہر شخص یہ سرپشہ ہاتھ میں لئے پھرتا ہے کہ اُس کو سارے جہان کی عیب چینیوں کا ٹھیکہ دیدیا گیا ہے۔ ہر ممبر قوم کی یہی ڈیوٹی ہے کہ دُوسرے کی عیب گیری کرے اور اس عیب چینی اور خُردہ گیری سے چند منٹوں کے واسطے ایک مشغلہ کی صُورت نکالے۔

خدا کی پناہ جس سرزمین میں اور جس خطہ میں اخلاق اور وسعت اخلاق کی یہ صُورت اور یہ نرخ ہو وہاں کوئی کس دل و گُردہ سے رہ سکتا ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میری اِن خدائی فوجداروں سے کیا مراد ہے اور اگر اب بھی آپ اس منزل تک نہ پہنچے ہوں تو کہئے اور وضاحت کئے دیتا ہوں۔ ہمارے ملک اور ہماری قوموں میں خدائی فوجداروں کی یہ کثرت ہے کہ العیاذ باللہ اسقدر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں کہ انسان کی جان عذاب میں رہتی ہے۔ اگرچہ ایک انسان کی ذات میں سو نیکیاں ہوں لیکن اُس کی ایک لغزش یا ایک گناہ اُس کی تمام نیکیوں کے واسطے ایک وبال ہو جاتا ہے۔ شباب و عنفوانِ جوانی میں اگر بدقسمتی سے کوئی حرکت سرزد ہو تو اخیر عمر تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ شادی۔ بیاہ کی مجلسوں میں اسکا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے اور اُسے ایک شاہی سند نامہ کے طور پر پیش احباب کرتے ہیں۔ اگرچہ غریب عمر خیام نے سیکڑوں سال پہلے ہی یہ کہہ رکھا ہے ؎

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
واں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

لیکن سرزمینِ ہند میں اس کے خلاف خدائی فوجداروں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دنیا میں جس قدر مخلوق پائی جاتی ہے وُہ سب فرشتہ صفت ہونی چاہیے کیونکہ وُہ خود ہی فرشتہ ہیں۔ اگرچہ اُن سے بہ تقاضائے بشریت کبھی کبھی لغزشیں سرزد ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ وُہ خوش قسمتی سے خدائی فوجدار ہیں۔ اس واسطے اُن کی ذاتی کرتوتوں کے واسطے کوئی معیار نہیں ہے۔ میزان اخلاق صرف اَور لوگوں کے واسطے ہے اُن کے لئے کسی میزان اور کسی محاسب کی ضرورت نہیں ہے۔

اِن خدائی فوجداروں کے بُرے بھلے اعمال عملِ تناسخ سے بار بار جامۂ حُسن و زیبائش زیب بر کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے دوسری مخلوق کی لغزشیں ہر دم تازہ دم ہوتی رہتی ہیں۔ حافظ علیہ الرحمۃ نے ان خدائی فوجداروں کے بارے میں کیا اچھا کہا ہے۔

خرقہ پوشانِ ہمگی مست گذشتند و گذشت
قصۂ ماست کہ در کوچہ و بازار بماند
صوفیاں واستدند از گرو مے ہمہ رخت
دلقِ ما بود کہ در خانۂ خمار بماند

کوئی ان خدائی فوجداروں سے پوچھے تم پر یہ کیا مصیبت آئی ہے کہ تم ہمیشہ دوسروں کی بُری بھلی زندگی کا جائزہ لیتے پھرتے ہو۔ اگر دوستانہ و مخلصانہ

ہو تو پھر بھی کوئی بات ہے یہ کیا عیاری ہے کہ خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت۔

مشکلے دارم ز دانشمند محفل باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ہمارے ہندوستان میں بلا تمیز ہندو اور مسلمان کے یہ بات عام ہے کہ ہر شخص دوسرے کی زندگی کے رندانہ پہلو سے ریویو کرنے کا عادی ہے صرف اس واسطے کہ ایک دوسرے کی ہاں کی پردہ دری کی جاوے پردہ پوشی کی رسم ہی ہندوستان یا ان دونوں قوموں سے اٹھ گئی۔ بدظنی اور عیب گیری کا یہ زور ہے کہ کوئی دل اور کوئی محفل اس سے خالی ہی نہیں نظر آتی جسے دیکھو اس آگ میں جل رہا ہے اور اس دوزخ کا ایندھن ہے۔

اگر ایک بھائی کسی دوسرے بھائی سے گفتگو کر رہا ہے تو فوراً دل میں نمک کے چوہے قلابازیاں کھانے لگتے ہیں کہ یا اللہ یا پرمیشر یہ کیا کان پھوسی ہو رہی ہے۔

کوئی دروازہ بند کر کے چاہے قرآن شریف اور وید مبارک ہی پڑھ رہا ہو لوگ یہی خیال کرینگے یا تو کمرہ میں کوئی منصوبہ ہو رہا ہے اور یا کچھ اور خرابات ہے۔ حکام کے ملنے کے واسطے جو جاتا ہے اندر یا باہر والوں کی شکایت ہی کر کے آتا ہے اور ادھر باہر والے اندر والے کی نسبت بھی سو سو صلواتیں سناتے ہیں۔ ہزار نیکی ایک طرف اور ایک لغزش ایک طرف۔ اگر کسی شخص میں کوئی عیب دیکھینگے تو خدا واسطے سارے شہر میں اس کی منادی کرتے پھرینگے۔ ہمیشہ اس نیک کوشش میں رہینگے کہ کسی بھائی کے چلن میں کوئی کھوٹ اور کوئی نقص ملے تاکہ اسے حفظ کرلیں۔ بمصداق کہ شتہ آید بکار کسی موقعہ پر وہ ایک ہتھیار کا کام دے سکے

ایک مجلس میں ہم نوالہ ہم پیالہ ہوتے ہیں لیکن دلوں میں نہ تو خلوص ہوتا ہو
اور نہ ہمدردی اور دلسوزی۔ جب کوئی شخص مجلس سے اُٹھ جاتا ہو تو سارے کے
سارے اسکی غیبت میں زبان کھولتے ہیں اور یہی حال سب کے ساتھ ہوتا ہو۔

ایک دیسی افسر یا اہلکار کہیں تبدیل ہو جائے تو دوسرا اسکا قائم مقام اس
کوشش میں رہتا ہو کہ اس کی غلطیاں نکال کر حاکم بالا کے پیش کرکے اپنی قابلیت
اور دماغ سوزی پر ایک سند حاصل کرے۔

کذب و افترا۔ جھوٹ کی یہ کثرت ہو کہ جہاں کی بیاہ بات بات میں جھوٹ
بات بات میں اضافہ اور تصنع موجودہ زمانہ کے رنگ میں یہ تہذیبی پالیسی ہے
دھرم و مذہب موڑ کر اس قوم کو بھی دیکھو جنہیں بزدلی اور ... کے سمجھتے ہو۔
وہ اپنے بھائی کے واسطے کسی رنگ میں بھی ٹھوکر کا باعث نہیں ہیں بلکہ
ہمدردی اور دلسوزی کا۔

وہ ایک بھائی کی شکایت سننا کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کرتے۔
اُن میں پہلے درجہ کی ... کی اور عمل۔ وہ ایک دوسرے بھائی کی
عزت اور عیب کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ان کی حیا اور حسن اخلاق ہو۔ اُن میں
استقلال و ہمت ہو ... کا عمل تخلقوا باخلاق اللہ پر۔

لندن جیسے شہر میں کوئی اجنبی اگر کسی گھر میں یا کسی خالی مکان میں جا رہے
تو اہل محلہ پوچھتے تک نہیں کہ یہ کون اور کیوں آیا ہو۔ ہاں مصیبت کے وقت
ہمدردی اور مدد کرتے ہیں۔ یہاں کا یہ حال ہو کہ بلا جانے بھی پوچھ لیتے ہیں۔ یہ
حضرت ہیں کون کیوں پھر رہے ہیں۔ کس تاڑ میں ہیں کیوں سرگشتہ لگا رہے ہیں
یہ تو نشانہ کس طرح رہ رو بھی انہیں چہ میگوئیوں میں چلا جاتا ہے۔
ایک انگریز افسر کو کسی دیسی افسر نے چٹھی لکھی کہ فلاں انگریز مجھ سے یوں گستاخی کرتا ہو

صاحب بہادر نے سو دفعہ اپنے بعض دیسی دوستوں سے ذکر کیا۔ کیا ہندوستان میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ ایک انگریز دوسرے انگریز کی شکایت سُن لیتا ہو۔ اگر کوئی دوست خصوصاً کوئی انگریز دوسرے انگریز کے ہاں جا کر کوئی لغزش کھا جائے تو کیا مجال کہ میزبان اسکا ذکر تک بھی کرے۔ ہم میں یہ حال ہو کہ کوئی لغزش ہوئی نہیں تو خود میزبان نے ہی اسکی سارے شہر میں منادی کر دی۔

اس برتے پر تتا پانی لوگ خواہ مخواہ بولشکل بحثوں کی طرف جاتے ہیں سب سے اول ضروری ہو کہ خدائی فوجداروں کا عملہ اخلاقی زور سے کمی میں آئے اور یہ اختیارات اُن سے لئے جائیں اور انہیں سکھایا جائے کہ ہنس اور بُردباری سے زندگی یوں بسر کیجاتی ہو اور یوں مہذب دُنیا کے لوگ بسر کرتے ہیں۔

جبتک ان خدائی فوجداروں کا عملہ ضعیف نہیں ہو جاتا تب تک ہندوستان ترقی نہیں پا سکتا۔ چاہے صدہا سینما اور ردی کے کارخانے جاری کر لو اور پتھر کو موم بنا لو اور گھر گھر کمشنر جج چیف کورٹ اور کونسل کے ممبر ہو جائیں۔ پھر بھی اُن کے ہوتے ہم میں اصلی تہذیب نہیں آسکتی ہے۔ اور اتفاق اور اتحاد اُس صورت میں صورت پذیر ہو گا کہ جب خدائی فوجداروں کی جماعت سنبھل کر چلیگی اور اُن میں صلاحیت کی رُوح نشو و نما پائے گی۔

دی دو بیتم چہ خوش آمد کہ سحر گہ میگفت
بر درِ میکدہ با دف و نے ترسائے
گر مسلمانی ہمینست کہ حافظ دارد
وائے اگر در پس امروز بود فردائے

سُلطان احمد

لالہ ان سے چمن کی سرزمیں ہے — آتشکدہ سے کم نہیں ہے
ہر رنگ کے پھول اور سب سب — محبوب نگاہ سیر بیں سب
کوئی تو ہے زرد کوئی آبی — کوئی اودا کوئی گلابی
کچھ ایسے ہیں جن کا آسمانی رنگ — کچھ جن میں ملے ہوئے کئی رنگ
چھوٹے بھی بڑے بھی ہر وزن کے — جھکتے ہیں ادھر ادھر وزن کے
نکہت دل کش جلوۂ محبوب — یہ بھی تراشی ہیں خوب
جوبن میں ہے لطف وہ ہے تو حسن — گل حسن ہے رنگ حسن بو حسن
میدان ہیں سبزہ زار خوش رنگ — اشجار ہیں برگ و بار خوش رنگ
کچھ پیڑ بڑے تو کچھ ہیں چھوٹے — کچھ ہیں پتلے تو کچھ ہیں موٹے
سیدھے تو کبھی نہیں کہیں پر — ٹیڑھے تو کوئی جھکے زمیں پر
پھیلا ہوا کوئی دل کو مرغوب — جیسے ہو تجھی سے یار محبوب
سمٹا ہوا کوئی اس طرح پر — جس طرح حیا سے جسم دلبر
جنبش میں ہوا سے شاخ پر شاخ — ابروئے بلند دراز ہر شاخ
ابرو میں کبھی کہ شاخ میں بل — پہلو میں جگر کہ شاخ میں پھل
کونپل جیسے کلی نمودار — یا طوطی سبز کی منقار
ہر پیڑ کے پھل کا اک نیا طور — صورت بھی ہے اور رنگ بھی اور
صورت میں ادائے دلفریبی — رنگت میں بہار جامہ زیبی
پتے کہیں سبز اور کہیں زرد — ان پر کہیں داغ اور کہیں گرد
کچھ ایسی رگیں ہیں لال جن میں — باریک رگوں کا جال جن میں
جو لال رگوں سے دل نشیں ہے — پتا نہیں وہ ورق حسیں ہے
سن سن سن سن ہوا کا چلنا — پتوں کا وہ کروٹیں بدلنا

پھل پیڑ میں کھا رہے ہیں جھٹکے | کچھ گر پڑے اور کچھ ہیں لٹکے
کچھ پیڑ میں ہل رہے ہیں اس طرح | صوفی بزمِ غنا میں جس طرح
بیلیں کیا کیا چڑھی ہوئی ہیں | پھیلی ہوئی ہیں چڑھی ہوئی ہیں
پھیلی ہیں وہ اس طرح شجر پر | جیسے لیلیٰ کے بال سر پر
مجنوں کی رگوں کا حال دیکھو | صیاد کے سر پہ جال دیکھو
اونچے اونچے کھجور کے پیڑ | کالے کالے وہ [illegible] کے پیڑ
چھوٹے چھوٹے ببول کے پھول | بوٹے کے ہیں بوٹے پھول کے پھول
زردی ایسی کہ زرد مخمل | نرمی ایسی کہ گرد مخمل
کانٹوں کی بہار جھاڑیوں میں | پھولے ہوئے پھول ڈالیوں میں
جنگل ہے کہیں گھنا کہیں کم | دونوں ہیں مگر عجب کا عالم
سائے سے گھنے ہیں جس جگہ | کم دھوپ سی بستر طلائی
ٹیسو پھولا ہے لال بن ہے | چاروں طرف آگ شعلہ زن ہے
جوگن بنکر بہار نکلی | پہنے پھولوں کا ہار نکلی
گھر سے عیاں جٹاؤں کا حال | جیسے الجھے کھلے ہوئے بال
بو دوشِ ہوا پہ گشت میں ہے | خود پھول ہیں سر دشت میں ہیں
گل اور ثمر کہیں پڑے ہیں | طاؤس کے پر کہیں پڑے ہیں
سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ | معشوق کے پاؤں کی سی آہٹ
پیڑوں پہ وہ صبح و شام کی دھوپ | پتوں پہ وہ زرد رنگ کا روپ
سورج کی چمک سے جلوہ گر برگ | سونے کا ورق شجر کا ہر برگ
آئی ہے جو دھوپ ان سے چھنکر | پتی ہے زمیں پہ پھول بنکر
جنگل جو کھبا نظر میں او حُسن | ہے تو ہی شجر شجر میں او حُسن!

نظروں کے لیے ہیں خوشنما مرغ   کانوں کے لیے ہیں خوش نوا مرغ
نکلیں پر و بال دل کو چھینیں   اُسکے خط و خال دل کو چھینیں
طاؤس کا رقص میں وہ آنا   آواز سے کرنا بجانا
وُہ ناچ رہا ہے دن سروں پر   سونا سا چڑھا ہوا پروں پر
دُم کا پھیلاؤ حسن کی شان   کان کا بتاؤ حسن کی تان
ہر پر میں اُداہٹ اور سیاہی   اُس میں پھر رنگ سبز کاہی
کیا لطف دکھا رہی ہے زردی   کیا خوب ہے رنگ لاجوردی
زردی کی چمک سے بڑھ گئی شان   سبزی میں چمک سے پڑ گئی جان
پکھراج اُس میں زبرجد اُس میں   کندن کا مزا دبے حد اُس میں
چلنے پھرنے میں دُم پڑی ہے   رقصاں ہے تو پھیلی ہر گھڑی ہے
بھنورے میں سیاہی کی بلا کی   پتلی کہو چشم دلربا کی
پرواز کے ساتھ گونجنا بھی   ہر رقص بھی راگ کی صدا بھی
ہر پھول کے گرد گھومتا ہے   منہ پیار سے خوب چومتا ہے
ہر پھول کے تنبیوں کی پرواز   پر جوڑ کے بیٹھنے کا انداز
اس پھول سے اڑ کے اس پہ بیٹھیں   رس لیکے اڑیں وہ جس پہ بیٹھیں
وہ نقش و نگار اور وہ بوٹے   پر اُنکے چھوئے تو رنگ چھوٹے
رنگ اُن میں بہت ملے ہوئے ہیں   پر کیا ہیں چمن کھلے ہوئے ہیں
ہر خال ہے پر پہ اک نگینا   سونے چاندی پہ یا ہے مینا
قدرت دیکھو کہ گل چمن میں   گلدستے ہیں تتلیوں کے تن میں
جو نقش و نگار سے بری ہے   حسن اُسکے بدن کی سادگی ہے
ہے رنگ کسی کا زرد گہرا   اتنا گہرا کہ بس سنہرا

کوئی جس کے سپید ہیں پر — جیسے چاندی کے صاف پتر
طاؤسی۔ صندلی۔ گلابی — دھانی۔ کاہی۔ سیاہ۔ آبی
نیلے۔ اودے۔ زمردی لال — ہر رنگ کے پر ہیں پر خط و خال
اچھی جو شکل با صفا ہے — اس میں اور حسن نو بھرا ہے
تالاب کہیں۔ کہیں ہیں نہریں — پانی شفاف اس پہ لہریں
لہروں کا وہ لوٹنا وہ چلنا — مچھلی کا کہیں کہیں اُچھلنا
مینڈک بھی حباب بھی ہیں تو بھی — کف آب پہ اِدھر بھی اور اُدھر بھی
پانی پہ شجر کا سایہ اس طرح — سطح پر پانوں کا عکس جس طرح
جنبش جو ہے سائے سے ہوا — کی ہواؤں نے جان پیدا
کھلتی ہے شعاع مہر انور — ہر لہر کے ساتھ چند اختر
سورج کا وہ ڈوبنے پر آنا — پانی میں شفق کا رنگ لانا
گلگوں کسی شوخ کا بدن ہے — اس پر یہ سپید پیرہن ہے
اور موتی سا صاف پانی — تہ عکس فلک سے آسمانی
ترشے ہوتے ظہور انجم — نیچے پانی کے نور انجم
پانی میں یہ عکس چاند کا ہے — یا کوئی حسین نہا رہا ہے
روشن پانی سے نور ہے او حسن — سب تیری ہی آبرو ہے او حسن
اونچے نیچے پہاڑ ٹیلے — پھیلے ہوئے۔ گول۔ اور نکیلے
ٹیڑھے سیدھے جال اُن پر — نازک بیلوں کے جال اُن پر
جھرنوں کی پہاڑ سے روانی — کالا پتھر سپید پانی
بہنا کہیں اور کہیں ٹپکنا — خورشید کے نور سے چمکنا
شفاف وہ دھار اور وہ پتھر — نکلی ہوئی مانگ جیسے سر پر

کیا حسن ہے دل لبھانے والا جنگل تو سپید ابر کالا

بجلی چمکی کہ کھل گیا پاؤں پھسلا ہے کسی حسین کا پاؤں

ہے جوشِ سخا سے ابر باراں قطروں سے زمیں پہ گوہر افشاں

سحر بر فلک کا ٹوٹا ٹوٹا اور آنہ سے بھی چھوٹا

تو حسن فضائے ابر میں ہو تو برق ردائے ابر میں ہو

سبزہ کچھ کاہی کچھ ہو دھانی اور اُس میں کہیں کہیں ہو پانی

سبزے میں سپید گھاس کچھ کچھ بوٹے زرد اس پاس کچھ کچھ

ہر بیر بہوٹی اک دلہن ہے پہنے ہوئے لال پیرہن ہے

چھوئے کوئی جو اس دلہن کو شرما کے سمیٹ لے بدن کو

عاشق کوئی آپڑا ہے گویا وہ خون کے آنسوؤں سے رویا

تو رنگ بھی شرم بھی ہو او حسن تو جس میں حسن وہی ہو او حسن

شام اور فلک کا رنگ آبی اُس پر عرقِ آتشی - گلابی

کچھ روشنی اور کچھ اندھیرا چڑیوں کا وہ بولنا بسیرا

پردے سے وہ چاند کا نکلنا تاروں کو لئے ہوئے وہ چلنا

نکلے ہوئے کہکشاں میں تارے یا مانگ بھری ہو موتیوں سے

تو ہے ان میں ضرور او حسن ہے سب تیرا ہی نور او حسن

جنگل کی اندھیری رات سنسان بادل گہرا - ہوا پریشان

جھونکوں میں غضب کی سنسناہٹ شاخوں کی رگڑ بلا کی آہٹ

پیڑوں کا وہ ہولناک انداز شیروں کی وہ خوفناک آواز

شعلوں کا وہ خود بخود بھڑکنا پتوں کا وہ جا بجا کھڑکنا

وہ بوم کی ہو وہ ہو کا عالم وہ وہم کی صورتِ مجسم

او حسن! یاں بھی جلوہ گر تو — جگنو بن کر ادھر ادھر تو
وہ دل کے لئے سرور کا وقت — وہ لطف سحر وہ نور کا وقت
آہستہ نسیم کا وہ چلنا — سورج کا وہ آڑ سے نکلنا
شفاف وہ آب جو چمن کی — بھینی بھینی وہ بو چمن کی
منہ پھولوں کے دھو گئی ہے شبنم — سبزے کو بھگو گئی ہے شبنم
نوکوں پہ جو قطرے تھم گئے ہیں — دانے موتی کے جم گئے ہیں
عاشق ہے کسی کا سبزۂ تر — آنسو ہے یہ نوک ہر مژہ پر
کلیوں سے لکیر سی ہویدا — کچھ قصد تبسم ان سے پیدا
بھیگے ہوئے پیڑ رات بھر کے — پھولے ہوئے پھول اس سحر کے
چن چن کے بھرے جو ڈالیوں میں — دل بس رہا پھول ڈالیوں میں
دل کو جو لبھایا رنگ تو نے — او حسن شکست یہ دی ہے تو نے
وہ دشت کی ریت اور وہ میداں — سناٹے سے جسکے عقل حیراں
کوسوں نہ شجر نہ منزلوں کھیت — آنکھیں کھولو تو ریت ہی ریت

پاؤں اس میں دھنسنے قدم قدم پر — انسان پھسلے قدم قدم پر
ٹیلے اس کے پہاڑ کے سے — اور دھوپ سی گرم بھاڑ کے سی
ٹھنڈک کے وجود سے زمیں پاک — دانے کے عوض نصیب میں خاک

جھونکوں سے ہوا کے کھاؤ بالو — اوڑھو بالو بچھاؤ بالو
لو کے شعلوں سے آگ برسے — پانی نہ ملے زبان ترسے
چشمے کے عوض سراب سے کام — گرداب ہے گرد باد کا نام
او حسن! وہاں بھی نور تیرا — ذروں کی چمک ظہور تیرا
انسان کرشمہ ساز تجھ سے — تعلیم ادائے ناز تجھ سے

گالوں کو پھلا کے رنگ بھر کے
دکھلاتا ہے تو حسین کر کے

فطرت نے کئے تھے بال پیدا
تو نے کئے اُن سے جال پیدا

بالوں میں وہ گھونگھروں کے پھندے
پھانسے جن میں خدا کے بندے

کاکل کو بڑھا دیا بڑھی وہ
تیوری کو چڑھا دیا چڑھی وہ

جو قد میں ترا اُبھار دیکھے
.. جانے وہ انار دیکھے

ترچھی چتون کو آن دے دی
اُونچے ماتھے کو تان دے دی

چمکایا جبیں کو نور دے کر
مغرور کیا غرور دے کر

کس بل سے بدن کو چست کر کے
سر سے تا پا درست کر کے

اٹکھیلیوں کی سکھائیں چالیں
پامال جو ٹھوکروں سے ڈالیں

گھونگھٹ میں حیا ہے راز تیرا
ہونٹوں پہ ہنسی ہے ناز تیرا

ابرو کی گرہ ادا ہے تیری
اُنگلی کی چٹک صدا ہے تیری

انگڑائی ترے بناؤ کا ڈھنگ
ماتھے کی شکن بناؤ کا رنگ

گورے چہرے پہ حال تو ہے
.. دوں کی رگوں میں لال تو ہے

سانچے کا ڈھلا ہوا بدن تو
اس پر خوش رنگ پیرہن تو

بھرتی رہے عضو عضو کے ساتھ
سُرخی تری پور پور کے ہاتھ

گردن وہ کہ قہر اس کا ہلنا
چتون وہ کہ زہر اس کا ملنا

چھب حسن پہ نگاہ لوٹ جائے
سیلی دل جس کی مار کھائے

دانتوں کی چمک تبسم کی نرمی
اُلفت کی ہنسی غضب کی گرمی

تنگی دُنیا کی سب دہن میں
پتلے پتلے وُہ لب دہن میں

دانتوں سے دبا کے لب ڈرانا
کوئی جو ڈرے تو مسکرانا

مہر سپر و فتنۂ قضا آنکھ
در قصر اجل کا وا ہے آنکھ

پتلی میں چلت پھرت بلا کی | آفت دلِ چشمِ آشنا کی
سینہ صاف صاف اور کمر ندارد | کہنے کو تو ہے مگر ندارد
جوڑے سے جو کھل کے بال لٹکیں | دل کو جھٹکیں زمیں پہ پٹکیں
بیداری کی فتنہ ساز آنکھیں | اور خواب کی نیم باز آنکھیں
باتوں باتوں بگڑ کے اٹھنا | بل کھا کے کمر پکڑ کے اٹھنا
دل جو کبھی قرب سے کبھی دور | پہلو سے ابھی قریب ابھی دور
نرمی سے کبھی وفا کی باتیں | گرمی سے کبھی جفا کی گھاتیں
بالوں کو کبھی سمیٹ لینا | ان میں دل کو لپیٹ لینا
شوخی کبھی چٹکیوں پہ مائل | بوسے میں کبھی حجاب حائل
وہ دل شکنی نہیں نہیں سے | دھمکی وہ نگاہِ خشمگیں سے
سینے کے نمو پہ ناز تن کر | اترانے کی خود حسین بن کر
وحشت وہ کہ سائے سے بھڑکنا | پھرتی وہ کہ خود بخود پھڑکنا
گیسو کی گرہ سے دل ربائی | ابرو کی گرہ سے کج ادائی
نتھنوں کی پھڑک ادائے غمزہ | سسکی گویا صدائے غمزہ
مہندی سے ہے لال ہر سرِ انگشت | شمع پُر نور ہے ہر انگشت
ہے پنجۂ صاف جلوہ افگن | یا ہاتھ میں پنج شاخہ روشن
جو گردشِ چشمِ یار دیکھے | دورِ لیل و نہار دیکھے
دنیا میں ہے دل فریب تر کون | جس کے یہ کرشمے ہیں وہ ہے کون
جو شکل ہو جو ادا ہے جو حسن | تو ہے واللہ تو ہے او حسن!
کیسی بیتی ترے اثر سے | پوچھے کوئی شوق کے جگر سے
کس شوق سے ہو وہ تجھ پہ شیدا | ہو شوق کے نام ہی سے پیدا

لیکن تجھ میں وفا نہیں ہے
سب حسن میں اک بقا نہیں ہے

ہستی تری بے ثبات ٹھہری
فانی تری کائنات ٹھہری

گالوں کا ابھار چند روزہ
پھولوں کی بہار چند روزہ

پیری سے شباب گرد ہو جائے
رخ لال کے بدلے زرد ہو جائے

آنکھوں میں نہ رس ہو اور نہ پھل ہو
اعضا میں کس ہو اور نہ بل ہو

ہر حسن کو خوف ہے فنا کا
باقی اک حسن ہے خدا کا

میرا پیارا دہنا ہاتھ

(اصل خیال ایک انگریزی کتاب سے لیا گیا)

اتفاقات زمانہ کا ہوا میں جو شکار
زندگانی مری افلاس نے کر دی دشوار

جستجو ایسے کسی دوست کی تب مجھ کو ہوئی
پائیں انجام مرے کام مدد سے جس کی

کامیابی نہ ہوئی اس میں کسی طرح مجھے
آشنا چلنے لگے آنکھ چرا کر مجھ سے

ہم نشیں کرنے لگے سب مری صحبت سے گریز
غیر تو ایک طرف کرتے تھے اپنے پرہیز

تھا مرے پاس کو دم بھر بھی جانا مشکل
ہو گیا انکو مرا پاس بٹھانا مشکل

گرم جوشی سے جو ہر دم مرا دم بھرتے تھے
سرد مہری سے وہ ارباب غرض جلنے لگے

مشورے گو مجھے دیتے تھے نہایت اچھے
خوف بیٹھا تھا یہ دل میں کہ نہ کچھ مانگ اٹھے

بیکسی میں نہ کوئی جب پئے امداد آیا
عقل نے راہبری کی تو خدا یاد آیا

میں نے سوچا کہ ہو کیوں غیر کی پروا مجھ کو
چاہیے رازق مطلق پہ بھروسا مجھ کو

جا کے پھیلاؤں کسی دوست کے آگے کیا ہاتھ
پاس ہے دوست مرے ایک مرا دہنا ہاتھ

میرا ہر زخم کا نشتر کہ غم ودیعت ہے یہی | میں بھروسا نہ کروں اس پہ قیامت ہے یہی
میری امداد کریگا یہی اس آفت میں | ہے یہ وہ دوست کہ کام آتا ہے ہر حالت میں
کام غفلت سے جو بگڑے ہیں سنواریگا یہی | بحرِ افلاس میں ڈوبا ہوں اُبھاریگا یہی
خاکِ دنیا پہ مروّت کا گماں کوئی کرے | کس طرح ریگ پہ تعمیرِ مکاں کوئی کرے
یہ خیال آتے ہی دل بڑھ گیا ہاں میرا | حوصلے دل کے دیے ہمتِ عالی نے بڑھا
نہ رہا شکوۂ کوتاہیِ قسمت مجھکو | لے اُڑی اوج پہ بے پر مری ہمت مجھکو
پھر کسی کام کے کرنے میں مجھے عار نہ تھی | پیش آئی کوئی مشکل تو وہ دشوار نہ تھی
تھا قوی ہاتھ باندازۂ ہمت میرا | پھر اسی اوج پہ تھا اخترِ قسمت میرا
پھر وہی دوست جو کترا کے چلا کرتے تھے | آشنا وہ کہ جو بھولے سے ملا کرتے تھے
ہمنشیں وہ کہ جنہیں ننگ تھی صحبت میری | اقربا وہ جنہیں بھاری تھی۔ صورت میری
آشنائی کا اسی طرح سے دم بھرنے لگے | پھر زبانی وہ زر و مال فدا کرنے لگے
بیوفائی نہ کرے جو نہ کبھی چھوڑے ساتھ | دوست ہے وہ مرا پیارا یہ مرا دہنا ہاتھ
آسرا تو نہ یہاں اور کسی کا کرنا | اک فقط قوتِ بازو پہ بھروسا کرنا
رکھے سرگرم اگر ہمتِ عالی تجھ کو | گاہ تکلیف نہ دے بردلیالی تجھ کو

(سی ہبسکلے) | (مترجمہ سید علی محمد زیدی)

ہستی

اے شمعِ زندگانی! آخر لبِ اجل نے | یک بار جل بجھی تو اس طرح تجھ کو پھونکا
ممکن نہیں کہ روشن پھر ہو شرار تیرا | اس تیرہ خاکداں میں کیونکر گذر ہو میرا
اے گلِ زندگانی! ہائے قضا نے تجھ کو | افسوس بیخ و بن سے پامال کر کے چھوڑا

مجھ کو نہیں کہ پھر تو سرسبز بار ور ہو — جو نخل سوکھ جائے دشوار ہو کہ تر ہو
ہے وجہ زندگانی : معنی مرگ نے یوں — ہم کو کیا دوپارہ جوں لفظ ہوں شکستہ
فی الاصل ایک تھے ہم جب ہو چکی جدائی — بے جان ہو کے قالب باقی نہیں رہیگا

محمد سیف الدین شباب

تازہ غزلیں

غزل

اسیر عشق بناموس ننگ در جنگ است — که عشق دشمن ناموس و رہزن ننگ است
[illegible] داشناس رموز کرشمہ می داند — کہ در نگاہ و تغافل ہزار فرسنگ است
دل من و ہوس وصل آں صنم چہ کنم — عجب معاملہ آگینہ و سنگ است
بصلح دست در آغوش غیر را چہ خبر — کہ چشم من ہمہ شب با ستارہ در جنگ است
بلاف معرفت شیخ تہمت [illegible] — کہ مدعا رہ باریک و مدعی لنگ است
بخواہ جام جم و ملک جم ز درویشان — کہ در چشم صدف لعل در دل سنگ است
سپہر و این ہمہ چشمک فروشی اختر — فریب پردۂ فانوس فتنہ آہنگ است
درین زمین غزل دلنشیں چہ برخوانم — کہ تنگ سخنم و دلتنگ و قافیہ تنگ است

عتاب او ہمہ آفت خطاب او ہمہ قہر
گرامی اینچہ فسونست و اینچہ نیرنگ است

گرامی۔ شاعر خاص حضور نظام دکن

سانچے میں ڈھل گئی ہیں یہ خوبیاں تمام — اس رخ پہ [illegible] ختم ہیں محبوبیاں تمام

ترقی اردو

کی

جو کوشش رسالہ ادیب الہ آباد کے ذریعہ سے شروع کی گئی ہے وہ ہر علم دوست کی اعانت اور ہمدردی کی مستحق ہے۔ اس میں علاوہ ان ادبی مضامین کے جو مسلّمہ قابلیت کے اہل قلم سے لئے جاتے ہیں اور ہندو مسلمان مرد و عورت ہر فرقے طبقہ کے لئے یکساں خوشگوار ہوتے ہیں۔ ہر مرتبہ ایک اعلیٰ درجہ کی رنگین اور سادہ عکسی تصاویر بھی دیجاتی ہیں۔ جن میں مشاہیر حضرات کے فوٹو تاریخی عمارات کے نقشے اور آثار قدیمہ کے مرقعے ہوتے ہیں۔ سائز ماڈرن ریویو وغیرہ انگریزی رسالوں کے مطابق ہے اور کاغذ وغیرہ بھی بعینہٖ ویسا ہی عمدہ اور چمکدار لگایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ادیب عمدہ سے عمدہ انگریزی رسالوں سے ہمسری کر سکتا ہے۔ مضامین نظم و نثر کا اتنا سرمایہ ہر مرتبہ ہوتا ہے جو کئی روز تک پڑھنے کے لئے کافی ہے۔ اینہمہ **قیمت سالانہ صرف** چار روپیہ - فی پرچہ ۶؍

نمونہ مفت نہیں دیا جائے گا۔ ملک کے تمام نامور اخبارات اور اہل الرائے نے بالاتفاق اس کوشش کی داد دی ہے۔

المشتہر

مینیجر ادیب - انڈین پریس الہ آباد

اقبال دلہن

مصنفہ جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب خلف شمس العلما مولوی حافظ نذیر احمد صاحب
دہلوی

کتاب کیا ہے سچے حالات اور روزمرہ کے واقعات کی ہو بہو تصویر ہے۔ مولوی نذیر احمد صاحب کی تصانیف نے جو نام اور قدر حاصل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں یہ کتاب بھی انکی نظر سے گذر گئی ہے۔ اور اب مخزن پریس سے شائع ہوئی ہے جب شمس العلما۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب شمس العلما خان بہادر منشی محمد ذکاء اللہ صاحب۔ مولوی وحید الدین صاحب سلیم ایڈیٹر علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی صاحب کی تقاریظ سے اس کتاب کی قدر و قیمت بڑھا چکے ہیں تو پھر سمجھ لیجیے کہ کیسی کتاب ہوگی۔ درخواستیں منیجر مخزن پریس لاہور کے نام آنی چاہییں

قیمت اعلی قسم کے کاغذ پر عا۔ دوم قسم کے کاغذ پر عہ (علاوہ محصول ڈاک)

مخزن

اپنی سرگذشت

عجیب اتفاق ہے کہ مخزن کی زندگی اس وقت تک خود بخود تین تین سال کے دورِ
پر تقسیم ہوتی رہی ہے۔ یعنی تین سال ایک رفتار سے آتے ہیں۔ اور پھر بعض غیر متوقع
حالات سے کوئی تغیر یا انقلاب اس کی حالت میں واقع ہوتا ہے۔ عام قاعدہ
ہے کہ ہر تغیر میں کچھ فوائد اور کچھ نقصانات ضرور موجود ہوتے ہیں۔
کبھی فوائد نظر آتے ہیں اور نقصان پوشیدہ ہوتے ہیں اور کبھی
نقصان نظر آتے ہیں اور فوائد مخفی ہوتے ہیں۔ انسان ان اسرار
کے جاننے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ جو خدائے دانا و بینا اس کی آنکھ سے
چھپائے۔ اس کا فرض یہی ہے کہ وہ خدا کی حکمت کاملہ پر بھروسا
کر کے اپنے مقدور بھر محنت کرتا جائے اور باقی کامیابی اور ناکامی
خدا پر چھوڑ دے۔ مخزن کی اصلی سرگذشت اس وقت تک ایک معمّا ہے۔
جو شاید کبھی آگے چل کر حل ہو سکے۔ اس سرگذشت کے سب پہلوؤں
سے تو ہمارے ناظرین کو سروکار نہیں۔ صرف چند باتیں بیان کر دینی
کافی ہیں۔

مخزن اپنی عمر کے نو سال گذشتہ اپریل میں ختم کر چکا۔ اب دسواں سال

شروع ہے۔ اس رسالہ کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا تھا۔ گویا بیسویں صدی کے آغاز سے اس کو ایک خاص نسبت ہے۔ اب یہ خدا کو معلوم ہے کہ بیسویں صدی کے انجام سے اسے کچھ تعلق ہوگا یا نہیں۔ یہ تو یقینی ہے۔ کہ وُہ دل جس میں اِس کے جاری کرنے کی اُمنگ پیدا ہوئی تھی۔ اس وقت حالتِ اضطراب کو حالتِ سکون سے بدل چکا ہوگا۔ اور وُہ ہاتھ جو اِس وقت اس کی کل چلا رہے ہیں تہِ خاک آسودہ ہونگے۔ گو یہ غیر متیقن ہے کہ مخزن ۱۹۹۹ء میں قیدِ ہستی میں ہوگا یا مِٹ چکا ہوگا۔ اور صرف اس کی یاد باقی ہو گی۔ یا یاد سے بھی اُتر چکا ہوگا۔ دُوسرے متمدن ممالک کے مخزنوں اور اخباروں کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے۔ کہ اخباروں کی زندگی صدیوں کی ہونی ممکن ہے۔ ہمارے مُلک کا تجربہ خصوصًا اردو کے رسالوں کے متعلق اس کے برعکس ہے۔ یہاں دو چار سال میعادِ زندگی سمجھی جاتی ہے۔ اور آٹھ نو سال کی عمر اچھی خاصی عمر۔ ہمیں حال ہی میں اس خیال کا ثبوت ملا۔ پچھلے دنوں جو بعض ناگزیر اتفاقات سے مخزن کے انتظام میں نقائص پیدا ہُوئے تو بعض حضرات نے کھلے لفظوں میں یہ لکھ بھیجا۔ کہ یہ شاید مخزن کی پیرانہ سالی کے آثار ہیں۔ شاید یہ کہنا درست ہوتا۔ کہ یہ آثارِ صحت میں خلل آنے کے ہیں۔ جو پیر و جوان کے لئے یکساں ممکن ہے۔ ورنہ جو عُمر رسالوں اور اخباروں کی ہونی چاہیئے۔ اس کے لحاظ سے کوئی رسالہ نو دس برس میں درجۂ پیری کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ چند مہینوں سے مخزن حالتِ مرض میں مبتلا ہے اور ہم اس کے علاج میں مصروف ہیں۔ ناظرین اگر ازراہِ قدردانی کچھ مدد کرنا چاہیں تو اُن سے یہ درخواست ہے کہ وُہ اس زمانہ میں پہلے سے

زیادہ بردباری سے کام لیں۔ اور درستی انتظام کا وہ نمونہ دیں جس کی توقع ہند کے اندر کی جاتی ہے۔

پہلے تین سال مخزن کی زندگی کے نہایت دلچسپ سال تھے۔ اپنی طرز میں ایک نئی چیز تھی۔ کالجوں کے پڑھے ہوئے گریجوایٹ ایک طرف نہایت شوق کے ساتھ اپنی علمی قابلیت کا ثبوت دینے پر آمادہ تھے۔ اور اُردو علم ادب کی بیش بہا خدمت کو اپنا فرض سمجھ کر اس میں ہاتھ بٹانے کو تیار تھے۔ دُوسری طرف پُرانی تعلیم و تربیت پائے ہوئے اہلِ قلم ان نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے خود میدان میں اُتر آئے تھے۔ لکھنے والوں میں اکثر ہم عمر، ہم سبق۔ یا بے تکلف ہم نشین تھے۔ جو ملک کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے تھے۔ مگر جنکے دلوں میں کالجوں کی علمی صحبتوں کی یاد تازہ تھی اور جنہوں نے صلائے عام سُنتے ہی مخزن کے اوراق میں وہی زمانہ طالب علمی کی بزم مشاعرہ و مضمون نگاری از سرِ نو قائم کر لی ہر طرف سے ان کوششوں پر آفرین و مرحبا کی آواز بلند ہوتی تھی۔ اور ہر گوشۂ ملک سے داد ملتی تھی۔ کہ اتنے میں دَورِ گردوں نے ایک پلٹا کھایا۔ مجھے غریب الوطنی نے پکارا۔ کئی احباب کو یہ تردد ہوا۔ کہ اس سے رسالہ کی ہستی کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔ اور یہ جمعیت پریشان نہ ہو جائے۔ مگر خدا کو چونکہ اس کی بقا منظور تھی۔ مخزن کے قلمی مددگار نہایت مستعدی کے ساتھ کمربستہ ہو گئے۔ کہ اسے سنبھالے رکھیں گے اور میرے سفرِ یورپ کے زمانہ میں اُن کی بے غرضانہ اور مخلصانہ مساعی اور میرے معاون شیخ محمد اکرام کی کوششوں سے رسالہ نہ صرف اپنی حالت پر قائم رہا بلکہ کثرتِ اشاعت وغیرہ میں غیر معمولی ترقی کرتا گیا۔ الغرض میرا سفر بجائے کسی طرح نقصان دِہ ہونے کے مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ جو

مضامین انہی نے یورپ سے بھیجے۔ انکو لوگوں نے رسالہ کی دلچسپی میں اضافہ
سمجھا۔ اس طرح مخزن کی عمر کا دوسرا دور بھی بخیر و خوبی ختم ہوا۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں جب میں انگلستان سے واپس آیا۔ تو مخزن اپنی عمر کے
چھ سال ختم کر چکا تھا۔ اُسوقت میرا خیال یہ ہوا کہ بیرسٹری کا کام دہلی میں شروع
کروں۔ اور اِس خیال سے کہ دہلی زبان اردو کا گھر اور اس کا ایک بڑا مرکز
ہے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ مخزن کو بھی جیسے وہاں کی آب و ہوا سے
فائدہ پہنچ جائے۔ تین سال ہوئے جب مخزن نے لاہور سے نقل
مکان کیا۔ اس وقت اس کا اعلان کرتے ہوئے میں نے یہ الفاظ
لکھے تھے: "خدا کرے اب اسے دِلی کی آب و ہوا راس آئے اور
دِلی والے اپنی پسند اور قبولیت کی سندات عنایت کریں" اِن دونوں
دعاؤں میں سے ایک قبول ہوئی۔ دِلی والوں نے اسے پسند کیا۔
اور قبولیت کی سند اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے۔ کہ اس گئے گذرے
زمانہ میں جو نظم و نثر کے لکھنے والے شاہجہان آباد میں باقی ہیں۔ اُن سب
نے وقتاً فوقتاً اپنے مضامین سے اس کے اوراق کو زینت دی۔ مگر
دِلی کی آب و ہوا افسوس ہے کہ اِسے راس نہ آئی سنہ ۱۹۰۷ء میں دہلی
پہنچتے ہی جب میں شمس العلما مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب سے ملا۔ تو انہوں
نے ازراہِ محبت و دلسوزی فرمایا۔ کہ اب تم اس رسالہ کو یہاں لے آئے
ہو۔ میں تمہاری ہمت پست کرنا نہیں چاہتا۔ مگر خدا ہی ہے جو دِلی کی آب و
ہوا سے راس آئے۔ ایک وقت تھا کہ بہت سے اخبار اور رسالے یہاں سے
نکلتے تھے۔ مگر اب تو عرصہ سے یہاں کوئی اخبار یا رسالہ زیادہ دیر تک
کامیاب نہیں ہوا۔ مجھے اُس وقت اُن کے اس قول سے کسی قدر صدمہ ہوا۔

گو میں نے اس کا اظہار نہیں کیا لیکن آخر ان کا بزرگانہ قول درست ثابت
ہوا۔ اور مخزن کو بحیثیت مجموعی دلی کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ گو انصاف
اس کا مقتضی ہے کہ یہ کہا جائے کہ اُن وجوہ سے جو دلی سے نقل مکان
کا باعث ہوئی ہیں۔ دلی کی مقامی حیثیت کو کچھ واسطہ نہیں۔ بڑی
وجہ تو یہ تھی کہ میں نے اپریل سنہ ۱۹۰۵ء میں دلی کو چھوڑ کر خود پھر لاہور کا
قیام اختیار کیا اور میں چاہتا تھا کہ میں مخزن کو اپنے ساتھ لے آؤں
جیسا کہ سنہ ۱۹۰۵ء کے اعلان میں ارادہ ظاہر کیا گیا تھا کہ جب تک
میرا آب و دانہ مجھے وہاں رکھے گا۔ یہ بھی میرے دم کے ساتھ رہے گا۔
مگر شیخ محمد اکرام کی رائے یہ ہوئی کہ وہ خود دلی ہی میں رہیں۔ اس لئے میں
مخزن کو بھی اُن کے بھروسے دلی چھوڑ کر لاہور آ گیا۔ اتفاق یہ ہوا
کہ میرے لاہور آنے کے بعد جلد ہی اُن کا اپنا ارادہ انگلستان جانے کا
ہو گیا۔ وہ ادھر چلے گئے۔ میں پہلے ہی یہاں آ گیا تھا۔ اس زمانہ
میں نگرانی خاطر خواہ نہیں ہو سکی۔ گو میرے مکرم مولوی عبدالراشد صاحب
کی دوستانہ امداد نے مخزن کی حالت کو سنبھالے رکھا۔ مگر کئی
مشکلات انتظام میں ایسی پیدا ہو گئیں جن سے مالی حالت میں بہت
کچھ نقصان ہوا۔ اور خریداروں کو بے وقت اشاعت کی شکایتیں
پیدا ہوئیں۔ جن کے دفعیہ کی تدبیر حالت موجودہ میں سوائے اس کے
نہیں ہو سکتی کہ کام کو پھر اپنی نگرانی میں لے لوں۔

جن مالی مشکلات کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اُن کا ایک معتد بہ
حصہ اُن کتابوں کی وجہ سے ہے جو مخزن ایجنسی کی طرف سے شائع
ہوئی ہیں۔ ملک میں عمدہ اور نفیس لکھائی چھپائی کو مقبول بنانے اور

لٹریچر کی کتب جدیدہ اور نیز کتب مستند اولہ کے خوبصورت ایڈیشن شائع
کرنے کے شوق سے کارخانہ کو بہت سی زیر باری اُٹھانی پڑی۔ گو
خوش مذاق قدردانوں نے کتابوں کے خریدنے میں بھی بہت فراخ دلی
سے کام لیا ہے۔ لیکن یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ابھی ملک میں ایسی چیزوں
کا مذاق کافی طور پر نہیں پھیلا اور اس شوق کے پھیلانے میں بڑی
مصائب کا سامنا ہے۔ جو کتابیں فروخت ہوئیں۔ اُن کا اگر کچھ نفع ہوا
تو کارخانہ کی نذر ہوا۔ اور جو ابھی زیر طبع ہیں۔ اُنکے مصارف کا سنگ
گراں سینہ پر موجود ہے اور ان کی فروخت دیر طلب اور اُن کا نفع موہوم۔
ان حالات میں کوئی شخص جو اندرونی تکالیف سے آگاہ نہ ہو۔ اندازہ نہیں
لگا سکتا۔ کہ اِندنوں کیسی دقتوں کا مقابلہ ہمیں درپیش ہے۔ لیکن ہمارا یہ
عقیدہ ہے۔ کہ یہ چند روزہ تکلیف ہی جو رفع ہو جائے گی۔ اور ہم اُمید
کرتے ہیں کہ مخزن اپنی معمولی دھیمی مگر یقینی ترقی کی رفتار قائم رکھ سکیگا۔
مخزن میں ہر مہینے ایک تصویر شائع کرنے کے التزام نے جو ہم نے
اپنے ذمہ لیا تھا۔ بسا اوقات ہمیں سخت دقتوں میں ڈالا ہے۔ ایک
دفعہ جب دربار نمبر شائع کرنے کے لئے ہم نے ایک مرقع چھاپنا
چاہا اور بڑی مشکل سے تمام نامور مصنفینِ اردو کی تصویریں بہم پہنچائیں۔
تو باوجود صرفِ کثیر برداشت کرنے کے ہمارے پلیٹ بنانے والے
نے تصویروں کے پلیٹ خراب کر دیئے۔ روپیہ سب بیکار ضائع ہوا۔
اور مرقع وقت پر نکلنے نہ پایا۔ بعض تصویریں دوبارہ تیار ہو کر بعد کو
نکلیں۔ اس کے سوا یہ بارہا ہوا۔ کہ رسالہ تیار ہو کر ہفتوں مطبع میں پڑا
رہا۔ اس انتظار میں کہ تصویریں کلکتہ یا بمبئی سے آلیں۔ اور دو تین مرتبہ

بعد انتظار کے بھی آخر بے تصویر روانہ کرنا پڑا۔ اور یہ وہی تکلیف ہے کہ
جب تک جہاں رسالہ چھپے وہیں تصاویر چھپنے کا انتظام موجود نہ ہو
موجود رہے گی۔ یہ دیکھتے ہوئے نادرشاہ کا وہ قول یاد آتا ہے
کہ تم کہے کہ عنان بدستِ خود نباشد سواری الفت بد۔ آئندہ
اس التزام کو ترک کرنے کا عزم ہے۔ ہم عموماً مشہور مصنفین اُردو
یا اپنے مستقل مضمون نگاروں کی تصاویر درج کرتے رہے ہیں۔ یہ صیغہ
اب بھی جاری رہیگا اور جب اس قسم کی کوئی تصویر شاملِ پیشکش ہوگی
ہدیہ ناظرین کی جائے گی۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی دیگر مشاہیرِ عالم
کی تصویریں بھی ہمارے ہاں شائع ہوئی ہیں۔ مگر وہ سب اُن
کے متعلق مضمون درجِ رسالہ ہونے کے۔ اب بھی جب کوئی مضمون
متضمن تصویر ہوگا۔ خواہ وہ تصویر مشہور شخص کی ہو یا مشہور جگہ کی
مضمون کے ساتھ تصویر دی جائیگی۔ لیکن پابندی کہ ہر مہینے کے
پرچے میں تصویر ہو تجربہ سے قابلِ ترک ثابت ہوئی ہے۔ شاید کوئی
صاحب کہیں کہ آج کل جبکہ مقابلہ کا بازار گرم ہے اور کئی نئے رسالے
آب و تاب کے ساتھ بڑے بڑے دعاوی لیکر نکلے ہیں۔ ہمارا ایک
تصویر کے التزام کو بھی ترک کرنا مناسب نہیں۔ مگر ہم نے اس کے اس
پہلو کو خوب سوچ لیا ہے۔ اور یہ اعلان اس زمانہ میں قصداً کیا ہے۔ ہم
اُن سب رسالوں کی تہِ دل سے ترقی چاہتے ہیں۔ جو اردو کی خدمت میں
مصروف ہیں اور ہم سے زیادہ کوئی خوش نہ ہوگا اگر وہ اپنے ارادوں
میں کامیاب ہوں اور اپنے وعدے نباہ سکیں۔ لیکن ہمارا اپنا تجربہ
تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جو تعدادِ اشاعت اردو رسالوں کی عموماً ہوتی ہے

ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُن رسالوں کی قیمتوں میں اس قدر مصارف کے متحمل ہونے کی گنجایش نہیں۔ جتنے وُہ اُٹھا رہے ہیں۔ مقابلہ بڑی اچھی اور مفید چیز ہے۔ اگر صحیح حدود کے اندر ہو لیکن جب حد سے متجاوز ہو اور اس کا مقصد خود نقصان اُٹھا کر بھی کسی کو شکست دینا ہو۔ تو وُہ مذموم ہو جاتا ہے۔ اور ہر راست رو شخص کو چاہئے کہ اِس قسم کے مذموم مقابلہ کو جہاں تک ممکن ہو بڑھنے نہ دے ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں بعض رسالے اس قسم کے مقابلہ کا شکار نہ ہو جائیں۔ اصلی کام تو ہم سب کا اُردو زبان اور اردو علم ادب کی ترقی کے لئے کوشش کرنا ہے۔ اور جب تک کوئی رسالہ اس مقصدِ اصلی کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ وہ تمام شائقینِ اُردو کی ہمدردی اور اعانت کا مستحق ہے +

عبد القادر

مُفِیدُ الوارثین

ایک نہایت کار آمد مذہبی کتاب ہے جو مولوی سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کی تالیف ہے۔ وراثت کے مسائل شرع شریف کے مطابق بہت شرح و بسط کے ساتھ عام فہم اردو میں درج کئے گئے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں یہ کتاب دیگر شائقین کے علاوہ وکالت پیشہ اصحاب کے لئے خصوصاً مفید ہوگی۔ پہلے ایک کتاب میراث المسلمین نامی شائع ہوئی تھی۔ جو مولوی صاحب موصوف کی ہی تالیف کردہ تھی۔ وُہ چونکہ بہت پسند کی گئی اس لئے اب بعض مضامین بڑھا کر یہ کتاب چھاپی گئی ہے اس کی ضخامت ۲۴۲ صفحہ ہے۔ عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے اور دفتر القاسم مدرسہ اسلامیہ دیوبند سے ایک روپیہ [illegible] کو مل سکتی ہے۔

اصلاح اردو

پہلے پہل جب دنیا کی اسٹیج پر اردو نے قدم رکھا ہے تو اس کی صورت کمسن معشوق کی طرح تھی جسکو اپنے الھڑپنے سے اپنے حسن کی دلفریبیوں کی خبر نہ ہو عجمی نژاد لوگوں کی زبان پر "ت" اور "ٹ" کے تلفظ میں جو مزا آتا تھا وہ انہیں کے دل کچھ خوب جانتے ہیں۔ "ایک" "ٹک" کے کہنے میں سر سے پیر تک رہ لگایا جاتا تھا اور پھر بھی اپنی صورت نوعیہ کے ساتھ ادا نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح ہندی نژاد فارسی لفظوں کو سو سو مرتبہ طوطے کی طرح رٹتے تھے۔ پھر بھی زیر زبر کے غلط استعمال کا وقوف امکان سے باہر تھا۔ رفتہ رفتہ ایک صورت زبان کی قائم ہوئی جس میں بھاشا کا کثیر حصہ تھا اور عربی فارسی ترکی یونانی پنجابی گورمکھی بنگالی کشمیری پشتو گجراتی مرہٹی سندھی تمام زبانوں کا خمیر تھا۔ گویا اردو ایک دیوانی ہانڈی تھی یا یوں کہو کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کا عطر مجموعہ۔

اس عطر میں کچھ ایسی بھینی بھینی خوشبو تھی جس سے ہندو مسلمان اور تمام اقوام کے دماغ معطر ہوگئے رفتہ رفتہ یہی اردو شاہی زبان قرار پائی۔

زبان کی صدہا سال کی خودرو ترقی نے ایک نقص بھی پیدا کر دیا تھا۔ وہ یہ کہ اکثر غیر ملک کے الفاظ لوگوں کی زبان پر خلاف تلفظ جاری ہوگئے تھے اور بعض الفاظ ثقیل اور الفاظ غیر فصیح مستعمل تھے۔

امتداد زمانہ نے اس میں شعرا کو پیدا کیا۔ سب سے پہلے شعرا

میں شیخ ظہور الدین حاتم نے سنہ ۱۱۶۹ھ میں عہد عالمگیر میں اصلاح اردو پر
قلم اٹھایا اور اپنے پہلے دیوان میں ایک دیباچہ لکھا۔ دیوان کا نام "دیوان زادہ"
تھا۔ دیباچہ میں مروجہ زبان کے عیوب ظاہر کئے اور الفاظ غلط
اور ثقیل کو زبان سے خارج کیا۔ اور روزمرہ عام فہم زبان میرزایان
دہلی کی تقلید کی۔

اس طرح زبان اردو کی اصلاح ترقی کرنے لگی۔

یہ طریقہ شعرائے معاصرین نے پسند کیا۔ شیخ شرف الدین مضمون
و شیخ احسن اللہ احسن و میر شاکر ناجی غلام مصطفیٰ یکرنگ شاہ مبارک آبرو
میرزا جان جاناں مظہر نے اس روش کو تسلیم کیا اور الفاظ ثقیل عربی
فارسی و ٹھیٹھ متروک ہوئے۔

اردو میں فارسی کے حروف روابط از۔ در۔ بر کثرت سے مستعمل
تھے۔ اس کی نسبت۔ آبرو کہتے ہیں ؎

جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف   لغو ہیں گے فعل اس کے شاعری پر حرف ہے

اور الفاظ فارسی جیسے دلا د ماہا اور نگین و جبین باعلانِ نون۔
یا الفاظ غلط متصرفہ عوام جیسے تخت تخت بسیح کو تسبی مسیح کو
مسی۔ بیگانہ کو بگانہ۔ دیوانہ کو دوانہ۔ دیوار کو دوال۔ ادھر کو ایدھر۔

شعرا کی متواتر چیخ پکار سے زبان کی بہت اچھی اصلاح ہو گئی اور حاتم
کی سعی مشکور ثابت ہوئی اور زبانِ اردو کو بہت کچھ فائدہ پہنچا۔ لکھنؤ
میں شیخ امام بخش ناسخ۔ شیخ محمد جان شاد میر اوسط علی رشک خواجہ وزیر
وغیرہ شعرا نے بہت سنوارا اور اردو کو قابل سند زبان بنا دیا۔

آخر میں ایک تاخت زبانِ اردو پر انگریزی الفاظ کی ہوئی اور انگریزی

تراجم کی جس نے اردو کے مایہ پا ما پر سخت حملہ کیا۔ اخبارات میں کثرت سے
انگریزی الفاظ شامل ہوتے گئے۔ مگر اُن کی تذکیر و تانیث کا صحیح معیار
آجتک قائم نہ ہوا اور انگریزی تراجم نے زبان میں بہت کچھ تغیر پیدا کر دیا
اس میں شک نہیں کہ یہ انگریزی کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے اردو کو
ایک خزانہ عمدہ الفاظ کا بخشش کر دیا۔ مگر اردو والوں سے اُس کے
مصرف کو ابھی تک قاعدہ نہ بنایا و اُن سے نے صحیح ملفوظ کی کوشش
نہ کی۔ اصل میں یہ کام شعرا کا ہے کیونکہ اردو کی ترمیم اور تنسیخ ہمیشہ سے ہی کرتے
آئے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک اخبار میں لکھا ہے کہ "ہائی کورٹ کھلا"
تو دوسرے میں لکھا ہے ہائی کورٹ کھلی کوئی لکھتا ہے ریویو کیا۔ کوئی لکھتا ہے
ریویو کی۔ ایجیٹیشن پھیلا۔ اور ایجیٹیشن پھیلائی۔ اسی طرح ہزاروں لفظوں
نے اردو کو زینت بخشی ہے مگر کسی قدر بدنمائی کے ساتھ۔

اگر ملک کے شعرا بسبب ناواقفیت زبان کے ادھر متوجہ نہیں
ہوتے ہیں تو اعلیٰ انشا پرداز اپنا قدم آگے بڑھا کر اس بدنما دھبہ
کو اردو کے دامن سے چھڑائیں +

خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی

جسمانی تعلیم ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو خواجہ لطیف احمد صاحب بی اے نے لکھی ہے۔ اس میں جدید تحقیقات کے رو سے اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے کہ طلبہ کی صحت کے لئے کیا کیا وسائل مروج ہیں۔ صاحب انسپکٹر مدارس نے اس کتاب کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ حقیقت میں کتاب بہت مفید ہے۔ عبارت سادہ اور سلیس ہے۔ وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرتسر بھی داد کی مستحق ہے کہ اسکے سلسلہ تعلیمات میں ایسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اس کی قیمت ۴ر ہے +

طوطا کہانی

یہ مضمون حسب ذیل کتب سے ماخوذ ہے (۱) تاریخ اردو لٹریچر مصنفہ پروفیسر گارسن دی تاسی (۲) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۳) فہرست کتب خانہ برٹش میوزیم لندن (۴) فہرست کتب خانہ انڈیا آفس لندن۔

طوطا کہانی جو زبانِ اردو کی ایک نہایت دلچسپ اور مقبول خاص و عام داستان ہے اصل اس کی مولانا ضیاء الدین نخشبی کا فارسی طوطی نامہ ہے، مولانا نخشبی بہت بڑے عالم اور فارسی کے بلند پایہ شاعر گذرے ہیں۔ بدایوں کے رہنے والے تھے بسنہ ۷۵۱ھ سنہ ۱۳۵۰ء میں فوت ہوئے۔ طوطی نامہ کے علاوہ سلک السلوک عشرہ مبشرہ کلیات وجزئیات انکی مشہور اور مقبول عام تصنیفات ہیں[1]
سنسکرت میں شکاسپتتی نام ایک مشہور کتاب ہے جس کے معنے ہیں.

---

[1] شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب اخبار الاخیار فی اسرار الابرار میں ملا نخشبی کے حالات خوب تفصیل سے لکھے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:- اصل او بداؤن بود - در زاویہ خمول بکار خود مشغول و تصنیفات بسیار دارد، مثل سلک السلوک عشرہ مبشرہ کلیات و جزئیات و طوطی نامہ نظائر آں، و ہمہ تصنیفات وے دراں مرتبہ ہستند کہ متشابہ و متشاکل شدہ اند، و سلک السلوک او بغایت کتاب شیرین و نمکین است بزبان لطیف و مشتمل بر حکایات مشائخ و کلمات ایشاں و اکثر تصنیفات وی ملو است بقطعہا کہ بہ یک طریقہ و یک نہج واقع ا

چنانکہ ~ نخشبی خیر با زمانہ بساز — ورنہ خود را نشانہ ساختن است
عاقلان زمانہ می گویند — عاقلی با زمانہ ساختن است

تمطے کی لکھی ہوئی ستر کہانیاں" اس کتاب سے باون کہانیاں انتخاب کرکے مولانا نخشبی نے سلطان محمد خلجی (۷۲۵ھ م ۱۳۲۴ء – ۷۵۲ھ م ۱۳۵۱ء) کے کسی امیر الامراء کی فرمایش پر ۷۳۰ھ م ۱۳۳۰ء میں طوطی نامہ کو تالیف کیا۔ یہ کتاب بمبئی میں چھپ گئی ہے اور دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے ہیں۔

(۱) ترکی۔ سلطان سلیمان اعظم ۹۲۶ھ م ۱۵۲۹ء – ۹۷۴ھ م ۱۵۶۶ء کے حکم سے ترجمہ ہوا۔

(۲) دکھنی۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ ۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۶ء – ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء کے حکم سے ابن نشاطی نے ترجمہ کیا۔ نادر الوجود کتاب ہے۔ کتب خانہ فورٹ ولیم کلکتہ میں اس کا صرف ایک نسخہ ہے۔ ابن نشاطی دکن میں بہت بڑا شاعر ہوا ہے۔ آواری تخلص کرتا تھا۔ اس کی تصنیفات سے طوطی نامہ کے علاوہ پھول بن بھی نہایت عمدہ کتاب ہے۔

(۳) انگریزی۔ جرانس (Jarranus) نے ترجمہ کیا ہے اور ۱۲۰۷ھ م ۱۷۹۲ء میں بمقام لندن چھپا ہے۔

(۴) اردو۔ از ملا محمد قادری۔ یہ بزرگ سترھویں عیسوی میں گذرے ہیں۔ ترجمہ اس زمانہ کے شرفائی روزمرہ میں ہے۔ برٹش میوزیم میں اس کے دو نسخے ہیں جن میں سے ایک نہایت خوشخط ہے اور رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ م ۱۷۷۹ء میں بمقام الٰہ آباد اس کی کتابت ہوئی ہے۔ کتب خانہ انڈیا آفس میں تین نسخے ہیں منجملہ ان کے ایک نسخہ ۱۲۱۷ھ م ۱۸۰۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ میرے کتب خانہ میں بھی ایک نسخہ ہے جو ۱۵۔ ربیع الاول ۱۲۴۲ھ م ۱۸۲۶ء میں لکھا گیا ہے۔ اس اردو ترجمہ کا یورپ کی کئی زبانوں میں

ترجمہ چھاپا ہے۔ منجملہ اُن کے یہ ترجمے بہت مشہور ہیں۔

(۱) بزبانِ جرمن - از پروفیسر ایکن (I kan.) جو ۱۸۲۲ء
میں بمقام سٹاٹگرٹ (Stuttgart.) چھپا ہے۔

(۲) بزبانِ جرمن از جارج روسن (Georg Rosen.)
جو ۱۸۵۸ء میں بمقام لیپزگ (Lepsig.) طبع ہوا ہے۔

(۳) بزبانِ انگریزی از گلاڈوین (Gladwin.)
جو ۱۸۰۰ء میں بمقام کلکتہ اور ۱۸۰۱ء میں بمقام لندن چھپا ہے۔

پہلے زمانہ میں جو انگریز سرکار کمپنی کی طرف سے ملازم ہو کر ہندوستان میں آتے تھے، انہیں کاروبار کے لئے یہاں کی زبان سیکھنا ضروری تھا چونکہ اُردو میں ایسی کتابیں موجود نہ تھیں جو ان کی تعلیم کے لئے مفید و مناسب ہوتیں، اِس لئے اُنیسویں صدی کے شروع میں مسٹر جان گلکرسٹ نے کلکتہ فورٹ ولیم میں اُردو کتابوں کی تصنیف و تالیف کا ایک محکمہ قائم کیا اور دہلی لکھنؤ سے بڑے بڑے زباندان عالم بلوائے اور اُن سے بہت سی کتابیں تالیف و ترجمہ کرائیں۔ میر شیر علی افسوس نے سنہ ۱۲۱۴ھ سنہ ۱۷۹۹ء میں گلستان کا ترجمہ کیا جو باغِ اُردو کے نام سے مشہور ہے۔ اِس کے بعد سنہ ۱۲۲۰ھ سنہ ۱۸۰۵ء میں آرائش محفل لکھی۔ میر کاظم علی جوان نے سنہ ۱۲۱۷ھ سنہ ۱۸۰۲ء میں نواز کبیشر کے ترجمہ بھاکھا سے شکنتلا کا ترجمہ کیا۔ منشی نہال چند نے سنہ ۱۲۱۹ھ سنہ ۱۸۰۴ء میں گل بکاؤلی لکھی، اکرام علی نے سنہ ۱۲۲۵ھ سنہ ۱۸۱۰ء میں اخوان الصفا کے پہلے رسالہ کا ترجمہ کیا۔ سری لالوجی نے سنہ ۱۲۲۵ھ سنہ ۱۸۱۰ء میں سنگھاسن بتیسی، پریم ساگر، راج نیتی، لطائف ہندی تالیف و ترجمہ کیں۔ مظہر علی

نے سنہ ۱۲۱۸ھ م سنہ ۱۸۰۳ء میں بیتال پچیسی لکھی۔ میر بہادر علی حسینی نے فارسی زبان سے سنسکرت کی مشہور کتاب ہتہ اُپدیش کا ترجمہ کیا۔ مولوی حفیظ الدین احمد نے علامی ابو الفضل کی کتاب عیار دانش ترجمہ کی اور اس کا نام خرد افروز رکھا۔ میر امن دہلوی نے سنہ ۱۲۱۵ھ م سنہ ۱۸۰۱ء میں چہار درویش لکھی۔ پھر گنج خوبی کے نام سے اخلاق محسنی کا ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۲۱۶ھ م سنہ ۱۸۰۱ء میں حیدر بخش حیدری نے ملا محمد قادری کے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھ کر طوطا کہانی نام رکھا۔

سید حیدر بخش حیدری دہلی کے رہنے والے تھے، نواب علی ابراہیم خاں[1] سے تعلیم پائی تھی۔ غلام حسین خان غازی پوری سے تلمذ حاصل تھا۔ طوطا کہانی کے علاوہ اُن کی اور بھی بہت سی کتابیں ہیں۔

(۱) آرائش محفل یعنی قصہ حاتم طائی۔ جو سنہ ۱۲۱۶ھ م سنہ ۱۸۰۱ء میں تالیف ہوا اور ہندوستان کے مشہور مطابع میں چھپا ہے۔

(۲) گل مغفرت، اس کا دوسرا نام دہ مجلس ہے۔ اور اس میں حضرت نبی اکرم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے حالات ہیں۔ بمبئی میں کئی بار چھپی ہے۔

---

[1] نواب علی ابراہیم خاں مشہور ادیب اور مورخ ہیں۔ پٹنہ کے باشندے تھے اور بعہد لارڈ کارنوالس گورنر جنرل بہار کے قاضی القضات مقرر ہوئے۔ پھر گورنر بنائے گئے سنہ ۱۲۰۸ھ م سنہ ۱۷۹۳ء میں وہیں انتقال کیا۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ مثلاً اُن کے بعض کتابوں کے یہ نام ہیں (۱) گلزار ابراہیم جو شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔ (۲) و (۳) خلاصۃ الکلام و صحف ابراہیم یہ دونوں فارسی شعراء کے تذکرے ہیں (۴) وقائع جنگ مرہٹہ۔ یہ کتاب ۱۸۱۳ء میں لکھی گئی ہے۔ میجر فلر نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

(۳) گلزار دانش - ملا عنایت اللہ کی مشہور کتاب بہار دانش کا ترجمہ ہے۔

(۴) تاریخ نادری - جس میں نادر شاہ کے حالات ہیں۔

طوطا کہانی ۱۲۵۰ھ بمطابق ۱۸۳۵ء میں بمقام لندن ولیم واٹسن کے مطبع میں چھپی ہے اس کے ساتھ لغات اور محاورات کا فرہنگ بھی شامل ہے۔ جو مشہور ہندوستانی لغات نویس مسٹر وربس کی تصنیف ہے۔ ہندوستان میں لکھنؤ کانپور دہلی لاہور کے اکثر مطابع میں چھپی ہے۔ مطبع اودھ اخبار لکھنؤ میں ۱۸۷۶ء سے لیکر اب تک دس ایڈیشن ہوئے ہیں۔ کسی برہمن پنڈت نے طوطا کہانی کا اردو سے لفظ بہ لفظ ناگری بھاشا میں ترجمہ کیا ہے جس کا نام شوک بہتری ہے اور ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں مطبع اودھ اخبار لکھنؤ میں چھپا ہے۔

سید شمس اللہ قادری

قوّت خیال

ایک چھوٹا سا رسالہ انگریزی کی ایک مقبول کتاب سے ترجمہ کرکے مفتی محمد انوار الحق ایم۔ اے نے شائع کیا ہے جو ریاست ابد دولت بھوپال میں صیغۂ تعلیم کے سکرٹری ہیں اور لاہور کے فاضل مفتی مولوی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی شمس العلماء کے صاحبزادے ہیں۔ مضمون عمدہ اور طرز ادا دلکش ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ آدمی اپنے خیالات اچھے رکھنے سے حقا بن سکتا ہے۔ اور بُرے خیالات رفتہ رفتہ انسان کو بُرائی کی طرف لیجاتے ہیں۔ مفتی صاحب نے ترجمہ ایسا کیا ہے جو اُن نقائص سے جو تراجم میں عموماً موجود ہوتے ہیں۔ بچا ہوا ہے۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ:- ایم محمد خاں۔ ایکا بی۔ چوک موچی دروازہ۔ لاہور۔ یا خود صاحب مترجم۔ بھوپال۔

کے بعد اشوک کی حکومت میں یعنی ڈھائی سو سال قبل مسیح میں ہندوستان کا حکومتی مذہب بنگیا
اور تمام ملک میں پھیل گیا۔ جیسا کہ ہم باب سوم میں دیکھینگے۔ اس مقام پر ہم صرف اُس
زمانے کے برہمنی مذہب سے بحث کرینگے۔

قیاساً تو ہندو مذہب ہمیشہ وید سے مشتق خیال کیا جاتا ہے یہ کتابیں اس درجہ
قدیم ہیں کہ استدلال انہیں سے ہوا کرتا ہے۔ ویدک دیوتا ہمیشہ کے ہو رہ گئے
ہیں۔ لیکن عملاً اصلی مذہب میں سے انہیں خارج ہوگیا ہے۔ ایک طرف توحید کے فلسفی
مباحث انسان کی آمد و رفت زندگی اور دنیا کے انجام کے متعلق مذہب میں شامل
ہوگئے ہیں اور دوسری طرف یہ امر محسوس ہوتا ہے کہ برہمنوں کے مذہبی اصول نہایت
سخت ہوگئے ہیں۔ اعمال اور چڑھاوؤں پر اس درجہ زور دیا گیا ہے کہ گویا
اُن کی تاثیر دیوتاؤں کی قوت سے بھی بڑھ گئی ہے۔ سب سے زیادہ تو بڑی
اعمال ہیں جو اس قدر بے معنی اور بیہودہ ہیں کہ اُن کی مثال دوسرے
مذاہب میں نہیں مل سکتی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وید کی دنیا کو کسی سرد کرۂ زمہریر
کی ہوا نے ٹھٹھرا کر بے جان کردیا ہے۔ وہ وید کے دیوتاؤں کا گروہ اور وہ
قوائے فطرتی کا عجب و غریب سماں جس سے رگ وید کے سوکت بھرے ہوئے
ہیں ہمیشہ کے لیے تلف ہوگیا۔ نہ تو آفتاب اپنے فتح کے رتھ پر سوار ہوکر آسمان
پر چڑھتا ہے اور نہ صبح اُس کے آنے سے پہلے مشرق کی طرف اپنا تبسم
دکھاتی ہے۔ موافق اور سازگار ہواؤں کے جھونکے ابر کی گایوں کو آسمان
کی چراگاہ پر نہیں لیجاتے اور نہ اُنکے پُرآب تھنوں میں سے وہ موسلا دھار
بارش ہوتی ہے جو ہر شے کو زندہ کردیتی ہے۔ یہ سارے شاعرانہ توہمات ختم
ہوگئے اور اُنکے ساتھ ہی مذہب کی دلچسپی اور دلفریبی بھی مرمٹی۔ اس مقام پر
ہم برہمنی مذہب کی عبادات اور اعمال اور چڑھاوؤں کے تفصیلات میں نہیں

جا سکتے۔ اُن سے ہم آگے چل کر اُس باب میں بحث کرینگے۔ جہاں ہندوستان
کے موجودہ مذہب پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہاں ہم صرف اُن فلسفی اعتقادات کی
طرف توجہ دلائینگے۔ جو ہندو مذہب میں پھیل گئے ہیں اور اُنکے لئے ہم منو شاستر[1]
سے کام لینگے کیونکہ منو میں برہمنوں اور بیشتر ہندوؤں کے خیالات جمع کر دیئے گئے ہیں۔
رگ وید میں بھی دیوتاؤں کی خصائص کا زیادہ تعین نہیں ہے اور اگرچہ انہیں
میں سے برہمنی دیوتا شیوا اور وشنو پیدا ہوتے ہیں لیکن اُنکے خصائص بھی غیر معین
ہیں۔ یہ گویا برہما کے انداز میں ہے تمام مخلوقات میں ساری اور ہے وہ برہما کا ترجمہ
برہمنی مذہب میں کم ہوگیا ہے۔ وید میں تو برہما ساری مخلوقات عالم کا خالق اور حاکم
ہے لیکن برہمنی مذہب میں اس کی خالقی حیثیت باقی نہیں رہی ہے وہ صرف
مخلوق میں ساری ہے اور بُرے اور بھلے کے ساتھ اُن کی کل زندگانی کے
دورہ میں اُنکے دُکھ درد خوشی غم میں شریک اور اُنکے امتحانات اور روحانی ترقی
در منزل میں اخیر تک ساتھ دینے والا رہ گیا ہے۔ منو لکھتے ہیں -

"روح مطلق یعنی برہما تمام مخلوقات میں ساری ہے خواہ وہ اعلیٰ درجہ کے
ہوں یا ادنیٰ درجہ کے۔ اس روح مطلق میں سے بے انتہا شکلیں اس طرح
نکلتی ہیں جس طرح آگ سے چنگاریاں اور یہ شکلیں عالم کی مختلف مخلوقات

[1] مصنف کتاب میں یہ نہیں بتاتا کہ جن مختلف کتابوں سے عبارت نقل کرتے ہیں انکا
حوالہ مطلق نہیں دیتے مثلاً رگ وید کے بہت سے اقتباسات اور منو شاستر کے دوسرے
دوسرے اقتباسات اور اسی طرح اور کتابوں کے اقتباسات مصنف نے جابجا اپنی کتاب میں درج کئے
ہیں۔ اگر میرے پاس ایک غیر معمولی ذخیرہ سنسکرت لٹریچر کا ہوتا اور مجھے اس پر سلیقہ عبور ہوتا
تو اُن حوالوں کا نکالنا ممکن ہو سکتا تھا۔ اب بھی میں نے کم سے کم دو دفعہ کی محنت سے ان اقتباسات
کا پتہ لگایا ہے اس کے ساتھ بھی متعدد دوسرے حوالوں کا پتہ اسوقت تک نہیں لگا ہے۔
(مترجم)

کو حرکت میں لاتی ہیں۔ (منوشاستر بارہواں باب ۱۴ و ۱۵)"

جس وقت یہ اعتقاد ہو کہ روح مطلق تمام مخلوقات میں سایر و دائر ہے اور ساری مخلوقات اس روح مطلق کا ظہور ہے تو پھر لازم آیا کہ انسان ہر ایک ذی روح کا خواہ کیسے خطرناک درندہ یا ضعیف سے ضعیف کیڑا کیوں نہ ہو لحاظ رکھے۔

"جو شخص خود اپنے میں اس روح مطلق کا احساس کرے جو تمام مخلوقات میں سایر ہے تو پھر اس کے نزدیک کل مخلوقات کا درجہ مساوی ہو جاتا ہے اور وہ اعلیٰ درجہ کو پہنچکر برہما میں شامل ہو جاتا ہے (منوشاستر بارھواں باب ۱۲۵")۔

"جو برہمن کسی سانپ وغیرہ کو مار ڈالے اور اسکا کفارہ دان کے ذریعہ سے نہ دے سکے تو اُسے چاہئے کہ ہر ایک کے بدلے علیحدہ پرائسچت کرے تاکہ اُس کا گناہ دُھل جائے۔ لیکن ایک ہزار ہڈی والے جانوروں یا ایک چھکڑا بھر کر بے ہڈی کے جانوروں کو مارنے کے لئے اس پر وہی پرائسچت لازم ہے جو شودر کے قتل کرنے کے لئے (منوشاستر گیارہواں باب ۱۴۰ - ۱۴۱)"۔

روح کا مفہوم خدا کے مفہوم سے علیحدہ نہیں ہے۔ ہر ایک ذی روح کی روح، روح مطلق کا ایک جزو ہے۔ عالم کے کل دیوتاؤں انسانوں اور حیوانات کی ارواح کا مجموعہ روحِ مطلق ہے۔ یہی تنوع اور غیر شخصی خدا ہے۔ جو تمام عالم کی قوتوں زندگیوں اور تغیرات کا منبع ہے۔

"روح مطلق تمام دیوتاؤں کا مجموعہ ہے اور عالم کا دارومدار روح مطلق پر ہے۔ روح مطلق ہی تمام عالم کی ذوی الارواح کے افعال اور حرکات کا سبب ہے" (منوشاستر بارھواں باب ۱۱۹)۔

برہمن مذہب میں دُنیا کا قادر مطلق کوئی ایسا جوہر نہیں جسکو انسان کا متخیلہ پاسکے۔ یہ صرف ایک غیر مادی سبب ہے۔ جس کی تفاوت نہیں ہو سکتی اور تمام عالم میں ساری و دائم اور عالم کو چلانے والا ہے۔ وید کے زمانہ میں جس طرح پوجاری اگنی کو قادر مطلق سمجھتا اور بعض وقت خیال کرتا ہے کہ خود اس کی رگوں میں اگنی دوڑ رہا ہے۔ اسی طرح برہمنی مذہب میں برہما کا درجہ مانا گیا ہے۔ منو لکھتے ہیں۔ ۔

انسان کو چاہیئے کہ رُوح مطلق (وجود مطلق) پر جو کہ تمام عالم کا بادشاہ اور حاکم ہے وہ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے بھی چھوٹا ہے اور خالص سونے کی طرح چمکتا ہے اُسکا ادراک صرف دماغ خواب یا مراقبہ کی حالت میں کر سکتا ہے بعض اُسے اگنی کے نام سے پکارتے ہیں۔ بعض منو اور پرجاپتی کے نام سے بعض اُسے اِندر کہتے ہیں۔ بعض رُوح اور بعض ازلی برہما۔ وہ پانچ شکلوں میں تمام عالم کی مخلوقات میں ساری و دائر ہے اور انہیں پیدائش نمو اور انحطاط کے ذریعہ سے اس طرح حرکت میں رکھتا ہے جیسے گاڑی کا چاک حرکت کرتا ہے (منو ساستر بارھواں باب ۱۲۲ و ۱۲۳ و ۱۲۴)۔

غرض یہ ہمہ اوست کا مذہب ہے لیکن آریوں کا ہمہ اوست نہیں ہے۔ جس میں کل قوائے فطرتی بجائے خود خدا تھے گر کیسے خدا جن میں شان و شوکت رنگ و بو صورت و آواز رحم و غضب موجود تھے۔ یہی خصائص ان خداؤں کو اپنے بندوں کے لئے آشکار کئے ہوئے تھے۔ برہمنی مذہب کا ہمہ اوست پوشیدہ ہے۔ اب بھی وہ عناصر میں موجود ہے لیکن اس طرح جس طرح کوئی قید خانہ میں ہو۔ اسکی اصلی عظمت و شان بحال باقی رہی ہے۔ نہ اس میں جسم ہے نہ صورت نہ ارادہ نہ جان۔ اور جو کوئی مخلوق گناہوں سے پاک ہو جاتے وہ اسکا مثل بنجاتا ہے۔ یا اس میں جذب ہو جاتا ہے

ں اخیر سعادت جاودانی تک پہنچنے کے لئے ہندو کے تخیلہ نے ایک غیر محدود سلسلہ زندگیوں کا فرض کیا ہے۔ انسان کی زندگی غیر محدود ہے۔ جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ اس سے پہلے بہت سی زندگیاں بسر کر چکا ہے۔ جو مرتا ہے اُسے ابھی بہت سی زندگیوں کا سلسلہ بہت سی صورتوں میں طے کرنا باقی ہے۔

مسئلہ تناسخ جو کل مذاہب ہند کا (جس میں مذہب بدھ بھی شامل ہے) اصولی مسئلہ ہے۔ انسان کے اعمال پر مبنی ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی ایک زندگی میں جس قسم کے اعمال کرتا ہے انہیں کے مطابق اس کی آئندہ زندگی معین ہوتی ہے۔ اس مسئلے کو منو نے بہت تصریح سے بیان کیا ہے۔ ان اعمال نیک یا بد کے رو سے جو انسان سے سرزد ہوں وہ آئندہ زندگی میں معزز یا ذلیل پیدا ہوگا۔ اُسکی رُوح کسی برہمن یا ولی یا دیوتا یا چنڈال میں، کم ذات یا کسی گدھے، سور یا سانپ میں۔ منو لکھتے ہیں:-

"اگر انسان کا نفس زیادہ تر نیک کام کرے اور بُرا کام کم کرے تو اُسکو جنت میں اپنے عناصر خمسہ (یعنی جسم) کے ساتھ خوشی ملیگی۔ لیکن اگر انسان کا نفس زیادہ تر بدی کرے اور بھلائی کم کرے تو وہ اپنے عناصر خمسہ سے علیحدہ ہو کر یم یعنی مالک دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ نفس یم کے عذاب سہنے کے بعد پاک ہو کر پھر انہیں پانچ عناصر میں داخل ہو جائیگا۔ یعنی دوبارہ پیدا ہوگا۔ پس انسان کو چاہیے کہ اس تناسخ کو جسکا دارومدار نیک و بد اعمال پر ہے اپنی عقل سے معلوم کر کے ہمیشہ نیکی کی طرف متوجہ ہو (منو شاستر بارھواں باب ۲۰-۲۳)"۔

"جو لوگ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں وہ مدت دراز تک

سخت عذابِ جہنم میں رہنے کے بعد مندرجہ ذیل صورتوں میں پیدا
ہوتے ہیں۔ برہمن کا قتل کرنیوالا کتے یا سور یا گدھے یا اونٹ یا
گائے یا بکری یا بھیڑ یا ہرن یا چڑیا یا چنڈال یا پلکس کی صورت
میں پیدا ہوگا۔ وہ برہمن جو کسی برہمن کا سونا چرائے ہزار مرتبہ
مکڑی سانپ چھپکلی۔ آبی جانوروں اور خطرناک پشاچ کی صورتوں
میں سے گزریگا" (منوشاستر بارھواں باب ۵۵ و ۵۷)۔

پس گویا انسان کی عقبیٰ کا دارومدار مذہب عیسوی کی طرح کسی خاص فعل پر نہیں اور
نہ انسان کی آخری حالت اور توبہ پر بلکہ اُس کے کل اعمال کے مجموعہ پر ہے اور
اس مجموعہ میں خفیف سے خفیف فعل بھی اپنی قیمت اور حیثیت رکھتا ہے منو
لکھتے ہیں:۔

"وہ افعال جو خیال اور زبان اور جسم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُنکے
نتائج یا تو اچھے ہوتے ہیں یا بُرے۔ انہیں اعمال سے انسان
کی مختلف حالتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ"
(منوشاستر بارھواں ب)۔

یہی اعتقادات ہیں جو ہندو کو سخت ریاضت کا پابند کر دیتے ہیں اور خفیف
سے خفیف کام کے کرنے اور چھوٹی سی چھوٹی حاجت نکالنے کو بھی اسکی
مرضی پر نہیں چھوڑتے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ بے احتیاطی یا غلطی بھی شدید نتائج
پیدا کرتی ہے اور ان نتائج سے بچنے کے لئے غلطی کے بعد ہی سخت طہارت
اور عبادت کے ذریعہ سے اسکو رفع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان غلطیوں
ان گناہ صغیرہ کی نسبت انسان کی رائے کچھ کام نہیں آتی نہ اس سے کچھ فائدہ
حاصل ہو سکتا ہے کہ گناہ کرتے وقت کسی نے دیکھا یا نہیں دیکھا۔ گنہگار خود

اپنے فعل کے نتائج کو سمجھتا ہے اور اسکو مٹانے کے لئے بعض صورتوں
میں نہایت سخت کفارہ دینے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ منوشاستر کے
اس باب کو جس میں پرایسچت یعنی کفاروں کا بیان ہے۔ دیکھنے کے بعد معلوم
ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جسکا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ ہندو کن سخت زنجیروں
میں جکڑے ہوئے تھے اور ویدی زمانہ کی آریا آزادی اور اس زمانہ کی جکڑبندی
میں کس قدر فرق عظیم تھا۔ وہ قدیم آزاد اور خوشحال مخلوق مرچکی تھی اور اسکی
جگہ ایک ایسی مخلوق نے لی تھی جو آنکھ بند کئے ہوئے حیوانات کی طرح بلا آرام
اور چین بلا کسی وقفہ کے شدید مصیبت کی بادیہ نوردی میں مبتلا تھی۔ یہی
حالت قدیم برہمنی مذہب کی اور جدید برہمنی مذہب کی کم و بیش یہی ہے صرف
فرق اسی قدر ہے کہ مذہب بدھ کی رحمدلی اور ہمدردی نے اسے بہت کچھ نرم
اور شیریں کردیا ہے۔

اس قدیم برہمنی مذہب کی سختیوں نے انسان کو اس درجہ جکڑبند کردیا
تھا کہ وہ دن آنے والا تھا جب اسکی زنجیریں خود بخود ٹوٹ جائیں۔

انسانی زندگی کا ہر فعل اس طرح باندھ دیا گیا تھا اور اسکے نتائج ایسے شدید
دکھائے گئے تھے کہ منجملہ مایوسیوں سے بھر گیا تھا اور زندگانی وبال ہوگئی
تھی۔ بجز فنا کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اطالیہ کے مشہور شاعر دانتے نے
اپنی کتاب جہنم میں جن عذابوں کی تصویر کھینچی ہے ان سے کچھ اندازہ ان مظالم
کا ہوسکتا ہے جن سے برہمنوں نے ہند کے باشندوں کو چاروں طرف
گھیر رکھا تھا۔ یہ عذاب پیدائش کے ساتھ شروع ہوتے تھے اور سالہائے
دراز تک بڑھتے ہی جاتے تھے یہانتک کہ انسان اس لائق ہو کہ روح
مطلق میں جذب ہوجائے یعنی فنا ہوجائے۔ برہمنوں کی مذہبی سختی نے

مخلوق کے دل میں نجات کی تمنا اس شدت سے پیدا کر دی تھی کہ آخر کو وہ نجات مل ہی گئی۔ اس زمانہ کے کئی صدیوں بعد روما میں بھی اگرچہ بہت ہی مختلف اسباب سے یہی حالت پیدا ہوئی اور مسیح کا ظہور ہوا۔

ہندوستان کے لئے بھی ایک شیریں کلام ہمدرد رحمدل مسیح آنیوالا تھا جو اس کی آواز تمام ایشیا میں گونجنے والی تھی۔ وہ کروڑوں مخلوق جو ذات کے عذاب میں صدیوں سے پس رہی تھی۔ جس کو مذہبی اعتقادات اور مذہبی قانون کی زنجیروں نے ایک دائمی مصیبت میں جکڑ رکھا تھا۔ دفعتہً جاگ اٹھی اور اسے یہ محسوس ہوا کہ مایوسیوں کی جلانے والی سموم کی جگہ رحمت و امید کی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ یہ نجات کا دینے والا بدھ کا مسیح ساکیا منی تھا جو مذہب بدھ کی خوشخبری کو تمام عالم میں پھیلانے والا تھا۔

سید علی بلگرامی

قدیم ہندوستان کی تہذیب

سے یورپ ایک کمیٹی اردو تراجم کے لئے قائم ہے جسکی طرف سے حال میں یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ جو مسٹر رومیش چندر دت آنجہانی کی مشہور معروف کتاب سولائزیشن اف انشنٹ انڈیا کے حصہ اول کا ترجمہ ہے ہمیں دیکھکر مسرت ہوئی ہے کہ یہ ترجمہ ایک مسلمان مترجم مسٹر ولایت احمد نے کیا ہے۔ ترجمہ عمدہ اور بامحاورہ ہے لیکن مترجم سنسکرت الفاظ سے ناآشنا معلوم نہیں ہوتے اور اس لئے انہیں ان سنسکرت الفاظ کے مطلب ادا کرنے میں جو مسٹر رومیش چندر دت کی کتاب میں جابجا آئے ہیں۔ بہت آسانی ہوئی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک بسیط مقدمہ مترجم کی طرف سے لکھا ہوا ہے۔ جو بہت دلچسپ ہے اور مصنف اور مترجم دونوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ جو کتاب کی دلچسپی بڑھاتی ہیں مصنف کی زندگی کے مختصر حالات بھی مقدمہ کے آخیر میں دئے گئے ہیں۔ ان اردو خوان اصحاب کیلئے جو اصل کتاب کو انگریزی میں نہیں پڑھ سکتے یہ ترجمہ نہایت کارآمد ہے اور صاحب مترجم نے حقیقت میں ایک مفید کام کیا ہے۔ ملنے کا پتہ گمٹ محلہ [illegible] پور۔ محمد رضا علی خان صاحب سکرٹری [illegible] کمیٹی۔

مجوزہ محمڈن یونیورسٹی

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد تو بیان ہو چکے۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ یونیورسٹی بنانے کے لئے ہمیں کیا تدابیر کرنی چاہئیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ محمڈن یونیورسٹی کے عمل صورت میں لانے کے لیے جس قدر کوشش ہم کرتے ہیں وہ بہت کم ہیں۔ ایک تو کانفرنس کے اجلاسوں کے موقعوں پر چند تقریریں ہو جاتی ہیں جن کے ذریعہ سے کچھ چندہ جمع ہو جاتا ہے اور دوسرے بعض رئیس کوئی رقم نقد دیدیتے ہیں یا کچھ ماہوار مقرر کر دیتے ہیں تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے رفتار کافی تیز ہے۔ ایسے زبردست قومی مسئلہ کی طرف جس پر ہماری تمام ترقیوں کا انحصار ہے۔ جمہور اہل اسلام کی ایسی معمولی توجہ سخت حسرت و یاس پیدا کرنے والی ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ جو چیز ہمیں لامذہبی سے بچا نیوالی ہو اور ایک معزز قوم بنانے والی ہو اسکے لئے ہم زیادہ کوشش نہ کریں۔ ایک طرف تو ہم زور شور سے چیخنے ہیں کہ ہمیں ہمارا مذہب بہت پیارا ہے اور ہم اس پر جان دینے کے لئے تیار ہیں۔ اور ہم دیکھتے جاتے ہیں کہ موجودہ نظام تعلیم کی وجہ سے مسلمان عام طور سے مذہب کو بھولتے جارہے ہیں۔ تو ہمیں کچھ صدمہ نہیں ہوتا اور نہ ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں اور اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم اور طریقۂ امتحان سے ایک تو ہمارے طلبار کی صحتیں خراب ہو رہی ہیں اور دوسرے وہ نیم تعلیم یافتہ جماعت کا احاطہ وسیع کر رہے ہیں اور حقیقی قابلیت اُن

میں نہیں پیدا ہوتی۔ صاحبو! ہم اس بات کو سمجھ رہے ہیں لیکن چپ بیٹھے ہیں اور ہمارے دل پھٹ نہیں جاتے۔

اگر ہمارا تھوڑا ذاتی نقصان ہو جاتا ہے تو ہمیں بہت کلفت ہوتی ہے لیکن ہماری کل قوم کا اس قدر سخت نقصان ہو رہا ہے اور ہمیں کچھ خبر نہیں۔ ہمیں اپنی کوششوں کا قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی کوششوں سے مقابلہ کرنا چاہیے جنہوں نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کے لئے اپنے مال اور جانیں قربان کر دیں۔ صاحبو! ہم جو سمجھ رکھنے کے مسلمانوں کی بربادی دیکھتے ہوئے اُن کی حفاظت کی کوشش نہ کرنا بڑا زبردست الزام ہے اور خدا کو اس کا جواب دینا پڑے گا۔

(۱) میرے خیال کے مطابق سب سے پہلی ترکیب یونیورسٹی کو عملی صورت میں لانے کی یہ ہے کہ ہمیں غور کر کے فیصلہ کر لینا چاہیے کہ ہم نے یونیورسٹی کے لئے اُس قدر کوشش نہیں کی۔ جس قدر اُس کی اہمیت سمجھتے ہوئے ہمیں کرنا چاہیئے تھی اور ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہم اب اس طرف زیادہ متوجہ نہ ہوں گے تو خدا ہم سے جواب طلب کرے گا کہ باوجودیکہ تم سمجھتے تھے کہ مسلمان تباہ ہو رہے ہیں اور تمہیں معلوم تھا (سرسید نے بتلا دیا تھا) کہ یونیورسٹی ہی اُن کے درد کا درمان ہے تو تم نے اُس کے لئے اپنی جانیں تک کیوں نہ لڑا دیں۔

(۲) دوسری ترکیب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے دلوں میں اس بات کا احساس پیدا کرانے کی لگاتار کوشش کی جائے کہ محمڈن یونیورسٹی ہماری قومی حیات کے لئے لازمی ہے۔ ہم کو یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ مسلمان اچھی طرح سے یونیورسٹی کی اہمیت کو سمجھ گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بہت کم مسلمان اس یونیورسٹی کی ضرورت کو سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کو عام طور سے اس اہمیت کا احساس کرانے کی بہترین تدبیر میرے خیال میں یہ ہے کہ ہمارے رہنما نہایت غور و خوض کرنے کے بعد

ایک رسالہ لکھیں جس میں وہ عام فہم طریقہ سے بخوبی ثابت کریں کہ اپنی یونیورسٹی بغیر ہمارا ترقی کرنا قریب ناممکن ہے۔ نیز یہ کہ ہمارے مذہب کے قائم رہنے کے لئے بھی ایک یونیورسٹی کا ہونا لازمی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس یونیورسٹی کے کورس یعنی نصاب تعلیم کی ایک اسکیم بھی اس رسالہ میں شائع کی جائے۔ جس سے مسلمانوں کو معلوم ہو کہ فی الحقیقت اس طریقہ تعلیم سے ہم ترقی کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے کم از کم اتنے روپیہ کی ضرورت ہے۔ اور اس کے بعد ہم چارٹر طلب کر سکینگے۔ آج تک تو مسلمان یہی پوچھتے رہتے ہیں کہ اپنی یونیورسٹی بنانے میں نفع کیا ہے۔ اور خدا جانے اس کام کے لئے دس لاکھ کی ضرورت ہے۔ یا چوبیس لاکھ کی یا ایک کروڑ کی بجید کوشش کرنا چاہئے کہ اس رسالہ میں ہر فرقہ کے زبردست علماء کی تصدیق بھی درج ہو کہ محمڈن یونیورسٹی مفید چیز ہے اور اس کے لئے کوشش کرنا اور روپیہ دینا ثواب ہے۔ صاحبو! عام مسلمانوں پر علما کا بہت زیادہ اثر ہے اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ علماء عام طور پر ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر کوشش کیجائے اور نواب وقار الملک بہادر بعض علماء کے پاس تشریف لیجا کر اُن کو اچھی طرح سے یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد بتلا دیں تو اس زمانہ میں بہت کم عالم ہونگے جو ہماری تجویز کی مخالفت کرینگے۔ صاحبو! رامپور کے علما بہت سخت ہیں۔ لیکن ذاتی تجربہ کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوشش کیجائے تو اُن میں سے بھی اکثر اس قسم کی تحریریں دیدینگے۔ اور ان تحریروں کا عام مسلمانوں پر بہت زبردست اثر پڑیگا۔ عام مسلمان جلیل القدر علماء کی باتوں کو بڑے بڑے افسروں کے احکام سے زیادہ وقیع سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا جائے کہ گورنمنٹ اس تجویز کی مخالف نہیں ہے بلکہ اگر ہم متحد ہو کر کوشش کریں اور گورنمنٹ سمجھ لے کہ یہ

مسلمانوں کی حقیقی خواہش ہو تو گورنمنٹ ہمیں چارٹر عنایت کریگی۔ کیونکہ سابق لفٹنٹ گورنر جیمس لاٹوش اور لارڈ کرزن اور آنریبل مسٹر مارش نیسے حضرات اس اسکیم کے جائز ہونیکا فتویٰ دیچکے ہیں اور توقع ظاہر کرچکے ہیں کہ مسلمانوں کو چارٹر مل سکیگا نیز ہماری گورنمنٹ ایسی مہربان اور بیدار مغز ہے کہ وہ اپنی رعایا کی حقیقی اور جائز خواہشوں کو پامال کرنا پسند نہیں کرتی۔ اس سبب سے ہمیں چارٹر ملنے کا پورا یقین ہے۔ رسالہ لکھنے کی اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اکثر مسلمان خواہ نخواہ اس غلطی میں پڑے ہیں کہ گورنمنٹ ہم کو چارٹر نہ دیگی اور اس سبب سے وہ سست اور کاہل بنکے ہیں

جب یہ رسالہ تیار ہوجائے تو اس کی اشاعت ہندوستان میں نہایت کثرت سے کرنا چاہئے اور کوئی مقام ایسا نہ رہنے پائے جہاں یہ نہ پہنچے

(۳) تیسری تدبیر یہ ہے کہ مسلمان ایڈیٹران اخبارات کو ایسا ہم آہنگ بنانا چاہیے تاکہ وہ اس معاملہ میں ہمیں پوری مدد دیں۔ اور لگاتار مضامین شائع کریں تاکہ مسلمانوں کو اچھی طرح معلوم ہوجائے کہ اپنی یونیورسٹی کس قدر اہم اور ضروری ہے۔ اخباروں کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ صرف مولوی انشاءاللہ صاحب کی تحریروں سے مسلمانوں نے حجاز ریلوے کے لئے ایک لاکھ روپیہ جمع کر دیا اگر مسلمانوں پر یہ بات ثابت کردیجائے کہ یہ کام نہایت مقدس اور ضروری ہے تو روپیہ کی کمی نہیں ہے۔ مسلمان اب بھی حوصلہ مند ہیں اور معمولی کاموں میں بہت سا روپیہ خرچ کردیتے ہیں ؎

کسے کہ محرم بادِ صباست می داند   کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی است

(۴) چوتھی ترکیب یہ ہے کہ جب ان رسالوں اور اخبارات کے مضامین سے کافی طور پر آئندہ کوششوں کے لئے زمین تیار ہوجائے تو سخت کوشش کیجائے کہ خاص خاص مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن مرتب ہو اور وہ ہندوستان کے بڑے

کے شہروں اور مسلمان ریاستوں میں دورہ کرے اور مسلمانوں سے صاف طور
سے آخری دفعہ کہہ دے کہ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو نہایت جوش سے کوشش
کرو تاکہ یونیورسٹی بن جائے اور اس طریقے سے ہم برباد ہونے سے بچ جائیں میں
اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے تھوڑے دن غفلت اور کی
تو وہ بدقسمت مسلمان رہنما جو اس وقت چراغ سحری ہو رہے ہیں اس دنیا میں نہ
رہینگے اور وہ دن سخت ہیبت ناک ہوگا۔ کیوں کہ اس دن کوئی ایسا مسلمان
نہ رہیگا جس کے چاروں طرف ہندوستان کے مسلمان جمع ہوسکیں۔ یہ ڈیپوٹیشن
تمام ملک میں دورہ کرے اور جس جس صوبہ میں جائے وہاں کے بھی خاص خاص
آدمی اپنے ساتھ کرے۔ یہ ڈیپوٹیشن ہندوستان کے ہر صوبے کے خاص خاص شہروں
میں لکچر دے اور یونیورسٹی کے لئے روپیہ جمع کرے۔ نیز یہ ڈیپوٹیشن علماء
کی ہمدردی بھی حاصل کرے اور انکے ذریعہ سے جامع مساجد وغیرہ میں وعظ کرائے
جس سے ظاہر ہو کہ مجوزہ محمڈن یونیورسٹی ایک مقدس کام ہے جس کے لئے
کوشش کرنے سے ثواب دارین حاصل ہوگا۔

(۵) پانچویں تدبیر یہ ہے کہ اس بات کی کوشش کیجائے کہ مسلمانوں کے بڑے
بڑے اوقاف کی آمدنیوں میں سے ایک خاص حصہ محمڈن یونیورسٹی کے لئے مقرر
ہوجائے۔ کیونکہ اکثر اوقاف کا ایک حصہ تعلیم کے لئے بھی وقف کیا گیا ہے
جیسے محمد علی شاہ والئی اودھ کا وقف ہے جس کا قریب چوتھائی حصہ مسلمانوں
کی تعلیم کے لئے مقصود ہے۔

(۶) چھٹی تدبیر یہ ہے کہ مسلمان رئیسوں اور زمینداروں سے عرض کیا جائے
کہ براہِ مہربانی زمینوں کی آمدنی میں سے نہایت ہلکا سالیانہ مثلاً ایک پائی فی روپیہ
بالفعل پائی فی روپیہ یونیورسٹی کے لئے مقرر کردیں۔

(۷) ساتویں تدبیر یہ ہے کہ خاص مسلم یونیورسٹی کے لئے باقاعدہ پراونشل کمیٹیاں اور ڈسٹرکٹ کمیٹیاں قائم کی جائیں تاکہ وہ لگاتار کوشش کرتی رہیں۔ ان کمیٹیوں کی نگرانی کے لئے ایک خاص سنٹرل کمیٹی علیگڈھ میں قائم کی جائے اور اس کے لئے ایک مستقل علیحدہ دفتر بنایا جائے۔ پراونشل اور ڈسٹرکٹ کمیٹیوں کی نگرانی کے لئے سنٹرل کمیٹی کافی تعداد میں ایجنٹ بھی روانہ کرے۔ ان کمیٹیوں کے لئے ایک خاص بات یہ بھی کی جائے کہ اگر ممکن ہو سکے تو ان کمیٹیوں کے ممبروں کو ذمہ دار بنا دیا جائے کہ کم از کم اپنے حلقہ کے مسلمانوں سے اوسطاً فی مسلمان ایک ایک آنہ وصول کریں یعنی فرض کیجئے کہ علیگڈھ شہر میں چالیس ہزار مسلمان ہیں اور آس پاس کے دیہات میں ساٹھ ہزار مسلمان ہیں تو علیگڈھ کی کمیٹی کو کم از کم ایک لاکھ آنے وصول کرنا چاہئیں یعنی تقریباً چھ ہزار روپیہ۔ اگر چندہ جمع کرنے کا کام اس طریقہ سے تقسیم کیا جائے کہ کم از کم اتنے روپیہ کی ہر کمیٹی ذمہ دار ہے تو میرا خیال ہے کہ زیادہ روپیہ جمع ہو سکیگا۔ نہایت عمدہ انتظام کرنا چاہئے کہ ہر پراونشل کمیٹی اپنی ڈسٹرکٹ کمیٹیوں کی ذمہ دار اور نگران ہو۔ ہمارے اکثر کام منتشر اور پریشان کوششوں سے خراب ہوتے ہیں۔ اس لئے اس طرف خوب توجہ کرنا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے کالج کے طلبا بھی اس کام کے لئے تعطیل کے دنوں میں خاص طور سے کوشش کرینگے۔ خاصکر وہ طالب علم جو بی۔ اے کا امتحان دے چکیں۔ انکے لئے تھوڑا زمانہ ایسے اہم کام کے لئے صرف کرنا مشکل نہیں ہے۔ (اگر مجھے کوئی خاص ضرورت پیش نہ آئی اور ہماری قوم کے رہنما اچھی طرح سے کوشش شروع کر دیں تو میں بھی بی۔ اے کا امتحان دینے کے بعد فی الحال کم از کم ایک سال کے لئے اپنی خدمات یونیورسٹی فنڈ کے لئے وقف کرنے کو تیار ہوں)۔

(۸) آٹھویں تدبیر یہ ہے کہ کالج کی اندرونی حالت درست کرنے کی خاص طور سے کوشش کرنا چاہئے تاکہ ہمارا کالج یونیورسٹی کا چارٹر لینے کا مستحق ہو جائے ہم کو اس خیال میں نہ رہنا چاہئے کہ جب کئی کالج قائم ہو چکینگے جبھی ہم چارٹر طلب کر سکتے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ جرمن کی اکثر یونیورسٹیوں میں صرف ایک ہی کالج ہے۔ اسی طرح ٹرنٹی کالج ڈبلن کو یونیورسٹی کے تمام حقوق حاصل ہیں ہمیں یہ بھی خیال نہ کرنا چاہئے کہ پہلے تمام علوم و فنون کے پڑھانے کا انتظام ہو چکیگا تو اس کے بعد ہمیں چارٹر مل سکیگا۔ یہ خیال بھی غلط ہے چنانچہ بولونا کی یونیورسٹی میں ایک عرصہ تک صرف قانون ہی کی تعلیم ہوتی رہی (صفحہ ۱۴۹ رپورٹ کانفرنس لاہور)

اس لئے ہمیں سخت کوشش کرنا چاہئے کہ اول موجودہ مضامین ہی کی تعلیم کا کامل انتظام کریں۔ تاکہ ہمیں چارٹر آسانی سے مل سکے۔ اکثر یہ شکایت سنی جاتی ہے کہ کالج میں چند مضامین کی تعلیم خراب طریقہ سے ہوتی ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور کالج کی یہی حالت رہی تو چاہے کسی قدر روپیہ بھی جمع ہو جائے ہمیں چارٹر نہ مل سکیگا۔ اس سبب سے کالج کے منتظمین کا فرض ہے کہ سخت کوشش کریں۔ کہ موجودہ مضامین کی پڑھائی عمدہ طرح سے ہو تاکہ کالج چارٹر لینے کا مستحق بنے۔

(۹) نویں تدبیر یہ ہے کہ عمدہ اور پرجوش مسلمان طلبا زیادہ تعداد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ بھیجے جائیں۔ بس شرط یہ کہ وہ محمڈن یونیورسٹی کو اپنی خدمات سپرد کر کے مسلمانوں کی علمی خدمت کرینگے۔ نیز ایسے نیچے رنگ کے طلبا کو جو ایم۔اے۔ یا بی۔اے پاس ہوں وظیفے دیکر دیوبند یا ندوۃ العلما بھیجا جائے تاکہ وہ عمدہ عالم بن سکیں اور ہماری یونیورسٹی کی دینیات کی پروفیسری

کے لئے تیار ہوں۔ یہ مقصد اس طرح بھی پورا ہوسکتا ہے کہ دیوبند یا ندوہ کے ہونہار فارغ التحصیل طلبار کو وظائف دیکر خاص طور سے علیگڈھ میں جدید تعلیم دیجائے علاوہ ازیں کالج میں فیلوشپس قائم کیجائیں جن سے ہونہار طلبار کو اپنی لیاقتوں کے بڑھانے کا موقع ملے اور وہ ہماری یونیورسٹی کی پروفیسری یا اسسٹنٹ پروفیسری کے لئے تیار ہوسکیں۔

(۱۰) دسویں تدبیر یہ ہے کہ مسلمان فاضلوں سے درخواست کیجائے کہ اگر ممکن ہوسکے تو وہ علیگڈھ تشریف لاکر قیام فرمائیں۔ ایسے بزرگوں کی آسایش کا پورا انتظام کیا جائے بغیر ایسے حضرات کے علیگڈھ علمی مرکز نہ ہوسکیگا اور یہاں وہ علمی آب وہوا پیدا نہ ہوگی جو یونیورسٹی کے لئے لازمی ہے۔ مثلاً عرض کرتا ہوں کہ زبردست کوشش کیجائے کہ سید علی بلگرامی علیگڈھ میں مقیم ہوں۔ سُنا ہے کہ اگر کوشش کیجائے تو شمس العلما نواب سید امام بہادر بھی یہاں تشریف لاکر قیام فرماسکتے ہیں۔ اس موقعہ پر میں اس بات کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ مجھے سخت افسوس ہے کہ جناب مولوی عزیز مرزا صاحب یہاں تشریف لاکر لکھنو چلے گئے۔ تعجب ہے کہ مسلمان پالٹکس کو تعلیم سے زیادہ ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ پالٹکس ایک نتیجہ ہے تعلیم کا۔ اگر اعلیٰ تعلیم نہ ہوگی تو مسلمان ممبران کونسل بیکار ہیں۔ چاہے اُن کی تعداد ہندو ممبروں سے بھی زیادہ ہوجائے۔ مجھے امید ہے کہ ہم اپنی یونیورسٹی کی خدمت کو سب سے زیادہ ضروری خیال کرینگے اور مولوی عزیز مرزا صاحب لیگ کی سکرٹری شپ سے استعفا دیکر یونیورسٹی اور کالج کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہوجائینگے۔ جن کو چھوڑ کر پالٹکس کو زیادہ ضروری سمجھنا چاہئے۔ لیگ کے کام دوسرے مسلمان بھی چلاسکتے ہیں۔ خود انگلستان میں جہاں ہر چیز کا دارومدار پالٹکس ہی پر ہے

تعلیم پالیسی سے زیادہ ضروری سمجھی جاتی ہے ۔ لارڈ کرزن پالیسی میں مخالفت
کی وجہ سے ایک تعلیمی لکچر کلکتہ یونیورسٹی میں نہ دے سکے تھے تو اُن سے
تمام ناراضی پیدا ہوگئی تھی اور آخرکار انکو معافی مانگنا پڑی تھی)۔

(۱۱) گیارھویں تجویز یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی یونیورسٹی بنانے کے لئے
کافی طور سے مستعد ہوجائیں اور کافی روپیہ جمع کر چکیں تو ہندوستان کے
ہر حصے سے ہر فرقہ اسلام کے چیدہ چیدہ مسلمانوں کا ایک زبردست ڈیپوٹیشن
مرتب کیا جائے اور وہ جناب وائسرائے بہادر کی خدمت میں حاضر ہو
اور اُن سے عرض کرے کہ تمام مسلمانانِ ہند کی جائز اور حقیقی خواہش ہے
کہ اُن کو حضور ملک معظم سے چارٹر دلا دیجئے ۔ براہ مہربانی اس موقعہ پر سے

آوا سے دیکھ لو جاتا رہے گا دل کا بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

مجھے یقین کامل ہے کہ جناب وائسرائے بہادر ہماری خواہشوں کو پورا کرنے کی
کوشش فرمائینگے اور شہنشاہ قیصر ہند اپنی وفادار رعایا کو چارٹر مرحمت فرماکر
مسرور و شاد کام کرینگے ۔

ہم سب کو اس اہم کام کے لئے متحد ہونا چاہئے اور پارٹی فیلنگس اور
خودغرضیوں کو چھوڑ کر زبردست کوشش کرنا چاہئے ۔ اگر موجودہ موقعہ چھوڑ دیا
گیا تو آیندہ کامیابی دشوار ہے ۔ ہندوؤں اور مسز اینی بیسنٹ کی کوششوں
کو دیکھ کر ہمیں اور زیادہ زبردست کوشش کرنا چاہئے تاکہ ہم جلد اپنی یونیورسٹی
بنا سکیں ۔ اگر ہم ایسا نہ کرسکے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمیں نہ تو اسلام سے
محبت ہے اور نہ مسلمانوں کی تباہی پر افسوس ہے ۔ بلکہ صرف باتیں کرنا آتا ہے ۔

ضمیر احمد

جنگی طاقت کو ترقی دینے یا قائم رکھنے کا کبھی کوئی پائدار ذریعہ تھا"۔ بادشاہ کے لئے عہد حکومت کے آغاز ہی میں ممکن تھا کہ وُہ اپنے خاص بھائیوں کی سازشوں سے بےخوف ہو کر میدان جنگ میں مقابلہ پہ آتا۔ غیر ملک کے مؤرخین اُس کی ابتدائی ناکامیابی کا سبب اُس کی تلون مزاجی اور طبیعت کی کمزوری قرار دیتے ہیں۔ جملہ مؤرخین کے بیانات سے یہ بات میرے نزدیک صاف ہو جاتی ہے۔ کہ گرؤہ اپنے باپ کی اس نصیحت پر کاربند ہوتا کہ اپنے رقیب بھائیوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرے اور اگر وُہ ایسا ہی کرتا جیسا کہ اس کے جانشینوں نے کیا یعنی انکو فوراً قتل کرا دیتا تو وہ شاید ایک کامیاب فرمانروا کہلاتا۔ اگرچہ اس طور پر وہ بھائیوں کے مقابلہ میں بے رحم سمجھا جاتا لیکن اور باقی دُنیا کے لئے ضرور رحمدل ثابت ہوتا۔ وُہ اکثر نیکی کی حد سے بھی گذر کر عالی نیت اور کشادہ دل ثابت ہوا ہے۔ اس موقع پر صاحب موصوف نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ سیف خاں ہمایوں کے پیچھے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اسکا آقا شیر خاں پہاڑ کی تنگ راہ سے چھپ کر بھاگ رہا تھا۔ سیف خاں کے جسم میں تین جگہ زخم لگے تھے جن سے خون جاری تھا۔ بادشاہ کے سامنے لایا گیا تو ظاہر ہے کہ اُسے موت کی ہیبت ناک شکل نظر آتی ہو گی۔ لیکن بادشاہ نے فرمایا" ایک سپاہی کے لئے یہی شان ہے۔ اُسے اپنے آقا کی خیرخواہی میں جان تک نثار کر دینی چاہیئے۔ مَیں تم کو آزاد کرتا ہوں۔ تمہارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ"۔ سیف خاں نے عرض کیا۔"میرا سارا خاندان شیر خاں کے ہمراہ ہے مَیں اُسی کے پاس جانا چاہتا ہُوں"۔ شیر خاں اُسوقت مغلوں کے حق میں کانٹا ہو رہا تھا۔ لیکن ہمایوں نے کچھ بھی پس و پیش نہیں کیا اور فرمایا "مَیں نے تمہاری جان بخشی کی ہے۔ جو چاہو کرو"۔ ہمایوں کے عادات میں

ان میں افسانوں کا بھی شعبہ پایا جاتا تھا جو ختا کی جانب منسوب کئے جاتے تھے۔ یہ
حسن کلام اور خوش آوازی کے صلے میں شعرا اور مطربوں پر خزانے کا دروازہ کھول کر
سوالی سے پوچھتے تھے "مانگ کیا چاہتے ہو"۔ اس کے تکلیف دہ تلون یا غیر مستقل
مزاجی کا ظہور خاص طور پر اس کے اوائل زمانہ حکومت میں اور مابعد صرف صلاح
مشورہ کے موقعوں پر ہوا ہے۔ وہ میدان جنگ میں چست و چالاک اور دلیر ثابت
ہوا۔ جیسا کہ امیر تیمور کے جانشین کو ہونا چاہئے۔ تیمور کے جملہ جانشین ذاتی
شجاعت اور دلی مضبوطی کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے
بعض نے اپنے مورث اعظم کی وہ ہمت ترکہ میں پائی تھی جس سے کہ وہ ایک
مجوزہ رائے پر ہمیشہ استقلال و ثابت قدمی کے ساتھ کاربند رہے۔ لیکن ہمایوں
نے ان اوصاف کو ترکہ میں نہ پایا تھا۔ وہ بہادر ضرور تھا لیکن اس میں استقلال
کی کمی تھی۔"

یہاں تک ایک مصنف کا مقدمہ تھا۔ اب مسٹر ارسکن کی رائے ملاحظہ ہو "وہ
اکثر معاملات میں تند مزاج تھا لیکن متلون طبع بھی اور غیر مستقل بھی تھا۔ وہ
قدرتی طور پر فیاض ملنسار اور محبت کرنے والا تھا۔ اس کے عادات شائستہ
بے تکلف اور دلکش تھے۔ اس کی فیاضی آخر کار اسراف کے درجہ تک پہنچ گئی
اور اس کی شفقت کمزوری کی حد تک بڑھ گئی تھی اور اسی لئے مرتے وقت تک
وہ خوشامدیوں اور اپنے منظور نظروں کا شکار رہا۔ اگرچہ وہ دلیر
نیک مزاج فیاض اور مخلص دوست تھا مگر اس کے کل اوصاف اپنے بالمقابل برائیوں
کے حد تک پہنچ گئے تھے اور ان سے بہت کم مفید نتیجہ پیدا ہوا۔"

فلسفۂ تاریخ کے ان محققوں سے یہ سوال کرنا عبث ہے کہ اوائل سلطنت ہی میں
جانشین کو قتل کر کے ہمایوں کس تعریف کا مستحق ہو سکتا تھا اور آیا آج سے چار صدی

پیشتر مشرق اور مغرب کی تہذیب و تمدن۔ شخصی زندگی کے معیار و مقاصد
میں کوئی تفاوت بھی تھا یا نہیں۔ بیشک آج ہمایوں کی سی نیک مزاجی۔ رحمدلی
اور فیاضی کی ضرورت باقی نہیں ہے! لیکن اس آزادی کے زمانہ میں کشت و خون
قتل و غارتگری کا فتویٰ دینا اور چار صدی قبل اُسے مصلحتاً جائز قرار دینا کہانتک
قرینِ انصاف ہے اس کا فیصلہ ان ہی منصف مزاجوں پر چھوڑ دینا چاہئے۔

ہمایوں ۵ اپریل ۱۵۰۸ء کو ماہم آکہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور ۲۶۔ دسمبر ۱۵۳
کو بابر کے انتقال کے بعد وصیت کے مطابق اسکا جانشین ہوا۔ متوسلین بابر
کو مناصب اور جانثاروں کو جاگیریں عطا ہوئیں۔ بابر نے مرتے وقت اُمراء کا
جلسہ منعقد کر کے ہمایوں کو ولیعہد قرار دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ خدا اور
بندگانِ خدا کے ساتھ اپنا فرض ایمانداری سے ادا کرنا دیانتداری اور محنت
سے عدل گستری کرنا۔ مجرموں کو سزا دینے میں نرمی کرنا اور رحم سے کام لینا
غریب اور بیکسوں کی حمایت کرنا بھائیوں کے ساتھ مہربانی و شفقت سے
پیش آنا وغیرہ۔ ہمایوں کے حالات پڑھو اور دیکھو کہ اُس نے مرحوم باپ
کی وصیت کی ہر جز کی کس حد تک بجا آوری کی۔ بھائیوں نے کبھی بھی
اُسے سکھ کی نیند سونے نہیں دیا مگر ہمایوں موقع پا کر بھی انکی تقصیرات سے
درگذر۔ اور انکے ساتھ فیاضانہ اور شاہانہ برتاؤ کرتا رہا۔ جبتک اس نیک مزاجی
کا صلہ اُسے ضرور یہ ملا کہ اس کی ساری عمر مصیبت اور تکلیف میں بسر ہوئی
اور جب تک کہ پتھر کا جگر بنا کر اس نے بھائیوں کے حق میں فیصلہ قطعی نہیں
صادر کیا اسوقت تک اُسے چین نصیب نہیں ہوا اور نہ سلطنت میں امن
امان پیدا ہوا لیکن اس فطرتی نیکی کا وہ کہانتک ذمہ وار ٹھہرایا جا سکتا ہے ہمایوں
کی فوجی طاقت گو اعلیٰ درجہ کی نہ تھی مگر وہ خود بڑا شجاع اور بلند حوصلہ تھا۔

تھوڑے سپاہیوں کی معیت میں کالنجرا سے مضبوط قلعہ پر شبخون مار کر تسخیر کر لینا اسی کا کام تھا۔ قلعہ فتح ہو گیا تو امراء نے مشورہ دیا کہ قیدیوں کے ساتھ سختی کی جاوے تاکہ خزانہ کا پتہ بتا دیں۔ ہمایوں نے محض تالیف قلوب کر کے اپنا کام نکال لیا۔ نیز۔ برس کی عمر میں بارے حاکم بدخشاں کے انتقال پر وہاں کی حکومت تفویض کی تو اس نے جد و جہد کر کے شہر کو دشمنوں سے پاک کر دیا۔ جوف بدخشاں سے س کے شان میں ۲۸ شعروں کا قصیدہ لکھا ہے

شہنشاہا رخ تو لالہ و سرو سطب سیحا — بمی بیم لب تو غنچہ رنگیں سند خندا

نمیدانم خط تو سبزہ و ریحان بوگل — تو و طاہر فہر تو فتنہ دوراں بم جولا

اس قصیدہ میں معما۔ اجہار صنعت تاریخ کی صنعتیں بکثرت ہیں۔ مثلاً ہر شعر کے حرف اول سے یہ مطلع پیدا ہوتا ہے

شہنشاہ دیں بادشاہ زماں — زبخت ہمایوں شدہ کامراں

پہلے دو اشعار کے درمیانی فقروں سے یہ مطلع نکلتا ہے

رخ تو لالہ و سر خط تو سبزہ ریحاں — لب تو غنچہ رنگیں قد تو فتنہ دوراں

اور درمیانی فقروں کو دوسری طرف سے لوٹ کر پڑھنے میں یہ مطلع پیدا ہوتا ہے

خط تو سبزہ و ریحان رخ تو لالہ و سرا — قد تو فتنہ دوراں لب تو غنچہ کمیں

اس قصیدہ سے یہ قطعہ تاریخ پیدا ہوتا ہے

تو کی شاہ شاہان دوراں کر سہ — ہمہ تر اکار فتح و ظفر

گرفتی بدخشان و تاریخ شد — محمد ہمایوں شہ بحر و بر

سنہ ۱۵۳۹ء سے پہلے مرزا عسکری اور کامران نے بغاوت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا کہ اسی سن میں بادشاہ کو شیر شاہ کے ہاتھ سے سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اس کی ساری فوج منتشر ہو گئی۔ بیگم کو افغانوں نے

گرفتار کر لیا اور ۱۵۴۰ء میں ہمایوں بالکل بے دست و پا ہو گیا۔ دہلی اور آگرہ میں شیر شاہی ہو گئی۔ ہمایوں اور اُس کی بیگم کو جسے جوانمرد شیر شاہ نے بعزت و احترام واپس کر دیا تھا بھاگ کر لاہور جانا پڑا۔ سندھ کے ریگستانوں میں ہمایوں نے سخت مصیبتیں اٹھائیں یہاں تک کہ کھانے پینے کی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی جیگسیر کے جنگل میں اُس کے رفقا ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ اتفاقیہ کنوں نظر آیا تو تشنگی کی بیتابی سے کئی ایک اس کے اندر گر پڑے۔ ہمایوں نے خود اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہی ایام صعوبت میں ۲۵- اکتوبر ۱۵۴۲ء کو حمیدہ بانو کے بطن سے شاہزادہ اکبر تولد ہوا۔ تین برس تک سندھ میں رہکر اور زمانہ کی سختیوں کا مقابلہ کر کے ہمایوں نے شاہ طہماسپ، شاہ ایران کی حمایت چاہی اور شاہ کو یہ قطعہ تحریر کیا ؂

خسروا عمر یست تا عنقائے عالی ہمتم	قلۂ قاف قناعت را نشیمن کردہ است
روزگار سفلہ گندم ساد جو فروش	طوطیٔ طبع مرا قانع بارزن کردہ است
دشمنم شیر است و عمرے ہست بزکن دبو	حالے از کین عداوت روئے با من کردہ است
التماس از شاد آندارم کہ با من آں کند	آنچہ با سلماں علی در دشت ارژن کردہ است

شاہ طہماسپ نے یہ مکتوب دیکھا تو حسرت و افسوس کا اظہار کیا اور جوابنامہ میں یہ بیت زیب عنوان کی ؂

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد   اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

دیار و امصار کے ولات و حکام اور عاملوں کو ہدایت کی کہ جہاں کہیں بھی ہمایوں کا گذر ہو آنکھوں کو فرش بنائیں۔ حاکم خراسان کو ہمایوں کی تشریف آوری کی یوں اطلاع دیتا ہے ؂

مژدہ اے پیک صبا کز خبر مقدم دوست   خبرت راست بوصلے ہمہ جا محرم دوست

بشدم رفتہ کہ در بزم وصالش یکدم | بنشینم بمرادِ دلِ خود ہمدمِ دوست

نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ بادشاہِ ہند کے خیر مقدم کی تاکید
کی اور یہ کہا جاتا ہے کہ کہیں اعزاز و احترام میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ مراسمِ شاہانہ میں
اشیائے تکلفات کی جھلک بھی ہو تو اکبر نامہ میں شاہ طہماسپ کا فرمان پڑھو۔

ہمایوں نے غرہ ذیقعدہ سنہ ۹۵ ہجری کو باغ جہاں آرا واقع ہرات میں
نزول اجلال فرمایا۔ محمد خاں نے جشنِ شاہانہ ترتیب دیا۔ اتفاقاً محفلِ سماع میں
یہ غزل گائی گئی ؎

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد | ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

اتفاق سے جب یہ مصرع پڑھا ؎

زرنج و راحت گیتی مرنجاں دل مشو خرم | کہ آئینِ جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

تو ہمایوں پر رقت طاری ہوئی۔ قوال کو جی کھول کر انعام عطا کیا۔

ہرات میں خواجہ عبد اللہ انصاری کی خدمت میں حاضر ہوا اور بزرگانِ دین
کے مزارات کی زیارت سے شرف حاصل کیا۔ میرزا قاسم گونابادی نے ایک
مثنوی شاہِ ایران کے حالات پر نظم کی ہے۔ اُس میں ہمایوں اور طہماسپ
کی ملاقات کا ذکر یوں کرتا ہے ؎

دو صاحبقراں در یکے بزمگاہ | قراں کردہ باہم چو خورشید و ماہ
دو نورِ بصر چشمِ اقبال را | دو عیدِ مبارک یکے سال را
دو کوکب کز اقبال فلک [illegible] | بہم در یکے عرصہ چوں فرقدین
دو چشمِ جہانی بہم ہمعناں | بہم چوں دو ابرو تواضع کناں
دو مسعود کوکب یکے برج جا | دو والا گہر با یکے درج جائے

ہمایوں ایران سے ۱۲ ہزار سواروں کا دستۂ فوج ساتھ لیکر ہندوستان کو روانہ ہوا

لیکن ابھی اُسکی مصائب کا خاتمہ نہ ہُوا تھا۔ بھائی عداوت پر کمربستہ تھے ۔
کامران کو ہمایوں برادرانہ محبت کے ساتھ سمجھاتا رہا مگر بے سود۔ میرزا عسکری
۱۵۵۱ء میں مکہ کو روانہ ہوا۔ جہاں ۱۵۵۸ء میں اُس کا انتقال ہوگیا۔ تاریخ
وفات یہ ہے ع عسکری بادشاہ دریا دل ۔ ہندال کامران کا تعاقب کرتے
ہُوئے جس نے شبخون مارا تھا اُس کے افغان ساتھیوں کے ہاتھ مارا گیا ۔
شبخون مادۂ تاریخ ہے۔ کامراں کی آنکھوں میں سلائی پھیر گئی ۔ مسز بیورج نے
گلبدن بیگم بنت بابر شاہ کی کتاب ہمایوں نامہ ۱۹۰۲ء میں بمقام لندن شائع کی
ہے جو قابلِ دید ہے۔ یہ کتاب اسی واقعہ پر ختم بھی ہُوئی ہے۔ گلبدن بیگم لکھتی
ہیں: "عاقبت الامر جمیع خوانان وسلاطین و وضیع و شریف وصغیر وکبیر وسپاہی
رعیت وغیرہ کہ از دست میرزا کامران داعیہا داشتند دراں مجلس متفق شدہ
بعرضِ حضرت بادشاہ رسانیدند کہ در بادشاہی وتحکم رسم برادری منظور نمی باشد
اگر خاطر برادر میخواہید ترک بادشاہی بکشید واگر بادشاہی میخواہید ترک برادری
بکشید و ایں ہمہ میرزا کامران است کہ از سبب او در دشت قبچاق بسر مبارک
ایشاں چہ نوع زخم رسیدہ بود وافغانان مکر و فریب دادہ یکے شدہ ومتفق شدہ
میرزا ہندال را کشتند واکثر چغتائی از سبب میرزا نابود شدہ ما اہل وعیالِ مردم
بے بندرفت وبے ناموس شد۔ دیگر مجال نماندہ کہ عیال و اطفالِ مردم من بعد تابِ
بند وعذاب ندارند ودیگر بار ہم جان ومال واہل وعیالِ مایان ہم تصدق
یکتار موئے حضرت ۔ ایں برادر نیست ۔ ایں دشمن حضرت است ۔ سخن مختصر
کہ ہمہ جمع شدہ باتفاق سجد شدہ بعرض رسانیدند کہ ع رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ۔
حضرت بادشاہ درجواب فرمودند کہ اگرچہ ایں سخنانِ نمایاں خاطر نشان من میکند
اما دل من نمی شود ۔ ہمہ فریاد برآوردند وگفتند کہ آنچہ بعرض رسانیدہ شدہ است

عین مصلحت است۔ آخرالامر حضرت فرمودند کہ اگر مصلحت و رضامندی ہمۂ شمایان
ہمین است پس ہمہ شمایان جمع شوید و محضری نویسید۔ ہمہ امرا و سپاہ و علمایان
جمع شدہ نوشتہ دادند بر آن مضمون کہ۔ رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ۔ بحضرت بادشاہ
ہم ضرور شد۔ چون فوج بہ رہتاس گرسیدند بہ سید محمد حکم کردند کہ ہر دو چشم مرزا کامران
را میل کشند۔ در ساعت رفت و میل کشید

کامران اندھا ہوا تو ہمایوں اس سے ملنے گیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے:-

مرزا بعد از ادائے مراسم تعظیم و مراسم احترام اوّلاً این بیت خواند ؎

کلاہ گوشۂ درویش با رہ فلک ساید ۔ کہ سایۂ چو تو شاہے فگند بر سر او

وبعد ازیں این بیت بر زبان مرزا رفت ؎

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است ۔ گر ناوکِ جفاست وگر خنجرِ ستم

ہمایوں فطرتی جذبات کو ضبط نہ کر سکا اور کہنے لگا کہ عالم الاسرار والخفیات
آگاہ است کہ ازیں کار کہ بے اختیار من واقع شدہ بغایت شرمندہ ام کاشکے
ایں حالت از شما نسبت بمن حادث شدی"۔ واضح رہے کہ مرزا کامران فن شاعری
میں کمال رکھتا تھا۔ فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اسکا ترکی
دیوان ٹونک کے کتب خانہ میں جو خان بہادر مولوی محمد حسن خان سی۔ آئی۔ ای
نے فراہم کیا اب تک محفوظ ہے۔ ہمایوں سے اجازت حاصل کر کے مرزا کامران حج
بیت اللہ کو روانہ ہو گیا۔ جہاں تین حج ادا کر کے ۱۱۔ ذی الحجہ ۹۶۴ہجری کو راہی
ملک بقا ہوا۔ اسکا بیٹا ابوالقاسم مرزا بھی شاعر تھا اور ترکی تخلص کرتا تھا۔
۹۷۴ھ ہجری میں اکبر کے حکم سے قلعہ گوالیار میں بحالت قید قتل ہوا۔

یہ واقعہ ہے کہ کامران کے معاملہ میں ہمایوں نے فی الحقیقت نرمی کا برتاؤ
کیا۔ مرزا ہمیشہ اس کے ساتھ برادرانِ یوسف کی طرح پیش آتا رہا۔ مگر ہمایوں نے

کبھی سخت گیری اختیار نہیں کی۔ مؤرخین اُس پر تلون طبع اور غیر مستقل مزاجی کا الزام
عاید کرتے ہیں بعض اُسکا بڑا قصور یہی قرار دیتے ہیں کہ اُس نے بھائیوں کے
حق میں مناسب فیصلہ کرنے میں بہت دیر کی۔ ہم اس اعتراض کو ٹھنڈے دل سے سنتے ہیں
اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمایوں کے باپ مرزا بابر کا سلسلۂ نسب چھٹوں پشت میں تیمور
سے ملتا ہے۔ ہمایوں کی خدا ترسی اور انسانی ہمدردی پر ضرور تعجب آتا ہے لیکن جب
ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکبر کے حیات میں حصول اختیارات کے لئے جو کشت و خون
ہوئے۔ شاہجہان نے تخت کے واسطے جس قدر بغاوتیں کیں خود اس کے بیٹوں
نے حکومت کی خاطر جو جد وجہد کی وہ افعال بھی تو مورخوں کی نکتہ چینی سے نہیں
بچ سکے۔ جہانگیر اور اورنگزیب جیسا دیندار اور خدا پرست بادشاہ بھی تو غداری۔
مکاری۔ ظلم اور سختی کے الزامات کی زد میں آ ہی گیا ہے تو پھر ہمایوں کی طرف سے
ان حملوں کی مدافعت کا خیال جاتا رہتا ہے۔

فرض کرو کہ قیام امن اور استحکام سلطنت کی خاطر ہمایوں بھائیوں کے ساتھ
ابتدا سلطنت میں وہی سلوک کرتا جو مجبور ہو کر اورنگزیب کو دارا شکوہ اور مراد کے
ساتھ کرنا پڑا تو آج با انصاف پسند مؤرخین ہمایوں کو کس ترازو میں تولتے؟ کیا
اُس وقت اس کی تلون اور غیر مستقل مزاجی ایسے عادات میں خونریزی و سفاکی ظلم
و زیادتی کا اضافہ نہ کیا جاتا؟ استحکام سلطنت کا مسئلہ بجائے خود غور طلب ہے۔ ظاہر ہے
کہ بابر کی وفات تک نظام سلطنت بخوبی درست ہونا نہ پایا تھا۔ ورنہ ہمایوں شجاعت و
مردانگی میں بابر سے کم نہ تھا۔ اُس نے بدخشان کو باپ کی حیات ہی میں دشمنوں سے
پاک کر دیا تھا۔ قلعہ کالنجر کے تسخیر میں وہ اپنی غیر معمولی بہادری کا ثبوت دے چکا تھا۔
مجبوری یہ آن پڑی کہ ہمایوں کو ارث میں جو سلطنت ملی اُسے حاصل کئے ہوئے
مشکل ہی سے پانچ چھ برس گذرے تھے۔ وہ تخت پر بیٹھا تو ایک طرف اندرونی قوت

پٹھانوں کی جو مغلوں سے کم شجاع نہ تھے زور پکڑنے لگی۔ شیر خاں نے تھوڑی مدت حکومت میں یہ پورے طور پر ثابت کر دیا کہ وہ سیف و قلم دونوں کا مالک کہلانے جانیکا جائز مستحق تھا اسکی فتوحات کا سیلاب ایسا نہ تھا کہ ہمایوں آسانی سے محفوظ رہ سکتا۔ وہ تو عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے پاؤں کھڑے بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اسے نوت ... آنکھ دکھانے لگے۔ بھائیوں نے ... کیا ادھر شیر خاں اپنے بان سے غراتا ہوا نکلا۔ ہمایوں ہی کا دم خم تھا کہ وہ اس دوہری چوٹ کو سنبھال سکا اور ۱۵۵۵ء میں بہت مختصر سی فوج لیکر مولد ہندوستان کی طرف ادھر مراجعت کی تو فتوحات کا نا سا باندھ دیا اور بالآخر کھوئی ہوئی سلطنت کو لیے تبعہ قدرت میں لے کر چھوڑا۔

اگر اسکی زمانہ کی بیرگی سے فرصت ملتی تو وہ اپنی اصلی عقیدت کو پورا کر دکھاتا جوہر ذاتی میں وہ کسی ہمعصر فرمانروا سے کم نہ تھا اس میں ایجاد و اختراع کا مادہ بھی تھا وہ انتظام سلطنت کی اصلاح سے بے خبر نہ تھا۔ ابو الفضل نے اس کے عہد سلطنت کی یہ خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے۔ "جمیع ملازمان عتبۂ اقبال و کافۂ متوطنان ممالک محروسہ را بہ سہ قسم منقسم ساخت۔ اخوان و اقربا و امراء و وزرا و کافۂ سپاہیان را اہل دولت گفتند ... و حکما و علما و قضاۃ و سادات و مشائخ و قصات و شعراء و سائر فضلا و موالی اشراف و اہالی را اہل سعادت خواندند و ارباب بیونات و اصحاب حسن صوری و اہل نغمہ و ساز را اہل مراد نام نہادند ... و ہمچنیں بقسمت ایام ہفتہ پرداختہ ہر یکے از اہالی دولت و سعادت و مراد منسوب ساختند بریں موجب کہ روز شنبہ و پنجشنبہ با اہل سعادت تعلق گرفت و دریں دو روز توجہ عالی بانظام مناظم علم و عبادات متعلق شد ... و روز یکشنبہ و سہ شنبہ با اہل دولت و سرانجام مہام بادشاہی و انتظام امور

جہانبانی خصوص گرفت و روز دوشنبہ و چہار شنبہ را روز مراد گفتند . . .
روز جمعہ بر طبق نام خویش جامع مراتب مذکور گشتہ طبقات انام از فیض علم
بادشاہی بہرہ ور گشتند و آنحضرت سر براہ ئے فرماندہی گشتہ زمرۂ دولت
می آراستند با واز نقارہ طوائف مردم را آگاہی می بخشیدند و ہر گاہ از دولت
بر میخاستند۔ توپچیاں بصدائے بندوق خلائق را آگاہ میگردانیدند و آں روز
کیراقچیاں و مہتم لباس را چند دست خلعت و خزانچیاں چند بدرہ زر نزدیک
بارگاہ می آوردند تا در بخشش و کامروائی خلق تاخیرے نرود و از شرائف
اختراعات آنحضرت پوشیدن لباس ہر روز بود۔ موافق رنگی کہ منسوب بکوکب
آں روز ست کہ مربی اوست چنانچہ در روز یکشنبہ خلعت زردی پوشیدند
کہ منسوب نیر اعظم است و در روز دوشنبہ لباس سبز کہ منسوب بقمر است و برین قیاس
و از مخترعات آنحضرت طبل عدل بود کہ اگر داد خواہے را با کسے مخاصمت
می شد یک نوبت چوب بر طبل می زد و اگر تظلم او از عدم وصول علوفہ بود
دو نوبت آں کار میکرد و اگر مال وجہات او را ظالمی غصب کردہ بود یا
دزد بردہ سہ نوبت طبل را بفغاں آوردے و اگر با کسے دعوی خون داشتے
چہار نوبت صدائے طبل را بلند گردانیدے"۔

ہمایوں ہمیشہ باوضو رہتا تھا اور خدا اور رسولِ خدا صلعم کا نام بلا وضو نہ
لیتا تھا۔ اسمائے الٰہی کی اس حد تک عزت کرتا کہ عبدالغنی کو فقط عبدل
کہتا۔ فحش الفاظ زبان سے کبھی نہ نکالتا۔ آدابِ مجلس کا اس قدر پابند
تھا کہ جہاں جاتا پہلے دایاں پاؤں رکھتا۔ اس کی سخاوت مشہور ہے
تخت نشینی سے کچھ دنوں بعد دریائے جمن کے سیر کو گیا تو ایک کشتی زر
انعام میں بخشدیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ وکلا اسی اندیشہ سے اس کے سامنے

جو پیش پیش ذکر کرتے تھے۔ اُسے علم ہیئت اور نجوم سے خاص شغف تھا۔ وہ ملا الیاس اردبیلی کا شاگرد تھا۔ دور دور سے لوگ اس سے اس فن کو سیکھنے آتے تھے۔ اس نے کرۂ ارض و کرات عناصر و افلاک مع کواکب مختلف رنگوں سے رنگ کر مجسم صورت میں بنائے تھے اور اصطرلاب کی بھی اصلاح کی تھی۔ ایک روز قلعہ دین پناہ میں کتب خانہ کی چھت پر زہرہ کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اُترتے وقت اذان کی آواز کانوں میں آئی تعظیماً بیٹھ گیا۔ اُٹھنے لگا تو پاؤں عصا اور لکڑی کے زینے پر اٹک کر ہوا زمین پر گرا اور اسی صدمہ سے ۴۹ برس کی عمر میں ۲۵ برس کم و بیش سلطنت کر کے دار البقا کو سدھارا۔

تاریخ وفات یہ ہے ؎

چو شد از رحمت حق سائل اندر دہر آں ۔۔۔ سبب آمد معارم یافت تاریخ از ساتہ

مولانا قاسم نے یہ تاریخ لکھی ہے ؎

همایون پادشاه ملک معنی ۔۔۔ ندارد کس چو او شاهنشهی یاد
ز بام قصر خود افتاد ناگه ۔۔۔ وزان عمر عزیزش رفت برباد
پی تاریخ او کاهی رقم زد ۔۔۔ همایون پادشاه از بام افتاد

یہ بھی مادۂ تاریخ ہے ؎

حسنو عاقل از سال فوتش این بس ۔۔۔ همایون کجا رفت و اقبال او

حمیدہ بانو بیگم اکبر کی ماں، مرزا ہندال کے استاد شیخ علی اکبر جامی کی دختر تھی۔ ہندال کے کیمپ میں ہمایوں نے اُسے دیکھا اور شادی کی خواہش کی۔ گلبدن بیگم اس واقعہ کو لکھتی ہیں :-

بعدہ حضرت ہمایوں بادشاہ پیش والدہ ام آمدند و گفتند کہ کس فرستید حمیدہ بانو بیگم را طلبیدہ بیاید۔ حضرت والدہ کس فرستادند حمیدہ بانو بیگم۔ نیامدند و گفتند اگر غرض ملازمت است خود آں روز بہ ملازمت مشرف شدہ ام۔ دیگر برائے چہ بیایم۔ مرتبہ دیگر حضرت سبحان قلی را فرستادند کہ مرزا ہندال کار رفتہ بگوئید بیگم را بفرستند مرزا گفتند ہر چند من گفتند نمی رود تو خود رفتہ بگو۔ سبحان قلی کہ رفتہ گفت بیگم جواب دادند

کہ دیدن پادشاہان یکمرتبہ جائزست۔ دو مرتبہ دیگر نامحرمست من نمی آیم۔۔ غرض کہ تا
چہل روز از جہت حمیدہ بانو بیگم مبالغہ و مناقشہ بود و بیگم راضی نشدند۔ آخر حضرت والدہ
ملدایکم بیگم نصیحت کردند کہ آخر خود بکسے خواہی رسید۔ بہتر از پادشاہ کسے خواہد بود۔ بیگم
گفتند کہ آرے بکسے خواہم رسید کہ دست من بگریبان او برسد۔ نہ آنکہ بکسے رسیم
کہ دست من میدانم بدامن او نرسد۔ دیکھو کیا بات کہی ہے۔۔ غرض کہ بعد از چہل روز
در ماہ جمادی الاول سنہ ۹۴۸ھ بعد چہل و ہشت در مقام پاتر روز دوشنبہ نیم روز بود کہ
اصطرلاب را حضرت بادشاہ بدست مبارک خود گرفتہ اند و ساعت سعد را اختیار کردہ
میر ابو البقا را طلبیدہ حکم فرمودند کہ نکاح بستند۔ مبلغ دو لک نکاحانہ بمیر ابو البقا دادند۔"

یہی حمیدہ بانو بیگم بعد میں حاجی بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں اور مریم مکانی لقب
پایا۔ ہمایوں نے انتقال کیا تو دہلی میں پندرہ لاکھ روپیہ کی لاگت سے اس کا مقبرہ
تعمیر کرایا۔ دارا شکوہ فرخ سیر اور عالمگیر ثانی اسی مقبرہ میں مدفون ہیں۔ حج سے واپس
آکر عرب سرا نام کی ایک عمارت مقبرہ کے قریب بنوائی جو اب تک موجود ہے۔ مقبرہ
کی تعریف میں کسی نے کہا ہے ؎

ہر کہ میخواہد کہ بیند شکل فردوس بریں — گو بیا ایں قصر و ایں باغ ہمایوں را ببیں

ہمایوں شاعر بھی تھا اور طبیعت مناسب پائی تھی۔ ایک روز ملا حیرتی نے
اُسے اپنے یہ اشعار سنائے ؎

گہ دل از عشق بتان گہ جگرم می سوزد — عشق ہر لحظہ بداغ دگرم می سوزد
ہمچو پروانہ بشمعے سر و کار است مرا — کہ اگر پیش روم بال و پرم می سوزد

ہمایوں نے آخر مصرعہ کو یوں درست کر دیا۔ ع میروم پیش اگر بال و پرم می سوزد
اُس کا دیوان اکبر کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ یہ رباعیات اُسی کی ہیں ؎

اے دل مکن اضطراب پیش رقیب — حال دل خود مگوے با ہیچ طبیب

[illegible] بہ تقاضائے [illegible]

ولہ

اے دل بحضور یار نیازی کن — در خدمت او بصدق دل سازی کن
ہر شب بخیال دوست دل خوش میکن — ہر روز بوصل یار نوروزی کن

ولہ

اے آنکہ جفائے تو بعالم عام است — روزے کہ ستم نہ بینم از تو ستم است
ہر دم [illegible] ہستیم جسم بدل — ما را چو غم عشق تو باشد چہ غم است

اس کے ذوق علمی کا یہ کیا کم ثبوت ہے کہ اس نے ۴۶ برس کی عمر میں بابر کی سرگذشتوں کا اپنے ہاتھ سے ترجمہ لکھا اور اس میں جا بجا اپنے حواشی اضافہ کئے۔

علوم و فنون کی قدردانی نے اس کے عہد کو نامی نامی شعرا کی موجودگی سے ممتاز کر دیا تھا۔ جن میں شیخ زین الدین بھی تھے جو بابر کے عہد میں ہندوستان کے صدر تھے اور وفائی تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے فتح ہندوستان کے متعلق ایک تاریخ بھی لکھی ہے اور اس میں کمال سحر کو ختم کر دیا ہے۔

مولانا نادری سمرقندی سرآمد فضلا وقت جامع کمالات تھے فرماتے ہیں

ہر کوئے کہ منزلے نبودم آنجا — بنگر کہ خود کعبہ آسودم آنجا
بمقصودے بہر جا سر نہادم — تو بودی کعبہ مقصودم آنجا
جہانے محرم و من ماندہ محروم — ہمہ مقبول من مردودم آنجا
چو پرسی نادری چونی ندانم — گہے ناخوش گہے خوش بودم آنجا

ہمایوں کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے

المنۃ للہ کہ بجمعیت خاطر — باعیش [illegible]

[illegible] ہجری میں وفات پائی۔

[illegible] مدّولیشاہ دخمن گئے اسکا کلام شیریں ہے کہتے تھے [illegible]

بحمداللہ کہ وارستم ز عشق مست بیباکے — کہ می افتاد چوں چشم خود از مستی بہر سوئے

[illegible] جز غم لب بہر کس — صراحی وار بہر ساغرے مائل بہر سوئے

ولہ

عمرے کہ دل بوصل تو ام بہرہ مند بود — نمود آں قدر کہ بواں گفت چند بود

الحمد فراق بسر شد شمار عمر — سرمایہ وصال کہ داند کہ چند بود

[illegible] دلکشش پیش تو بود مدفنی — از دودہا بر آتش حرماں سپند بود

ولہ

چو تیر خود کشی از سینہ ام بگذار پیکاں را — مرا دل دہ کہ تا مردانہ در راہت دہم جاں را

سنہ ۹۴۰ ہجری میں انتقال کیا۔

ملا جامی بخاری کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو

خوبرویاں ہمہ بے مہر و وفا ئید شما — با اسیراں ز پئے جور و جفا ئید شما

وعدہ کردید وفا طور دروغی گفتید — راست گوئید کہ ایں طور چرا ئید شما

ما دریں شہر از بہر شما رسوائیم — ہمہ جا باعث رسوائی ما ئید شما

چند پرسید کہ مقصود تو در عالم چیست — راست گوئم کہ تمنائے شما ئید شما

جانے از دست شما جاں نتواند بردن — کہ بلائے ز بلاہائے خدا ئید شما

ولہ

دوش ماہ عید بر شکل مقوس آشکار — کز [illegible] بود آئینۂ دل را غبار

یا مہ نو بود یا تیمور از ضعف بدن — استخوان پہلوئے لب تشنگان خونخوار

یا تراشیدہ بہر ناقہ لیلی طلب — یا تن جسم گشتہ مجنوں شد از غم زندوار

[illegible] در سنگ خدام تو میزد ابلہک — نعل کمان حلقہ آورد [illegible]

ریویو

شعر العجم

شمس العلما مولینا شبلی نعمانی کی تازہ ترین تصنیف شعر العجم کئی وجوہ سے قابل قدر کتاب ہے۔ اس قسم کی کتابیں اردو لٹریچر کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ اردو لٹریچر پر یہ اعتراض ایک مدت سے وارد ہے۔ کہ اس میں سوائے نظم کے دواوین اور نثر کے ناولوں اور افسانوں کے علمی ذخیرہ بہت کمیاب ہے۔ زمانہ حال کی بعض تصانیف سے رفتہ رفتہ یہ اعتراض رفع ہوتا جاتا ہے۔ مصنفین حال میں سے مولینا شبلی نے اُردو کے دامن سے اس دھبہ کو چھڑانے میں نہایت معقول حصہ لیا ہے اور جو کتابیں تاریخ و سیر و فلسفۂ مذہب کے متعلق اُن کے قلم سے نکلی ہیں۔ وہ نہایت کار آمد ہیں اور نہایت محنت کاوش اور جستجو کا نتیجہ ہیں۔ یہ کتاب شعر العجم جس کے ہم دیر سے منتظر تھے۔ اردو لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہونے کے علاوہ فارسی لٹریچر کے دلدادگان کے لئے ایک بے بہا نعمت ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اردو میں اس مضمون پر کوئی کتاب پہلے موجود نہیں۔ مگر یہ تعجب خیز ہے کہ خود فارسی زبان میں کوئی مبسوط کتاب فارسی شعرا کے احوال کے متعلق یا ایرانی شاعری کی تاریخ پر نہیں لکھی گئی یورپ میں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں تو ایرانی شاعری کی تاریخیں

مطبوعہ مطبع فیض عام علیگڑھ ملنے کا پتہ۔ مولینا شبلی نعمانی معتمد دار العلوم ندوہ لکھنؤ۔ قیمت حصہ اول ۶ حصہ دوم عہ۔ حصہ سوم قیمت درج نہیں مصنف صاحب سے دریافت کی جا سکتی ہے۔

لکھی جائیں۔ مگر ایشیا کی کسی زبان میں اور خود ایران میں کوئی کتاب فارسی شاعری کے متعلق نہ ہو۔ یہ ایک ادنیٰ نمونہ اس پستی کا ہے جس میں اہلِ ایشیا اندنوں اپنے آپ کو پاتے ہیں۔ ہندوستان پھر غنیمت ہے کہ فارسی زبان کی اس کساد بازاری کے دور میں اس ملک میں ابھی ایسے علما موجود ہیں جن کو ایرانی اساتذہ کے کلام پر عبور حاصل ہے۔ اور جو فارسی شاعری کے نکات سے اہلِ زبان کی طرح آگاہ ہیں اور اس کی خدمت کے شوق میں اُن سے بڑھ کر ہیں۔ مولینا شبلی کی فارسی دانی مسلّم۔ کلامِ اساتذہ پر اُن کی نظر وسیع۔ اور دوں شاعری خداداد۔ جس کا ظہور کبھی کبھی خود فارسی غزل گوئی اور قصائد کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس پر شوق کا یہ عالم کہ فرانسیسی میں کتاب چھپے تو اس سے باخبر اور انگریزی میں چھپے تو اس سے بہرہ ور ترجمے کا دم ہوجاتا ہے۔ ایسی صفات اور اتنی صفات کا مجموعی اثر شعر العجم میں جلوہ گر ہے۔ جس قدر محنت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ ملک کے علم دوست حضرات اسی قدر عالی حوصلگی سے اس کی داد دیں گے۔ اور یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک جائیگی۔ اس کے تین حصے شائع ہو چکے ہیں۔ حصہ اول کی ضخامت ۲۵۰ صفحے ہے اور اس میں عباس مروزی سے نظامی تک کے حالات ہیں۔ حصہ دوم کی ضخامت ۲۰۲ صفحے ہے اور حصہ سوم کی ۲۲۰ صفحے۔ اور اس میں ابوطالب کلیم تک کے حالات ہیں۔ تینوں حصوں میں فارسی شاعری کی عہد بہ عہد ترقیوں اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور مشہور شعرا کے حالات درج کرنے کے علاوہ انکی شاعری پر نقادانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

ایڈیٹر

فلسفۂ غم

ذیل کے اشعار میں نے اپنے قدیم دوست اور ہم جماعت میاں فضل حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لاء لاہور کی خدمت میں ان کے والد بزرگوار کی ناگہانی رحلت کے موقع پر بطور تسلی نامے کے لکھے تھے۔ اگرچہ میری تحریر پرائیویٹ تھی اور اس کی اشاعت کچھ ضروری نہ تھی۔ تاہم میں چاہتا ہوں کہ یہ اشعار میاں صاحب موصوف کے احباب اور معتقدین تک بھی پہنچیں جنہوں نے اس موقع پر میاں صاحب موصوف کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے۔ (اقبال)

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی
موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال
غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے
طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم روح کا ایک نغمۂ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ "یارب" نہیں
جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا
جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے
عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
گر بجز [illegible] ان سے ناامید ہے
زندگی کا راز اس کی آنکھ سے پوشیدہ ہے

اے کہ ظلمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ ہو آساں غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے لبیکِ نغمۂ دیرینہ کی تنبیہِ عشق — حسنِ انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق
عشق سے نغمۂ سپید سی شبنم اہلِ فرعلیے — ظلمتِ ہستی میں یہ سورج سدا تابندہ ہے
صحبتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر — کاہشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کرجاتا عمر
عشق کو محبوب کے مرنے سے مرجانا نہیں — روح میں غم بنکے رہتا ہو گر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی — آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینۂ روشن ہے اسکا صورتِ رخسارِ حور — گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتی ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے — یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی — مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے — دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی — گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں — حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو — یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو
دامنِ دل بن گیا ہو رزمگاہِ خیر و شر — راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر
خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر — فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر
وادیٔ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو — جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

ممبری کونسل

ہمارے مخدوم حاجی خان بہادر سید اکبر حسین صاحب کا کلام جو کچھ حسن قبول حاصل کر چکا ہے محتاج بیان نہیں۔ ان کے کلیات کا پہلا اڈیشن چھپتے ہی نکل گیا۔ اب سا بعض طبع ثانی کے منتظر ہیں۔ کلیات کا حصہ دوم بھی زیر ترتیب ہے۔ حصہ دوم کے لئے جو قطعات و غزلیں مخصوص کی گئی ہیں اُن کا ایک حصہ جناب ممدوح نے ہمیں عطا فرمایا ہے کہ اقساط میں شائع کریں۔ اس عنایت کے لئے ہم یقین رکھتے ہیں کہ سب ناظرین محترم سید صاحب کے ممنون ہوں گے۔ تازہ واقعات اور حالات سے کچھ حصہ وافیہ کما اور ان تعلیم آمیز نظم میں بحث کرنا اور اس بحث میں لطافت ظرافت کی چاشنی دینا صرف حضرت اکبر ہی کا حصہ ہے۔ آج ایک فارسی نظم "ممبری کونسل" کے متعلق شائع کی جاتی ہے جو خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کی مشہور غزل سے کیسا کام لیا ہے۔ اس میں بعض اشارات اور نکات ایک ایسے قوم کی خاص توجہ کے لائق ہیں۔

الا یا ایہا الساقی بدہ ووٹے[۱] بہ محفلہا — کہ سیٹ[۲] آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

رفیقاں شست و طاقت سلب و دولت صرف و دل بے حس — چرا آفتی پیتے ماے دریں گرداب مشکلہا

رہ پیچیدہ سرِ حکومت بر تو نکشاید — مگر چوں مار کامل حلقہ زن باشی دریں بلہا[۳]

مبش اے بے ہنر قربِ مشینِ مغربی خواہی — کہ جز دودے ترا حاصل نمیگردد ازیں کلہا[۴]

حکومت پارلیمینٹ نباشد اندریں کشور — ولے غوغا بجنگ آید ہم از بہر کونسلہا

ہوس در سینہ میجوشد کہ جانم اندریں منزل — خرد در گوش میگوید کہ بر بندید محملہا

ز حرص ممبری نقصاں پذیرد قوم ملت — بجائے قوم آز دخل یابد بر عدد دلہا

چو ذوقِ خدمتِ ملک است حاجت نیست با کونسل — بکن تحریر در اخبار و نطقے دہ بمجلسہا

اگر جوشِ مضامیں ہست در طبع بلیغِ تو — بگو افسانہ ہائے دردِ دل در شکل ناولہا

۱ ووٹ یعنی رائے کا پرچہ۔ ۲ سیٹ یعنی جگہ۔ یہاں مراد کونسل کی جگہ سے ہے۔ ۳ بل مسودہ قانون۔
۴ [illegible] ۱۲

نمیگویم کہ ہیچ خوبی خوبت ہست ہمعنی — ہمیگویم کہ ہمہ دارید کشتیہا و ساحلہا
برآرندہ دل ہیکے دست دعا در حضرت باری — کہ تا بخشد دلت را امتیاز حق و باطلہا
اگر حاکم کند اما طلب کن دوست خوش خصلت — کہ سالک بیخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا
بموئے شہرتے کہ خبر گزشت زان طرہ بکشاید — حریفان مضطرب گردند و شورند فتنہ محفلہا
چو مدد کونسل ہی باصدا دب مشغول مدحت شو — متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا

حب الوطن

گرنہ غربت میں مجھے بھیجیں ابنائے وطن — اب کہاں میں اور کہاں وہ میرے یاران وطن
دُور ہو جا او تصور بے سر و ساماں ہوں میں — سامنے آنکھوں کے کیوں لاتا ہے ساماں وطن
کیا میسر ہو کسی خطے میں ہو سکتی ہے اب — وہ ہوائے جانفزا گہوارہ جنبان وطن
غنچہ و گل بھی کہیں کے اب نظر میں ہیچ ہیں — کر چکے ہیں دل میں گھر خار بیابان وطن
ہو وہ کن آراستہ پیراستہ گو طرح طرح — ہر جگہ کچھ اور جچتی ہے شان وطن
ہم نے کرتا کا خلعت زیب تن اپنے کیا — کیا اتارے سے اتر سکتے ہیں احسان وطن
چھٹ گئے افسوس میری شامت اعمال سے — ہم ندیم و ہمدم و ہم جلیس و ہمصفیران وطن

دام میں صیاد کے آیا ہوں دانے کیلئے
میں سراپا بن گیا عبرت زمانے کیلئے

وہ وطن جس میں اڑائے بادشاہت کے مزے — وہ وطن جس میں ملے آغوش شفقت کے مزے
وہ وطن جس میں کٹا میرا لڑکپن عیش سے — وہ وطن لوٹے جہاں میں نے شرارت کے مزے
وہ وطن حاصل تھیں جس میں دوستی کی لذتیں — وہ وطن ارزاں جہاں تھے مہر و الفت کے مزے
وہ وطن جس میں نہ جانا یہ کہ غم کیا چیز ہے — وہ وطن جس میں ملے سچی مسرت کے مزے

وہ وطن جس میں نہ بیگانہ نظر آیا کوئی | وہ وطن جس میں رہے ذرات اخوت کے مزے
وہ وطن ہر روز جس کا مجھ کو روز عید تھا | وہ وطن لیتا تھا جس میں عیش و عشرت کے مزے
آہ اب وہ سرزمیں ہے اور نہ کوئی ہم نشیں | ہو گئے ہیں خواب راحت کے محبت کے مزے

اب کہاں وہ دن کہاں وہ سن کہاں وہ بات ہے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

نور تھا ظلمت میں اسکی ماہ تاباں سے سوا | اسکا ذرہ تھا مجھے مہر درخشاں سے سوا
اسکا ویرانہ بھی آبادی تھی میری آنکھ میں | وہ خزاں بھی تھی بہار باغ رضواں سے سوا
جانتا ہوں میں اسے باغ ارم اپنے لئے | میری نظروں میں ہے وہ ملک سلیماں سے سوا
میں سمجھتا ہوں کہ ہے خاک شفا خاک وطن | سنگریزے اسکے ہیں لعل بدخشاں سے سوا
نور کے سانچے میں ڈھلتے ہیں حسین مغرب میں گو | میں سمجھتا ہوں کہ دلی ہے پرستاں سے سوا
سلطنت تھی عیش تھا سب کچھ تھا لیکن ہیچ تھا | مصر آنکھوں میں نہ تھا یوسف کی کنعاں سے سوا
اور جو کچھ ہو الٰہی موت غربت کی نہ ہو | جان پیاری ہے مگر پیارا ہے وہ جاں سے سوا

دیدۂ مجنوں ہے لازم دید لیلا کے لئے
آنکھ دل کی چاہیے محو تماشا کے لئے

دھان کی کھیتی

راقم حروف کو اسی سفر میں سال پرگنہ کے ایک پہاڑ سے ہو کر گزرنے کا اتفاق ہوا جس کے دامن میں دور تک پھیلی ہوئی دھان کی سرسبز کھیتیاں عجب بہار دکھلا رہی تھیں اس سبزی کا طبیعت پر حد درجہ اثر ہوا چنانچہ یہ اشعار راہ ہی میں موزوں کر دیے گئے تھے۔ پہلے شعر کے مصرعہ ثانی میں پردہ قاف کا اشارہ اسی پہاڑ کی طرف ہے اس کا اظہار ضروری ہے۔

اے تختۂ دلکش تری رنگت یہ ہری ہے؟ | یا قاف کے پردے میں کوئی سبز پری ہے

عرش تکلف نہ کیا ہے؟ یا صنعتِ صانع کی انوکھی سی ہنری ہے؟

دیکھے ہیں چمن بیسیوں۔ گلزار ہزاروں پر تازگی ایسی نہ یہ خوبی نہ تری ہے

آراستہ ہے جس وقت نسیمِ صحت افزا جنبش وہ تری درخورِ غمازِ نظری ہے

کیا شان ٹپکتی ہے ترے حسن سے اُم اُم کیا لہر سے پیدا تری آبِ خضری ہے

کس ناز سے آپس میں گلے ملتی ہیں پودیا نقشا گرِ حیدر کا تلف وہ تری ہے

ہاں! منظرِ عالی ترے انداز غضب ہیں زہرہ ہے اگر رقص میں صورت میں پری ہے

کہنے کے لئے دھان کی کھیتی ہے ترا نام خرمن میں نہاں تیرے صد آسودہ گری ہے

نزہت ہے تری نازکی چشم تمنا گودی تری گلہائے منضد سے بھری ہے

جاں بخش ہے مُردوں کو محض تیرا تبسم مایوس کو ڈھارس ہے تو سوکھوں کو تری ہے

خشکی ہے تری قہرِ الٰہی کی علامت افلاس ہے ادبار ہے دریوزہ گری ہے

شہاب الدین خاں۔ ایم۔ اے

غزلِ بسمل

مندرجۂ ذیل غزل کو شائع کرتے ہوئے ہمیں خاص مسرت ہے ہمارا سابقہ کرم فرما خان بہادر اسحاق حسین صاحب ایم۔ اے اٹھارہ برس کے بعد پھر ملک سخن میں تشریف لاتے ہیں انکی رفتار کہہ رہی ہے کہ باوجود دیر تک اور ملکوں میں مصروف سیر رہنے کے وہ اس ملک کے گلی کوچوں سے ناآشنا نہیں ہوئے۔ ہم انہیں خیر مقدم کہتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ انکا اشہبِ قلم اردو ادب کے میدان میں اب رواں دواں رہے گا۔ ذیل میں چند سطور نثر انکی طرف سے بطور تمہید درج ہیں۔

ان اشعار کی دلچسپی حسن کلام سے اتنا علاقہ نہیں رکھتی جتنا ان تصنیف سے۔ اوائل عمر میں مجھے ذوقِ سخن بہت تھا۔ کالج کے زینہ پر قدم رکھا تھا کہ۔ آن قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ ہاں پھر کبھی کبھی برس دو برس میں احباب کے اُکسانے سے

رُباعیات

حافظ محمد توحید صاحب نے رباعیات حضرت تمنا عظیم آبادی کی ارسال فرمائی ہیں۔ حضرت تمنا بہار کے کہنہ مشق سخنوروں میں ہیں۔ اُمید کہ اُن کے کلام سے ہم وقتاً فوقتاً مستفید ہوتے رہینگے۔

چلا ہے کوچۂ قاتل کو آنکھ سی خونبار خدا کرے کہ وہ قاتل کرے ایک لساوار
مراد اس کی ہو پوری ہمارا نکلے کام چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار

بلبل اسیر خانۂ صیاد جب ہوئی بولی کہ خوش نوائی کے باعث سزا میں پھنسی
صدقے میں جو کہ اترے ہیں اچھی وہی رہے اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

کیا ڈر ہے اگر شمس سوا نیزہ فرس ہو کیا خوف اگر طابہ تفتیدہ زمیں ہو
زائل ہو اثر دونوں کا اکرم میں تمنا ابر کرم حق کا زشتے جو کہیں ہو

ہر دلعزیز جبّہ

گل و بلبل شمع و پروانہ ۔ ٹوپی ۔ پگڑی سب کی خوبیاں مخزن سبھا میں بیان ہوچکی ہیں۔ حقہ بھی اس انتظار کے بعد کہ کوئی اس کی طرف سے کچھ کہے ۔ مجبور ہوکر خود چند کلمات اپنی نسبت عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔ مجھے اس نے اپنا ترجمان مقرر کیا ہے اور میں کاش اس کی طرف سے بزم خوبیاں جلا سکوں تو اچھا ہو۔

احمد مختار

مرجع جمعیت عالم مونس خورد و کلاں شمع روشن کی طرح ہوں رونق بزم جہاں

پھر میرے مخالف جو کریں لکچر پہ ناز
وہ بھی درپردہ ہیں اکثر مجھ سے رکھتے ساز باز

اس قدر توضیح سے مطلب بڑائی کا نہیں — مجھ کو دعویٰ کوئی اپنی پارسائی کا نہیں
کیوں کہوں میں مدعا کچھ عذر خواہی کا نہیں — کیونکہ میں مطلب بھی ساری خدائی کا نہیں

ہاں مگر اتنا مجھے کہنے کا ہے حق اور بجا
حلقۂ بیعت مرا دُنیا میں ہے سب سے بڑا

میں بُرا ہوں یا بھلا ہوں لیک انسی ہوں بھلا — جو مرے عادی ہوئے ہیں جان کر مجھ کو بُرا
مستحق دُنیا میں وہ انسان کہلا سکا کیا — جو بُرائی کو سمجھ کر بھی سدا کرتا رہا

کوئی دُنیا میں نہ سمجھو کام تم جہد مگر
راستی میں اس کی تم کو بال بھر شک ہو اگر

احمد مختار

تیتری

یہ تری ادائے دل کش، یہ تری رنگین زریں — تو مگر چمن کی دلہن، ارے چھوٹی تیتری ہے
یہ ترا نقابِ گلگوں، یہ تری ردائے رنگیں — تو گلوں کی زیب و زینت، تو بہار کی پری ہے

تو چمن میں موجِ گل ہے، ہزار دل رُبائی — کہ ہوا پہ اُڑ رہا ہے کوئی نقش سحر و افسوں
ہے مگر عروسِ حنا کوئی مستِ خود نمائی — یہ ترا پیالۂ زر، یہ تری شرابِ گلگوں

کوئی لعبتِ پری رُو لب جوئے گل بداماں — کوئی محوِ رقص شعلہ ہے گلوں کی انجمن میں

ترے گل اڑاتی پھرتی ہے نسیم عنبر افشاں — ہے مگر شفق کا ٹکڑا کوئی جلوہ گر چمن میں

ترے رخ میں لالہ گوں سی ہے گلوں کی تازگی — ترا حسن نا شکیبا ہے طلسم خودنمائی
ترے گورے گالوں پہ ہم کو شمع غازہ — ترے ننھے ننھے بازو ہیں فسونِ دلربائی

نہ فروغ آتش گل نہ بہار رنگ و بو ہے — نہ صدائے ساز ہے تو نہ سرودِ عاشقانہ
نہ جگر کا داغ ہے تو، نہ شرارِ آرزو ہے — ہے بہار کا مگر تو کوئی مجسمہ ترانہ

کسی عارض لالہ گوں پر جو نشان بوسہ ہے تو — تو ہے شوخیِ تبسم کسی لعل شکریں پر
کسی بزم دل پہ ہم کو جو چمکنے والا جگنو — تو ستاروں کا ہے جھرمٹ کسی جانِ نازنیں پہ

کوئی مضطرب ہے خندہ کوئی بہہ رہا ہے نغمہ — کوئی وجد میں ترانہ، کوئی ناچتا ہے افسوں
کسی چشم مست کا یا کوئی جھومتا ہے شیشہ — کہ شمیم گل کا داماں ہے شراب کے شفق گوں

ہوا میں نے ہے نکالا کوئی دلفریب شہپر — رگِ برگِ گل سے اچھلا ہے مگر شرار کوئی
کوئی صیدِ زخم خوردہ ہے تڑپ رہا زمیں پہ — کہ ہوا میں اڑ رہا ہے دلِ بیقرار کوئی

ترے ننھے ننھے ہونٹوں کو بہار چومتی ہے — ہے ترے لبوں کی رنگت مئے انبساط افزا
جو چٹک رہی ہیں شاخیں تو نسیم جھومتی ہے — کہ تری شرابِ گلگوں ہے عجب نشاط افزا

یہ تری نظر فریبی یہ تری ادائے دلبر — یہ فضائے لالہ و گل یہ بہارِ سرمگیں

ہر صبح بن کی شاہزادی ہاری چھپٹی تیری ہے　　کہ ہوا میں اُڑ رہا ہے ترا علم زر افشاں

پیارے لال شاکر میرٹھی

تازہ غزلیں

(از نواب سید علی حسن خاں صاحب طاہر)

بحیلہ فتنہ در آں چشم فتنہ زا خفتہ است　　دل ستم زدہ داند بلا کجا خفتہ است

نشنیدہ ام کہ کس است بقصد ما خفتہ است　　روم ز خویش بجو ابش اگرچہ پا خفتہ است

کجاست طالع بیدار بزم یار تہی است　　کہ خفتہ اند رقیباں و پاے ما خفتہ است

ز بخت خفتہ کہ سرگشتگی طبیعت اوست　　بحیرتم کہ چساں خفتہ و کجا خفتہ است

سکوں نصیب دل رہروان فرقت نیست　　بگردش است سر ما اگرچہ پا خفتہ است

دلم بیاد تو کم از مریض بیکس نیست　　کہ در امید طبیب و غم دوا خفتہ است

صفائی دل طلبی سر مکش ز بیداری　　بچشم آئینہ بنگر کہ او کجا خفتہ است

زباں بفتنہ و جنگ است و دل بعشوہ گری　　غنیم بر در کشور و حرم سرا خفتہ است

دلم بہ بیکسی قوم سخت مے لرزد　　کہ رہزناں بکمین اند و رہنما خفتہ است

ز حال طاہر شوریدہ در تب و تابم
بکردہ است دمے باز چشم تا خفتہ است

(از شمس العلما نواب سید امداد امام صاحب اثر)

عدو کا ملک ہے ہنگامۂ محشر کے ساماں میں　　قیامت ہے نہاں انکے تبسم ہائے پنہاں میں

...ب نظر کو مدد کہاں ہے — کہ شوخی ہے حیا کے ساتھ اسکی چشم فتاں میں
...کو دشمن کی خبر یا کہ نہ رویا ہو — نمی سی دیکھتا ہوں آج اُس ظالم کی آنکھوں میں
...ل دیکھنا گلشن میں ہیں نصاف کرباز — غضب ہے رند خالی ہاتھ پہونچیں فصل بہاراں میں
...کیا ذکر اسکے دشنۂ خوں ریز مژگاں کا — چبھویا تو نے نشتر جا بجا گر میری رگ جاں میں
...ل صیاد گلچیں باغباں سب ہی کا کھٹکا ہے — عبث بلبل نے طرح آشیاں ڈالی گلستاں میں
...سے پائی ہے شیرازہ کونین نے بندش — دو عالم کی ہے جمعیت تری زلف پریشاں میں
...دستِ وحشت کا کہ جیتا سی پڑتا ہے — کبھی اپنے گریباں میں کبھی دامانِ جاناں میں
...جاتی ہیں یارب پار کیونکر سینۂ دل کے — درازی یوں تو کچھ ایسی نہیں اس بت کی مژگاں میں

ہوا ہے راہ کعبہ میں آزر کا ہمسفر ہے ہے
وہ کافر جس سے سو رخنے پڑیں دین مسلماں میں

(حاجی شاہ نور الحسن صاحب عظیم آبادی)

...مرجائیں بانا بھر ہماری کام آجانا — جنازہ آئے تو شرکت کو زیر بام آجانا
...باتیں ہزاری کی تو شب غم نے سکھائی ہیں — جگر میں ہوک اٹھی لب پہ تیرا نام آجانا
...ختی ہو اپنی آخر سکے اور کیا معنی — ہمارے سامنے بھر بھر کے خالی جام آجانا
...کو حشر کہتے ہیں۔ قیامت نام ہے اسکا — نقاب اُنکا اُلٹنا اور زیر بام آجانا
...غم نے مجھ کو تو کہیں کا بھی نہ رکھا تھا — نہ بھولوں گا کبھی اے صبر تیرا کام آجانا
...الحق ہیں وہ مرتے ہیں سمجھائیں رہ رہ کر — عوض جینے سے تھی اپنے یہی اک کام آجانا
...ساغر کو بھی گر کر اسی دم چور ہونا تھا — غضب ہی ہو گیا ساقی ہمارا نام آجانا
...صدمہ تو ایسا ہی جو مجھ کو خوں رلاتا ہے — ترے کوچے سے پھر کر مرا ناکام آجانا
...عمر بھر پابندی تھی آس کچھ مجھ کو — غضب ہے اے اجل اس دم ترا پیغام آجانا

بہت کچھ کام آنا پایا ہم نے اپنا سے زمانہ کو — بہت مشکل ہے مشکل میں کسی کا کام آجانا
ذکیا زندگی میں تو بہت اچھا کیا لیکن — لحد پر فاتحہ کو آئے مُحِبّ خود کام آجانا
اگر مشکل سے مشکل ہو تو وہ آسان ہو آساں ہے — مگر ہاں شرط ہے لب پر تمہارا نام آجانا

خوشا قسمت کہ وابستہ ہو گئے اس حیدر مشکل کشا سے
مبارک ہو ہمیں اے قدر زیرِ دام آجانا

(از حضرت حفیظ جونپوری)

محفل میں جب سے اُنکی نوا سنجِ غیر ہے — جنت میں اے حفیظ جہنم کی سیر ہے
شہرہ ہے جب سے اُس رخِ عالم فریب کا — کعبے کی بھیڑ چھٹ گئی سنسان دیر ہے
کس کس کو ہم بنائیں تری دوستی میں دوست — دنیا کو بغض و رشک زمانے کو بیر ہے
ہر پھر کے میکدے ہی میں رہتا ہے محتسب — مسجد کی گشت ہے نہ گزر سوئے دیر ہے
بیم و رجا کے پھیر میں کٹتی ہے زندگی — دوزخ کی سیر ہے کبھی جنت کی سیر ہے
اب شرحِ دردِ دل کی یہاں تاب ہے کسے — کہنا پیامبر کہ بہت حال غیر ہے
کہنے کا عارضہ مرے ناصح کو ہو گیا — باتوں کی جھڑ بندھی ہے نہ سر ہے نہ پیر ہے
سو لے نہیں اُسے پھیر کے رخ منہ چھپا لیا — اتنا جو کہہ دیا کہ مرا حال غیر ہے

تو اے حفیظ ساقیِ مہوش کے سامنے
کوئی بھی کہہ سکیگا کہ نیت بخیر ہے

ازجناب فروغ حیدر آبادی تلمیذ نواب فصیح الملک داغ دہلوی

کب خبر تھی یوں پلٹ جائیگی تیری یار آنکھ — قتل کرنے کو مرے ہو جائیگی تیار آنکھ
خواب میں آکر ستاتا ہے مجھے تیرا خیال — رات کو سوتے میں کھل جاتی ہے سو سو بار آنکھ

ابو میں اہل سپہر جیسا ہیں
ہوگئی محفل میں جب انکی ہماری چار آنکھ

سمجھتے ہیں فروائے قیامت کچھ نہیں
حشر میں کھینچے چل کر طالب دیدار آنکھ

جیتے ہیں جب سے تو نے آنکھیں پھیر لیں
ہاتھ لاغر پاؤں شل دل ناتواں بیکار آنکھ

تکتے راہ تیری شام فرقت فتنہ گر
ہوگئی آخر مجسم حسرت دیدار آنکھ

ہیں وقف دعا اور پاؤں محو جستجو
دل شہید ناز جاناں طالب دیدار آنکھ

اب زمانے بھر سے ہے انکی شناسائی فروغ
اپنے عاشق سے کبھی کرتے نہ تھے جو چار آنکھ

(از سید حسن صاحب سید تلمیذ حضرت ظہیر دہلوی مد ظلہ)

ل چھیڑ وہ ہر بار کئے جاتے ہیں
ملتے ملتے بھی لگاوٹ کی لئے جاتے ہیں

باتوں میں ستم مجھ پہ کئے جاتے ہیں
چٹکیاں دل میں وہ رہ رہ کے لئے جاتے ہیں

ل میں کہاں دم ہے کہ منہ سے بولیں
یہ بہت جانو کہ وعدہ پہ جئے جاتے ہیں

ں کا یہ عالم ہے کہ اٹھنا دشوار
اور ہمت ہے یہ اپنی کہ جئے جاتے ہیں

آشنا دم نظارہ نہیں ہے کہ کہوں
دوڑنا کوئی مرا دل وہ لئے جاتے ہیں

ضبط کس طرح کرے شکوۂ دشمن سید
زہر کے گھونٹ کسی سے بھی پئے جاتے ہیں

(از پیارے لال صاحب رونق دہلوی)

ے یار جو بنکر قضا نکلتی ہے
نثار ہونے کو خلق خدا نکلتی ہے

ن وہ ہے۔ آئینہ بے ثباتی کا
بقا کے رنگ میں شکل فنا نکلتی ہے

ہ شغل خود ہی کروں۔ ہاتھ ہو تو اپنا
جو دل سے گھٹ کے آہ وطن جاں نکلتی ہے

جہاں کو وجد میں لاتی ہو نغمۂ حق سے — ترانہ بن کے جو دل سے صدا نکلتی ہے
یہاں کی صنعتیں ہیں رنگِ صانعِ قدرت — کہ نقش نقش میں شانِ خدا نکلتی ہے

کلام ہوتا ہے مقبولِ عام وہ رونق
زمانِ حال کی جس میں ادا نکلتی ہے

(از حاجی عبدالعلی صاحب - ایجاد - نانوتوی)

حالِ دل ناقابلِ اظہار ہے — جو مصیبت ہے گلے کا ہار ہے
میں ہوں اور آنسوؤں پہ ہے تیرا خیال — بیکسی میں اک یہی غمخوار ہے
آج تک پورا ہوا ہے اور نہ ہو — واہ کیا وعدہ ہے کیا اقرار ہے
اب تمنائے کرم ہی مٹ گئی — اب تری چشمِ کرم بیکار ہے
باعثِ حرماں نصیبی کچھ نہ پوچھ — ہر تمنا یاس سے دوچار ہے
جب نشاطِ زندگی ہی مٹ گئی — پھر ہوائے زندگی بیکار ہے
کیا مری ناچیز حسرت کی بساط — کیوں تمہیں چشمِ کرم سے عار ہے
بس کچھ لاکھوں تمنا میں نہیں — صرف اک چشمِ کرم درکار ہے
ختم ہو کے عمرِ طبعی ختم ہو — اب مرا دل زیست سے بیزار ہے
دل ہے اور ارمانِ چشمِ التفات — آنکھ ہے اور حسرتِ دیدار ہے
ناخدا ہے ہم۔ خدا ناخدا ہے — اب خدا چاہے تو بیڑا پار ہے
مرحبا اے چشمِ ساقی! مرحبا — جو شریکِ بزم ہے سرشار ہے
فکرِ دنیا۔ خوفِ عقبیٰ۔ حبِ عشق — کشمکش ہے اور جانِ زار ہے
المدد اے ڈوبتوں کے ناخدا — پھر مرا بیڑا ہے اور منجدھار ہے
کل ترا ایجاد شیخ الوقت تھا — آج اک مٹی کا شیشہ ہے

قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک قسم دوم چار روپے فی پرچہ ساڑھے تین آنے

مخزن

جونیس کے خطوط

الہ آباد سے ایک ماہوار انگریزی رسالہ مسلم ریویو کے نام سے نکلنا شروع ہوا ہے جس کے جون تک کے پرچے ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ رسالہ ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کی رفتار روز افزوں ترقی پر ہے۔ گو اس کے مضامین اور عنوانات میں ابھی بہت کچھ اصلاح کی گنجائش ہے۔ تاہم اس میں بعض معرکے کے مضمون نکلے ہیں۔ خصوصاً وہ مضامین جنکے نیچے مضمون نگار نے فرضی نام جونیس درج کیا ہے۔ اِن مضمونوں میں فاضل مضمون نگار نے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور اُن کے تمدن و تہذیب کی موجودہ کمزوریوں کو دلیرانہ بیان کیا ہے۔ اِن تحریرات پر خود مسلم ریویو کے اوراق میں دیگر لوگوں نے زبردست نکتہ چینی کی ہے۔ اور جونیس سے بہت سے اُمور میں اختلاف ظاہر کیا ہے

پیشتر اس کے کہ جونیس کے خیالات سے بحث کی جائے۔ شاید خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ تھوڑا سا ذکر اُس جونیس کا کیا جائے جس کا نام مسلم ریویو کے نامہ نگار نے اختیار کیا ہے۔ انگریزی لٹریچر میں جونیس ایک مشہور نام ہے۔ گو فرضی نام ہے اٹھارہویں صدی کے رُبع آخر کے قریب انگلستان میں اس نام کا گھر گھر چرچا تھا ۲۱۔ نومبر ۱۷۶۸ء کو اخبار پبلک ایڈورٹائزر میں جسے وُڈفال نامی ایک شخص نکالتا تھا

سب سے پہلا خط جونیس کے نام سے شائع ہوا۔ اُس وقت ابھی قلم
کی آزادی اس درجہ کو نہ پہنچی تھی۔ جو آج اہل انگلستان کو حاصل
ہے۔ اور اگر ہوتی بھی تو چونکہ جونیس بہت سے بااختیار اشخاص
پر بے باکانہ حملہ کرنا چاہتا تھا اُسے اپنا اصلی نام چھپانا اور ایک
فرضی نام ظاہر کرنا پڑا۔ متواتر اس کے خطوط متذکرہ بالا اخبار
میں چھپتے رہے۔ اور اُن خطوط کی دھوم مچ گئی۔ آخری خط ۲۱ جنوری ۱۷۷۲ء
کو چھپا۔ لوگ اِن خطوں کو اس شوق سے پڑھتے تھے کہ اُسی سال یہ خط
جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کیے گئے۔ اس کتاب کی دو جلدیں
تھیں ۱۸۱۲ء میں ووڈفال نے ایک اور ایڈیشن چھاپا۔ جس میں ایک
سو تیرہ ایسے خطوط تھے جو پہلے طبع نہیں ہوئے تھے۔ گو اِن میں
سے بعض جونیس کے خطوط نہ تھے۔ اِن خطوں کی شہرت کا ایک
نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کہ و مہ کو یہ راز جوئی تھی کہ جونیس ہے کون؟
مختلف مشہور اہل قلم پر گمان ہوتا تھا۔ مگر کوئی بات پایہ تحقیق کو
نہ پہنچی۔ عجب بات ہے کہ اس زمانہ کے مارکوئس آف لینڈاؤن
نے اپنے ایک معتبر دوست سے کہا۔ کہ مجھے معلوم ہے کہ جونیس
کون ہے۔ اور میں ایک رسالہ لکھ کر اس بحث کا جو اخبارات
میں چھڑ گئی ہے خاتمہ کر دوں گا۔ مگر وہ اِس ارادے کو پورا
کیے بغیر راہیٔ عالم بقا ہوا۔ پٹ نے لارڈ ابرڈین سے کہا
کہ اسے جونیس کا اصلی نام معلوم ہے۔ مگر بتایا نہیں۔ اس
طرح باوجود بعض معتبر اشخاص کے باخبر ہونے کے یہ راز سربستہ
رہ گیا۔ انگریزی میں کئی کتابیں اسی بحث کے متعلق لکھی گئی ہیں کہ

جوزنستیں کے خطوط کسی کے لکھے ہوئے تھے۔ یہ ہے مختصر سی تواریخ اُس نام کی جو موجودہ اسلامی تمدن کے اس نکتہ چین نے جس کے خطوط زیر بحث ہیں۔ اختیار کیا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے راقم مضمون ہذا اپنے زمانہ کے جوزنیس سے ذاتی شناسائی رکھتا ہے۔ اور جوزنیس نے خود اپنے مضامین مخزن میں بھیجے ہیں۔ کہ اُن پر تنقید لکھی جائے۔ بہت سی بحثیں اُن میں ایسی ہیں جن میں مذہبی مباحث آ پڑتے ہیں اور جن سے ہم اصولاً احتراز کرتے رہے ہیں۔ لیکن اپنے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے جہانتک ممکن ہوگا ہم بھی جوزنیس کے خطوط پر آزادانہ بحث کرینگے۔

سب سے پہلے تو ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بہتر ہوتا کہ جوزنیس صاحب ان مضامین کے نیچے اپنا اصلی نام لکھتے۔ پولٹیکل مضامین کے لئے تو بسا اوقات اخفائے نام ضروری ہوتا ہے مگر مذہبی اور تمدنی مسائل پر اگر دوسروں کے خیالات کی اصلاح مطلوب ہو تو نہ صرف اظہار رائے میں دلیری سے کام لینا چاہیئے۔ بلکہ بے دھڑک میدان میں آنا چاہیئے کہ ہماری یہ رائے ہے اور اس رائے کی یہ دلائل ہیں۔ پھر کوئی مانے نہ مانے۔ اس کی پروا نہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اس میدان کے مرد کو ہدفِ تیرِ ملامت ہونا پڑتا ہے اور کبھی کبھی ملامت سے بھی کچھ بڑھکر سُننا پڑتا ہے۔ مگر یہ بات دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔ دونوں حالتوں میں لوگ مخاطب کرکے بُرا بھلا کہتے ہیں صرف ایک صورت میں فرضی نام کی خیالی آڑ درمیان میں ہوتی ہے۔ جو بہت مضبوط اور کارآمد ثابت نہیں ہوتی۔ اور گالیاں سُنکر کلیجا اسی طرح پھٹتا اور دل اسی طرح کُڑھتا ہے۔ جیسے اصلی

نام ظاہر کرنے کی صورت میں گرامت۔ مگر یہ بڑا فرق ہے۔
کہ اصلی نام کے اظہار سے اُن لوگوں پر جو طالب اصلاح کے بخیال
ہوں۔ گمنام تحریر سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اور اگر لکھنے والا فی الحقیقت
قابل اور ذی علم شخص ہے تو اس کی تحریر کی وقعت زیادہ ہوتی ہے
اور جہاں بہت سے مخالف حملوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ وہیں
بہت سے دوست اور ۔۔ و پیدا ہو جاتے ہیں جو ان حملوں کی
مدافعت کرتے ہیں۔

اس دوستانہ ۔۔ کے بعد ہم از روئے انصاف یہ کہنا
اپنا فرض ۔۔ ہیں کہ ساری رائے میں جونس کی تحریرات مسلمانوں
کی ۔۔ ہی کے لیے ۔۔ سے لکھی گئی ہیں۔ اور وہ معترضین
جو مسلم رو و میں اعتراضات لکھے ہوئے یہ سوال کر رہے ہیں کہ آیا
جناب جونس مسلمان ہیں یا نہیں۔ ور اگر ہیں تو اُن کے دل میں
اسلام کی کچھ وقعت ہے یا نہیں۔ خوب کیا خوب نہیں ہیں۔ ہم وثوق
سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن معترضوں میں شاید کوئی ایسا نکلے جو علم و
فضل میں جونس کی برابری کر سکے۔ یا جس کے دل میں اسلام کی
محبت زیادہ ہو۔ مگر ایک معنی میں معترض بیچارے بھی سچے ہیں۔
کہ جونس کے قلم سے بعض عبارات ایسی نکل گئی ہیں۔ جن سے
مخالفت اسلام کا رنگ ٹپکتا ہے اور جن سے یہ نو ضرور
ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا ادب ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اور فلسفہ
اسلام پر غائر نظر نہیں ڈالی گئی۔ لیکن یہ قصور جونس کا
نہیں۔ یہ قصور اُس تعلیم کا ہے۔ جس میں ایک جونس کیا انگریزی

خوان جماعت کی ایک کثیر تعداد نے تربیت پائی ہے اور جس
کے سبب اُن کی مذہبی معلومات یورپ کی کتابوں کے مطالعہ
کا نتیجہ اور اُن کی مذہبی رائیں یورپ کے علما کی راؤں کا عکس ہیں۔
بہت سے انگریزی خوان اصحاب اصولِ موضوعہ میں غلطی کرنے
کی وجہ سے بیشمار غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وُہ اپنے
حالات پر غور کرنے سے پہلے۔ اپنی سوسائٹی کے حُسن وقُبح
کا اندازہ لگانے سے پیشتر یہ فرض کر لیتے ہیں۔ کہ یورپ کی
موجُودہ تہذیب اور اہلِ یورپ کا تمدن انسانی تمدن کا قریب
قریب درجہ کمال ہے۔ جو رسم اہلِ یورپ کے ہاں جاری ہے
وُہ مستند اور مُسلّم ہے اور جو رواج کسی اَور جگہ اُس رسم کے
خلاف ہو وُہ بُرائیوں کا مجموعہ بلکہ بُرائیوں کی جڑ ہے۔
ایسے مفروضے غلط نتیجے نکلنے کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ اگر وُہ
دونوں تمدنوں کے حالات پر حکیمانہ نظر ڈالیں۔ دونوں کی تاریخ
کو ملحوظ رکھیں اور پھر دونوں کے رسم ورواج کا موازنہ کرکے
فیصلہ کریں کہ اچھی اور قابلِ تقلید باتیں کتنی یورپ میں ہیں اور
کتنی ایشیا میں۔ کتنی ہم اخذ کر سکتے ہیں کتنی نہیں کر سکتے۔ جو
اخذ کر سکتے ہیں۔ اُن میں مقدم کون سی ہیں اور موخر کونسی۔
تو آپ سے بہت زیادہ فائدہ اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات
سے ملک وقوم کو پہنچے۔ انہیں معلوم نہیں کہ اپنے موجودہ طریق
عمل سے وُہ نہ صرف اپنی قوت بہت حد تک بیکار صرف کرتے ہیں۔ بلکہ
نادانستہ اور بے ارادہ اصلاح وترقی کی رفتار روکنے کا باعث

مند رہتے ہیں۔

مثال کے طور پر مسئلہ پردہ کو لیجئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم نسواں
کے بعض حامی تعلیم کی تاکید کرتے کرتے پکار اُٹھتے ہیں کہ جب
تک پردہ نہ اُٹھ جائے گا عورتیں کبھی ترقی نہ کریں گی۔ اس کا نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ بہت سے حامیانِ تعلیم جو اپنی لڑکیوں کو پڑھانے
پر آمادہ تھے مگر اس کے ساتھ پردہ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ فوراً کھٹک
جاتے ہیں اور سرے سے تعلیم ہی کی مخالفت کرنے لگتے ہیں اور یہ
کہتے ہیں کہ لڑکیاں پڑھنے لکھنے کے بعد ضرورت سے زیادہ آزاد ہو گئی
ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ لڑکیاں بھی اسی مثال کی تقلید کریں اور موجودہ
تمدن کا پیچیدہ مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جائے۔ ہمارا منشا اس موقعہ
پر کوئی رائے پردہ کے موافق یا مخالف ظاہر کرنا نہیں ہے۔ فقط اصلاح
طلب جماعت کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی تحریر و تقریر میں
کافی احتیاط کریں۔ خود تعلیم کے رستے میں جو سب اصلاحوں
کی جڑ ہے کیسے روڑے اٹکا رہے ہیں۔ پردہ کے مسئلہ کا ذکر خوش
کے خطوط میں بھی اسی طریق سے کیا گیا ہے۔ جس سے بہت سی
طبائع میں جوش پیدا ہوا۔

ایک اور مثال لیجئے۔ خوش صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جو یہ سمجھتے
ہیں کہ اسلامی قانونِ وراثت قابلِ اصلاح ہے۔ اور جن کا یہ خیال ہے کہ
جب تک مسلمانوں کی جائدادیں چھوٹے چھوٹے حصوں پر منقسم ہو کر تباہ
ہوتی رہیں گی اور بعض مسلمانوں کو ترکہ یا ورثہ پانے کی امید بیکاری کی ترغیب
دیتی رہے گی۔ مسلمان مفلس اور خستہ حال رہیں گے۔ یہ مسئلہ اس زمانہ میں کوئی نئی

ناسانہ نہیں ہے۔ آج سے پہلے کئی نئی تہذیب کے دلدادہ مسلمان اس
راستے کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کر چکے ہیں۔ اور پرانے خیال
کے مسلمانوں نے ان خیالات کی تردید میں بھی بارہا مضامین لکھے ہیں۔
چند سال ہوئے جب خان بہادر سید دلاور حسین احمد سابق
انسپکٹر جنرل محکمۂ رجسٹری بنگال نے جو انگریزی مضمون نگاری میں اعلیٰ
رتبہ رکھتے ہیں۔ اور اس قسم کے اور خیالات اخبار آبزرور کے ذریعہ
ظاہر کئے تھے اور اُن مضامین پر دیر تک لمبی چوڑی بحث رہی تھی۔
اس سے اتنی بات صاف ظاہر ہوگئی تھی۔ کہ نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی
بھی کثرت رائے سید صاحب موصوف سے اختلاف رکھتی ہے۔ پس جمہور
اسلام کا تو کیا کہنا۔ اس صورت میں جسٹس صاحب کا پھر اُن خیالات
کو دُہرانا آزمودہ کو آزمانا ہے جس سے کوئی فائدہ متصور نہیں خصوصاً
یہ امر ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب ننانوے فیصدی مسلمان
قرآن مجید کو کلام الٰہی مانتے ہیں۔ اور دل سے یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ
جو احکام اس میں ہیں وہ فی الحقیقت خداتعالیٰ کی جانب سے بذریعہ
وحی اس کے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور
اسی کتاب پاک میں پڑھتے ہیں کہ کلمات اللہ تبدیل نہیں ہوتے۔ تو اُن
سے یہ کہنا کہ وہ بعض احکام کو قابلِ عمل اور بعض کو غیر ضروری یا نامناسب
مانیں۔ نہ صرف امرِ محال کی توقع رکھنا ہے۔ بلکہ اسلام کی بیخ و بنیاد
پر کلہاڑی مارنا ہے۔ کوئی اصلاح خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مفید
ہو مسلمانوں کے کس کام آسکتی ہے۔ اگر اس سے بنائے اسلام
کے متزلزل ہونے کا اندیشہ ہو۔ اسلام کے قانونِ وراثت پر مفصل

بحث کا یہ موقع نہیں۔ مگر ہم وراثت شرعی کے معترضین کی توجہ
کے لئے صرف دو باتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں
کا قانون وراثت اُن کے عروج کی صدیوں میں بھی وہی تھا جو آج
ہے۔ اگر آج اُن کا زوال اُن کے قانون سے منسوب کیا جاتا ہے
تو عروج بھی اسی منطق کے رو سے اسی قانون کا نتیجہ قرار دینا
چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ عقیدہ اور چیز ہے اور عمل اور چیز۔ اس ہندوستان
میں بہت سے حصے ایسے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کا عمل اپنے قانون
کے خلاف ہے۔ خاندانوں کے خاندان ایسے ہیں جو تقسیم ورثہ
میں شرع کی پابندی نہیں کرتے۔ یہ لوگ عملی نمونہ ہیں۔ اُس حالت
کا جس کی توقع مجوزہ اصلاح کے بعد کی جا سکتی ہے۔ مگر ان میں کوئی
غیر معمولی خوشحالی یا آسودگی بمقابلہ دوسرے خاندانوں کے
نظر نہیں آتی۔

دونوں مندرجہ بالا مثالوں سے ہم نے اس بات کی توضیح کی کوشش
کی ہے کہ جن حضرات کے دماغ جونیس صاحب کی طرح تعلیم مغربی سے روشن ہیں
اور جن کے دل میں ملک و قوم کی خدمت اور اسکی اصلاح کی امنگ ہے۔ انہیں ہر اصلاح
کو تجویز کرتے وقت اپنی جماعت کے حالات خیالات اور خصوصاً عقائد کا حتی الوسع
خیال رکھنا چاہیئے۔ اور کوئی ایسی بات جس سے جماعت کی دل آزاری ہو زبان یا
قلم سے نہیں نکالنی چاہیئے۔ اور زور اُن باتوں پر دینا چاہیئے جو زیادہ ضروری ہیں
اور جنکے حاصل کئے بغیر ترقی کے دروازے کھل نہیں سکتے۔ ہم کسی آئندہ اشاعت
میں جونیس کے بعض خطوط سے فرداً فرداً بحث کرینگے +

عبدالقادر

حکیم سولون

حکمائے یونان کے حالات کا ... سے ... جناب محمد جلیل الرحمن صاحب نے
... سید احمد مصری ... علامہ ... کیا ... پھر شروع کیا جاتا ...
ہے ... صاحب ... تالیف ... مگر بعض اتفاقات سے ... رہے
کی مدد ... خالی ... آج حکیم سولون کے حالات لکھے جاتے ہیں

حکیم سولون چھتیسویں اولمپیاد کے تیسرے سال میں پیدا ہوا جو ۶۴۰ سال
قبل مسیح کے مطابق ہوتا ہے۔ چھیالیسویں اولمپیاد کے تیسرے سال شہر ایتھنز
میں قانون کا آئین ... کرنے لگا اس کی عمر ... برس کی ہوئی۔

سولون شہر ایتھنز کا باشندہ تھا اور صوبہ سلامین میں پیدا ہوا تھا۔
ایک بادشاہ مسمی بہ قدروس کی نسل سے تھا۔ اس کی والدہ پیرسٹراٹ کی والدہ
کے چچا کی بیٹی تھی۔

لڑکپن میں ہی اس نے حصول علم کے لیے مصر کا سفر کیا جو اس زمانہ میں
دارالعلوم بنا ہوا تھا۔ اور وہاں سے حکمت و دیگر علوم حاصل کر کے ایتھنز میں
واپس آیا تو صاحب عزوجاہ ہو گیا اور بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا۔

حکیم سولون نہایت عقیل و صاحب فہم شخص تھا صدق و صفا اس کی خاص
صفات تھیں۔ بڑا شاعر۔ فاضل۔ لیکچرار۔ قانون دان۔ اور شجاع تھا۔ عمر بھر
اپنے وطن کی حمایت و آزادی کے لیے ساعی رہا۔ ظالموں کا ہمیشہ دشمن رہا۔ اپنے

اہلِ حیل کے علوم مراتب کی اس نے کبھی پروا نہیں کی بسبب طبیعت کے کبھی کسی
زیادہ توجہ نہیں کی۔ طالیس کی طرح اس نے بھی ایک ہی استاد پر قناعت نہیں کی۔
علمِ اخلاق و سیاست پر اپنی تمام ہمت صرف کرتا تھا۔ اس کا قول حکمت میں سے
ایک یعنی خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا بہت مشہور و قابلِ عمل چلا آتا ہے۔
سولن حکیم طالیس کا شہرہ سن کر شہر ملیطہ جا کر اس سے ملا اور کچھ باتیں کر کے اس سے پوچھا
کہ مجھے تعجب ہے کہ تم شادی کیوں نہیں کرتے۔ تمہاری اولاد ہوتی انکو پرورش
کرتے لکھاتے پڑھاتے تو اس بیکاری سے بدرجہا بہتر ہوتا۔ حکیم طالیس نے
اسکا اس وقت کوئی جواب نہیں دیا۔ چند روز کے بعد ایک شخص آیا کہ جس نے اپنے
آپ کو مسافر ساں کیا۔ حکیم طالیس نے سولن سے کہا کہ یہ شخص ایتھنز سے آیا
ہے۔ سولن نے اس سے وہاں کے حالات پوچھے تو اس نے بیان کیا کہ جس وقت
میں چلا ہوں ایک جوان مر گیا تھا تمام شہر کے لوگ اس کی تجہیز و تکفین میں شامل تھے
کیونکہ یہ شخص شریف النسل اور ایک مسلّم عالم و فاضل کا بیٹا تھا۔ بدقسمتی سے باپ سفر
میں تھا اور شہر چھوڑے چند ہی روز گذرے تھے۔ لوگوں نے اسکو اس واسطے اس واقعہ
کی خبر نہیں دی کہ کہیں رنج ہی میں حزن و غم سے جان نہ دیدے۔ سولن
چیخ اٹھا کہ وہ بدقسمت باپ میں ہی تو ہوں۔ پھر اس نے اس مرنے والے جوان کے
باپ کا نام پوچھا تو مسافر نے کہا کہ نام تو میرے دل سے اتر گیا ہے۔ لیکن تمام لوگ
کہتے تھے کہ وہ شخص حکیم ہے۔ یہ سنکر سولن کی حالت غیر ہو گئی۔ اور مسافر سے پوچھا
کہ اس کے باپ کا نام سولن تو نہیں بتلاتے تھے۔ مسافر نے فوراً کہا کہ ہاں یہی
نام لیتے تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ سولن لگا رونے پیٹنے۔ کپڑے پھاڑ ڈالے۔
بال نوچ ڈالے۔ زمین پر لوٹ گیا۔ دردناک اشعار پڑھنے لگا۔ غرض حزن و غم کی
کوئی ایسی اضطراری کیفیت نہ تھی کہ اس پر طاری نہ ہوئی۔ طالیس بیٹھا دیکھتا رہا اور

اس سے کہا کہ میں حیران ہوں کہ تم کیوں اس قدر روتے دھوتے ہو۔ ایسی بات پر بے فائدہ روتے ہو کہ جس پر تم کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ نہ تمہارے رونے سے تمہارا بیٹا تم کو مل سکتا ہے۔ سولون نے کہا کہ یہی تو مصیبت ہے کہ اسی پر مجھے رونا آتا ہے کہ یہ ایسا مرض ہے کہ جس کی کوئی دوا ہی نہیں۔ یہ سنکر طالیس ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ بھائی یہی وجہ مجھے شادی کرنے کی مانع ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ سخت دل سے سخت دل بھی شعف عشق اور تربیت اولاد کی تاب نہیں لاسکتا۔ پھر اس کو اطمینان دلایا کہ جو خبر تم کو سنائی گئی ہے۔ غلط ہے۔ بیان کی ہے تاکہ تم کو ایک غلطی پر متنبہ کردیا جائے۔ اس پر غم نہ کرو۔ یہ تو ایک طرح کا مذاق تھا۔

کہتے ہیں کہ باشندگان ایتھنز و معارئین کے درمیان میں جزیرہ سلامینا کے اوپر مدتوں لڑائی جاری رہی اور سخت جنگ کے بعد یہ نتیجہ ہوا کہ ایتھنز والوں نے شکست فاش کھائی۔ اور قتل و غارت سے سخت نقصان اٹھایا۔ یہانتک کہ اہل ایتھنز نے یہ قرار دیا کہ جب تک کہ معارئین قابض ہیں۔ جو شخص اس جنگ اور معارئین سے انتقام لینے کا ذکر کریگا۔ اسکی سزا موت ہوگی۔ سولون نے یہ دیکھکر کہ اگر میں اس معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو مارا جاتا ہوں اور اگر خاموش رہتا ہوں تو میرے اہل وطن و ملک کو سخت نقصان پہنچتا ہے جو نہایت شدید ہے۔ خود کو پاگل بنالیا۔ تاکہ جو کچھ چاہے بک جائے اور کوئی باز پرس نہ کرسکے۔ جب شہر میں مشہور ہوچکا کہ سولون مخبوط الحواس ہوگیا ہے تو جوش انگیز نظم لکھی۔ اور گھر سے اس شان کے ساتھ نکلا کہ پھٹے پرانے کپڑے بدن پر تھے۔ گلے میں ایک رسی تھی سر پر ایک نہایت میلا کپڑا پڑا ہوا تھا۔ لوگ اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھکر اس کے گرد جمع ہوگئے۔ سولون اس جم غفیر کو ساتھ لئے ہوئے اس پتھر پر جا چڑھا۔ جہاں واعظین و مقررین تقریریں کیا

طاقت ملی ہوئی ہیں اور پھر انکو حکم دیا کہ حلقان شرع کے سامنے حاضر ہوں - پھر حکم دیا کہ ایک جال بُت کے قریب پھیلایا جائے اور یہ تمام لوگ اُس کے نیچے آجائیں لیکن جیسے ہی وہ بُت خانہ سے نکلے یہ جال ٹوٹ پڑا - اس پر مکانس نے کہا کہ یہ اس امر کی دلیل واضح ہے کہ بُت اُن سے راضی نہیں ہیں - لہٰذا اہل شہر کو حکم دیا گیا کہ ان سب لوگوں کو سنگسار کردیں - جو لوگ کسی بُت خانہ کے محراب میں جاکر پناہ گزین ہوئے انکو وہیں ذبح کردیا گیا - حتیٰ کہ ان بُت خانوں کی عظمت کی بھی پروا نہیں کی غرض ان بدقسمتوں میں سے بہت ہی کم باقی رہے - اور وہ بھی قاصیوں کی مستورات کی سفارش سے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاصی اور اُن کے خاندان کے لوگوں سے تمام لوگ ناراض ہوگئے اور کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا کہ جو اُن سے بالعنت پیش آتا - اس اثناء میں قیلون کے ساتھیوں کی کثرت ہوگئی - اور اس کی شوکت و عظمت بھی بڑھ گئی -

سولون اس وقت قاصی شہر تھا اسکو اپنے اہل ملک کے نقصان کا سخت اندیشہ پیدا ہوگیا - اور اُس نے ایسی تدبیر سوچی کہ جس سے جانبین خوش ہوجائیں یعنی طرفین اپنی اپنی طرف سے حکام مقرر کرکے اس قصہ و قضایا کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کردیں - ان لوگوں نے قیلون اور اس کے ساتھیوں کی رعایت کی اور منفاکلس کو شہر بدر کرنے کا حکم دیا - اسی پر قناعت نہیں کی - بلکہ اُس کے ساتھیوں کی ہڈیاں تک نکال کر شہر سے باہر پھنکوا دیں - مغاریوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا - یہاں طرفین میں آتش فساد بھڑک رہی تھی - وہاں اُنہوں نے جزیرہ سلامینیا پر قبضہ کرلیا -

فتنۂ اولیٰ کی آگ ابھی فرو نہیں ہونے پائی تھی کہ اس سے بھی سخت ترین فتنہ اٹھ کھڑا ہوا جس نے تمام لوگوں کو بالعموم اور غربا کو بالخصوص سخت نقصان

پہنچایا۔ امرؤیہ تھا کہ اگر کسی غریب پر قرض ہو اور وہ تاریخ مقررہ تک ادا نہ کرسکتا
مقروض قرضخواہ کا غلام بنجائے۔ قرضخواہ کو اختیار تھا کہ وہ اپنے قرض کے
مقابلہ میں خواہ اسکو اپنی خدمت کے لئے رکھے خواہ بیچ ڈالے۔ غربا نے اس
موقعہ پر اس امر پر اتفاق کیا کہ ان ہی میں سے کوئی اُن کا رئیس بنایا جائے تاکہ
وہ قرضہ کے بدلہ میں غلامی کی ذلت سے بچ سکیں اور کسی متمول شخص کے غلام
نہ بن سکیں۔ اور اس کی یہ تدبیر تلائی کہ جس طرح لیسکرغس نے اسپارٹا میں کیا
تھا۔ یہاں بھی تمام ملک کی دولت و حشمت بحصہ مساوی ہر شخص پر تقسیم کر دیجائے
اس معاملہ نے ایسا فتنۂ عظیمہ برپا کیا کہ اس کا فرو کرنا بڑے بڑے مدبروں کے
دست اختیار سے باہر تھا۔ آخر امرا و غربا نے بالاتفاق یہ خیال کیا کہ
فتنہ کی آگ کو اگر کوئی شخص بجھا سکتا ہے تو وہ حکیم سولون ہے۔ اور وہی کوئی
ایسی سہل تدبیر نکال سکتا ہے کہ جس سے ہر فریق کو تسکین ہوجائے۔ لیکن جب
حکیم سولون پر منصب پیش کیا گیا تو اس نے بہت سے عذر کئے۔ اور انکار
کردیا۔ لیکن بالآخر اپنے ملک و وطن کے فائدہ کو سوچ کر منظور کرنا پڑا۔ اصل
یہ ہے کہ دونوں فریق نے اسکو اس لئے پسند کیا تھا کہ ابتدا ہی سے اس کا قول تھا
کہ اگر مساوات قائم رکھی جائے تو کبھی کوئی لڑائی جھگڑا پیدا نہ ہو۔ اس قول
کے معنی ہر فریق اپنے مطلب کے موافق نکالتا تھا۔ غربا کہتے تھے کہ حکیم سولون
کا یہ مقصد ہے کہ تمام انسانوں کی حالت مساوی ہونی چاہئے۔ اور مال و
دولت ہر شخص میں علی العموم برابر تقسیم ہونا چاہئے۔ اُمرا کہتے ہیں کہ حکیم سولون
کی یہ مراد ہے کہ مال وغیرہ تمام چیزیں لوگوں میں علیٰ مراتب برابر ہونی چاہئیں۔
یہ ایسا معاملہ تھا کہ جس نے حکیم سولون کو ہر فریق کا محبوب بنا رکھا تھا اور چونکہ
ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میں نے سولون کے قول کے صحیح معنی سمجھے ہیں اور ضرور وہ

کثرت رائے کے موافق اپنا فیصلہ صادر کرے۔ اس لئے بالاتفاق سب نے یہ منصب اس پر پیش کیا۔ حتیٰ کہ جو لوگ بالکل بے تعلق تھے۔ اور جن پر اس معاملہ کا مضر یا مفید کوئی اثر نہ پڑتا تھا وُہ بھی اس میں شامل تھے اور چاہتے تھے کہ عوام الناس پر ایک ایسا آدمی حاکم بنایا جائے کہ جو ملک بھر میں سب سے بہتر اور عقیل و فہیم ہو۔ اور چونکہ یہ صفات سولن ہی میں موجود تھیں۔ اسی لئے اسی پر یہ بار ڈالا گیا۔ لیکن حکیم سولن نے کسی طرح قبول نہ کیا۔ اور یہ کہکر قطعی انکار کر دیا کہ جو شخص اس منصب کو اختیار کر لیگا۔ ممکن نہیں کہ وُہ ہدف تیر ملامت نہ بنایا جائے اور ظالم نہ کہا جائے۔ اس پر اس کے دوستوں نے اُسے سخت ملامت کی اور کہا کہ یہ منصب تم کو بطریق حلال ملتا ہے۔ افسوس ہے کہ مجرد اس کے کہ تم کو اس منصب کے لئے نامزد کیا گیا۔ تم واقعات گذشتہ سے خود کو بےخبر بتلانے لگے کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ طیموندا اس نے جزیرہ اوبائیہ پر بادشاہ کے تسلط حاصل کر لیا تھا اور پتیاکس جیسا حکیم فیلسوف اب بھی شہر میطلینیا پر بادشاہ ہے۔ حکیم سولن یہ سنکر بھی راضی نہ ہوا۔ اور اپنے اصرار پر قائم رہا اور کہا کہ امارت شرعیہ ہو یا ولایت ملکیہ یہ بہت بڑے منصب ہیں۔ اور اپنے ساتھ ہر طرح کی مصیبت لاتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ آدمی انکو قبول کر لے تو پھر مصائب سے نہیں بچ سکتا۔ غرض سولن کسی طرح راضی نہ ہوا حتیٰ کہ اس کے تمام دوست و احباب اسکو مجنون بتلانے لگے۔

باایں ہمہ سولن نے اپنی تمام تر کوشش اس فتنہ کے سکون پر صرف کر دی جو شہر ایتھنز میں برپا تھا۔ چنانچہ اُس نے حکم دیا کہ تمام قرض مذکورہ اہل شہر ادا کر دیں۔ کوئی مقروض ایسا نہ رہ جائے کہ جس پر قرضخواہ تقاضا کر سکے۔ وہ ساتت قطعات اراضی کہ جو حکیم سولن کو اپنے باپ سے

وہ جو میں ملے تھے اس نے لوگوں کے ادائے قرض میں لگا دیئے اور یہ حکم دیا کہ اس کے بعد کسی شخص پر ادائے قرض کے لئے تقاضا کرنا جائز نہ ہوگا اور نہ پرانی رسم کے موافق مدیون کو غلام بنا لینا جائز ہوگا۔

باوجود اس کے کہ حکیم سولون نے یہ تمام تدابیر غربا اور اُمرا کے درمیانی جھگڑوں کے رفع کرنے کے لئے کیں لیکن لطف یہ ہے کہ دونوں فریق ابتداءً اس سے ناخوش ہوئے۔ بلکہ دونوں کو رنج ہوا۔ امیر تو اس لئے ناخوش ہوئے کہ انکو نقصان پہنچا۔ اور مال میں خسارہ ہوا۔ اور غربا اس لئے کہ ہم کو مال و دولت میں سب کے برابر کیوں نہ کر دیا گیا۔ لیکن آخر جب اس تدبیر کی خوبیاں معلوم ہوئیں تو فریقین خوش ہو گئے۔

جب لوگوں نے اس معاملہ میں سولون کی حُسن تدبیر دیکھی تو چاہا کہ ایک دوسرے فتنے کے فرو کرنے میں بھی سعی کرے کہ جس کی وجہ سے شہر ایتھنز تین فرقوں میں منقسم ہو رہا تھا۔ یعنی باشندگانِ علاقہ کوہی چاہتے تھے کہ معاملہ میں اُن کی رائے کی زیادہ وقعت کیجائے۔ کیونکہ ان کی تعداد باشندگانِ شہر سے کہیں زیادہ ہے۔ اہلِ شہر کہتے تھے مصالح ملکی اہل اعتبار کے سپرد ہونے چاہئیں۔ اور اہالیانِ بحر چاہتے تھے کہ نظم و نسق ہمارے ہاتھ ہو جانا چاہئے۔ غرض ان تینوں فرقوں کے فسادات کسی طرح نہ مٹتے تھے۔ لوگوں نے حکیم سولون سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ اپنی عقل کے موافق قوانین ملکی کی تدوین بھی کرے۔ اور جب لوگوں نے اُس کو ان معاملات میں مختار کل مان لیا۔ تو حکیم سولون نے سب سے پہلے اُن قوانین کے باطل کرنے کی طرف توجہ کی کہ جسکو ڈراکون نامی ایک شخص نے وضع کیا تھا۔ اور جو نہایت سخت تھے حتیٰ کہ اُس کے موافق جھوٹ بولنے اور ادنیٰ سی چوری کرنے کی سزا

بھی قتل تھی۔ چنانچہ اُس زمانہ میں یہ مثل مشہور تھی کہ قانون خون کی روشنائی
سے لکھا ہوا ہے۔ ایک روز کسی نے ڈراکون (اس قانون کے واضع) سے دریافت
کیا کہ تو نے تمام جرائم کی سزا قتل کیوں رکھی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ میرے
نزدیک ادنیٰ جرم کی سزا قتل ہی ہے۔ چونکہ اس سے زیادہ کوئی اور سزا نہیں ہو سکتی
اس لئے بڑے جرموں کے لئے بھی مجبوراً مجھے یہی سزا رکھنی پڑی

حکیم سولن نے رعایا کو اُن کی حیثیت مالی کے موافق تین فرقوں میں
منقسم کیا اور ان کو حقوق ملکی حسب ذیل دیے۔ دستکاروں کو البتہ الگ رکھا کیونکہ
وہ اپنے اشغال ہی میں مصروف رہتے تھے اور اسی باعث کو وظایف سے متعلق نہ
رکھا۔ یہ کہ بڑے بڑے عہدے تمام فرقہ اولیٰ میں سے منتخب کئے جائیں۔ نیز
یہ کہ جو شخص دولتمند ہو اُس کے جسم پر کوئی ایسی علامت بنا دی جائے کہ جس کی وجہ
سے وہ ہمیشہ متمیز رہے۔ اگر مرد کسی امیر عورت سے شادی کرنیکے بعد نامرد
ثابت ہو تو وہ عورت اپنے شوہر کے کسی رشتہ دار سے شادی کر لے۔ عورتوں
کو جہیز میں صرف تین کپڑے اور قلیل سا اسباب دیا جائے۔ جو شخص اپنی زوجہ
سے کسی کو زنا کرتے دیکھ لے اور اسکو معاً قتل کر دے تو اس کا قصاص نہ لیا جائے۔
عورتوں کے ایسے خرچ کہ جن سے شوہر پر سخت بار پڑتا تھا موقوف کر دیئے۔ مُردوں
کی بُرائی کرنی سخت ممنوع تھی۔ جن لوگوں کی اولاد نہ ہو اُنکو اجازت تھی کہ جس کے
حق میں چاہیں اپنی جائداد کی وصیت کر دیں۔ فضول خرچ لوگوں کے لئے ایسی علامت
مقرر کر دی کہ جس سے وہ مطعون رہیں۔ نیز اُن کے وظایف بند کر دیئے جائیں۔
اسی طرح اُن لوگوں کے وظایف بند کر دینے کا حکم تھا کہ جو والدین کے ضعف و
عجز کے زمانے میں اُن کے خبرگیران نہ ہوں۔ لیکن شرط یہ تھی کہ اُن والدین
کی خبرگیری اولاد پر فرض نہ تھی کہ جنہوں نے اُن (اولاد) کو کوئی صنعت

وہ حرفت بچپن میں نہ سکھلائی ہو۔ غیر جگہ کا باشندہ ایتھنز کا رہنے والا نہ سمجھا جائے۔ تاوقتیکہ وہ اپنے اہل و عیال کو اسی شہر میں لا کر اپنا کاروبار نہ شروع کردے۔ پہلوانوں کو انعامات دیئے جاتے تھے۔ اُن میں کمی کر دی۔ حکم دیا کہ جو لوگ حمایتِ وطن میں مارے گئے ہیں۔ اُن کی اولاد کی پرورش بیت المال سے کی جائے۔ یتیموں کے وصی یتیموں کی ماؤں کے ساتھ ایک مکان میں نہ رہیں۔ نہ وارث قریب یتیموں کے وصی بنائے جائیں۔ چوری کی سزا موت مقرر کی گئی۔ خواہ کہیں ہو اور کتنی ہی کم کی ہو۔ جو شخص کسی کی آنکھ نکال لے اُس کی سزا آنکھ نکال لی جاتی تھی۔

یہ اور اس قسم کے متفرق قوانین جو سولون نے وضع کئے تھے۔ تختیوں پر لکھے گئے تھے اور اُن لوگوں سے کہ جن کے سپرد اُن قوانین کا نفاذ تھا بھرے مجمع میں حلف لیا گیا کہ وہ اُن کی حفاظت کرینگے اور اس پر عمل کرینگے۔ بصورت خلاف ورزی اپنے وزن کے برابر اپنا سونے کا بت بنا کر آفتاب میں کھڑا کرینگے نیز ان قوانین کی تعمیر اور اجراء کے واسطے لائق منتظمین مقرر کر دیئے۔

جس زمانہ میں سولون۔ قوانین وضع کر رہا تھا تو حکیم انکرسیس نے مذاقاً کہا کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح سے ظلم و ستم کی بنیاد اٹھا دو گے؟ ان کی مثال تو بالکل مکڑی کے تار و پود کی سی ہے۔ کہ جس میں سوائے مکھیوں کے اور کچھ نہیں پھنستا۔ سولون نے کہا کہ حفاظت بسیار لوگوں کے آپس کے اتفاق سے ہوتی ہے۔ میں ایسے قانون جاری کرتا ہوں۔ اگر تمام رعایا یہ سمجھیں کہ اس میں اُن کا سراسر نفع ہے تو ہمیشہ اُنکی پابندی کرینگے۔ اور کبھی اس کی مخالفت نہ کرینگے۔ (باقی دارد)

محمد خلیل الرحمٰن

مکھیوں کے حواس اور احساس

قدرت نے ادنیٰ درجے کے جانوروں میں جس طرح کے حواس عطا کیے
ہیں اُن کا صحیح قیاس کرنا انسان کی سمجھ سے باہر بات ہے۔ کیڑے مکوڑوں
کی عقل اور اُن کے اصولوں سے ہم بالکل بے خبر ہیں۔ کیا معلوم انکو کیونکر
احساس ہوتا ہے اور وہ کسی چیز کو کیا سمجھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے
قدرت نے کیڑوں کی ساخت کو سیدھی سادی رکھا ہے۔ اُن کا ایک عضو کئی
حواس کا مرکز ہوتا ہے۔ اس کی ساخت کی ترکیب کو دیکھ کر ہم انسان
بناتے ہیں جو علم آلات سازی کے اصول سے حیرت انگیز ہے۔ ایک ننھا سا
عضو کیڑے کی زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کے سامنے انسان
کے بنائے ہوئے بہترین آلات جن سے ہم اپنی قوتِ مدرکہ کو مدد دیتے
ہیں مات ہیں۔ لو اب اپنی شہد کی مکھی کا حال سنو۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ
مکھی کے دو سینگ ہوتے ہیں جو سر میں دونوں جانب کو باریک دھاگے
سے نکلے ہوئے ہیں۔ ان سینگوں کو ایک قدرتی آلہ سمجھو جس سے مکھی کل
چیزوں کو ٹٹول کر جانچ لیتی ہے اور سمجھ جاتی ہے کہ وہ کیا چیز ہے اس کی کیفیت
کیا ہے اور اس کی ہیئت کیسی ہے۔ مکھی کو اپنے سینگوں سے حسِ لامسہ کا ادراک
ہوتا ہے وہ اس عضو کی مدد سے تاریکی میں چھتے کی عمارت تیار کرتی ہے اور
اس کے خانوں کو جو چھ پہل ہوتے ہیں اس طرح بناتی ہے کہ سب خانوں کے
زاویے برابر ہوتے ہیں اور بال برابر فرق نہیں پڑتا۔ مکھی کے سینگ کی حسِ لامسہ
اتنی تیز ہے کہ وہ بہت سی چیزوں کو بلا چھوئے ہوئے تمیز کر لیتی ہے۔ چھتے کے

ننھے معمار جسوقت اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں تو اُن کا یہ چھوٹا سا عضو ان کے بنائے ہوئے فن عمارت کے کل اوزار اور آلات کا کام دیتا ہے خادم مکھیاں جنکو بچوں کی خدمت سپرد ہوتی ہے وہ اپنے اسی عضو کی مدد سے اس خدمت کو انجام دیتی ہیں۔ بس اگر تم حیرت کرو گے۔ مکھیاں محض حس لامسہ سے بچوں کی ہر ایک ضرورت کو سمجھ جاتی ہیں۔ اسکو پورا پورا کرتی ہیں وہ اپنے سینگوں کے ذریعہ سے باتیں بھی کرسکتی ہیں۔ ایک مکھی دوسری مکھی کو اپنے سینگ سے اس طرح چھوتی ہے کہ وہ اس کے خیالات کو سمجھ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرح کے خیالات اور جذبات کے لئے ایک خاص انداز مقرر ہے جسکو ہر ایک مکھی فطرتاً جانتی ہے اور وہ اس قدرتی علم اشارہ کے وسیلے سے آپس میں خیالات کا تبادلہ کرسکتی ہے مکھی کا سینگ قطب نما کا بھی کام دیتا ہے جس وقت خادم مکھیاں پھولوں کے رس کی تلاش میں دُور دُور نکل جاتی ہیں تو وہ اپنے سینگوں سے چھتے کی سمت کو معلوم کرتی ہیں تم نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت مکھی پھولوں کا رس لیکر گھر کو روانہ ہوتی ہے تو پہلے ہوا میں چکر لگاتی ہوئی اونچی ہوتی ہے اس کے بعد اپنے چھتے کی سمت کو معلوم کرکے سیدھی اُسی جانب کو پرواز کرتی ہوئی گھر پہنچ جاتی ہے اور اس میں کبھی غلطی نہیں کھاتی۔ اکثر حکما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مکھی اپنے سینگوں سے آواز کو سن سکتی ہے اور اسی ننھے سے عضو سے اُسکو حس شامہ کا بھی ادراک ہوتا ہے غرض اسوقت تک یہ طے نہیں ہوا کہ مکھی کا سینگ کیسے عضو کا کام دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے حواس کا مرکز ہو جس کا ہم لوگ تصور نہیں کرسکتے اور اس کے بیان کرنے سے عاجز ہیں۔

سردی اور گرمی کے احساس کرنے میں مکھیاں غایت درجہ کی ذکی الحس ہیں جس وقت چھتے کی سردی پڑتی ہے تو اُن کے ہاتھ پاؤں شل ہوجاتے ہیں

اور وہ کوئی کام نہیں کرسکیں۔ باہر کا آنا جانا ترک کردیتی ہیں۔ اور چھتے میں
گوشہ نشین ہوجاتی ہیں اور اس وقت وہ بلا کسی صدمہ کے انتہا درجہ کی برودت
کو برداشت کرسکتی ہیں۔ امریکہ کی شمالی حصہ کا حال، تم نے اپنے جغرافیہ میں پڑھا
ہوگا۔ دیکھا گیا ہے کہ اس ملک میں جس وقت بیرونی ہوا کی برودت نقطہ انجماد
سے ۲۰ درجے نیچے آجاتی ہے اور چھتے کے گرد اندرونی حرارت سردی سے
منجمد ہوجاتے ہیں تو مکھیاں چھتے کی گچھا بنا کر ہوا کرنا جاتی ہیں لیکن جب موسم
بہار آتا ہے اور گرمی پڑنی شروع ہوتی ہے تو انکو ہوش آ جاتا ہے اور اپنا کام
کرنا شروع کرتی ہیں۔ سرد ملکوں میں جہاں جاڑوں میں برف گرتی رہتی ہے شہد کی
مکھیاں شہد کی حفاظت کی غرض سے چھتے کے لئے سایہ ڈھونڈھتی ہیں اور درخت
کے کھوکھلوں میں اپنا چھتہ بنا کر رہا کرتی ہیں۔ مکھیوں کو جب کوئی ایسی محفوظ
جگہ نہیں ملتی جہاں وہ آرام سے رہیں تو آخر ان میں سے کوئی سردی کی ایذا
کی تاب نہیں لا سکتی اور وہ مر جاتی ہیں۔

مکھیوں کی آنکھوں کی حالت تو اوپر پڑھ چکے ہو۔ ان کی نگاہ بہت دوربین
ہوتی ہے جس سے وہ دور دور کے پھولوں کو دیکھ سکتی ہیں۔ یوں تو طرح طرح
کے حرتی رنگ پھولوں پر مکھیاں جان دیتی ہیں لیکن کل رنگوں میں انکو نیلا اور گلابی
رنگ بہت پسند ہے پرفضا وادیوں میں جہاں ہزاروں طرح کے پھول کھلے رہتے
ہیں۔ مکھیاں پہلے نیلے رنگ کے پھولوں پر جا کر بیٹھتی ہیں۔ اس رنگ کی تان
دل آویزی کو کوئی اُن کے ننھے دل سے پوچھے۔ تجربہ سے دیکھا گیا ہے اور
جی چاہے تم خود آزما کر دیکھ لو کہ جب ہر قسم کے رنگین کاغذ کے ٹکڑوں پر شکر
کا قوام لگا دیا جاتا ہے تو مکھیاں گلابی اور زیادہ تر نیلے رنگ کے کاغذ پر آ کر
قوام کو چاٹ جاتی ہیں۔ شمع کی روشنی جو پتنگوں کے لئے اک قدرتی طلسم ہے

اور جس کے حسن جاں سوز کا راز دریافت کرنے میں ہزاروں پروانوں نے
جان دیدی ۔ شہد کی مکھیوں پر جادو کا اثر رکھتی ہے۔ روشنی دیکھکر مکھیاں
بیخود ہو جاتی ہیں نہ معلوم کیسے برقی رگ گذرتی ہے اور کس طرح کے احساسات
جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ جس سے وہ بیقرار ہو کر چل پڑتی ہیں۔ فصل کے انقلاب
کو مکھیاں اتنا جلد تاڑ جاتی ہیں کہ اس وقت تک بنی نوع انسان کو باوجود تمام
عقل و ادراک کے اس کی مطلق کوئی خبر نہیں ہوتی۔ دیکھا گیا ہے کہ کام کرتے
کرتے مکھیاں ایک دم سے سناٹے میں آکر رک جاتی ہیں۔ کوئی بھی چھتے سے
نکل کر باہر نہیں جاتی اور جو جا چکی تھیں پھولوں کے رس کی تلاش میں باہر
چلی ہوئی ہیں وہ بدحواس جوق جوق گھر کو واپس آتی ہیں اور چھتے کے دروازے
پر آکر ہجوم کر لیتی ہیں۔ غرض انکا یہ غیر معمولی ہراس کسی آنے والی آفت سماوی
کی خبر دیتا ہے جس کی اطلاع اس وقت تک ہمارے ذکی الحس آلات بھی
نہیں دے سکتے۔ آخر جب انقلاب زیادہ نمایاں ہوتا ہے تو ہم کو اس آنے
والی آفت یا طوفان کی خبر ہوتی ہے۔ مکھیوں کو جو اس کی خبر پہلے ہو جاتی
ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انکے احساس کی قوت نہایت تیز ہے۔ سورج
کی روشنی ذرا سی کم ہوئی اور انکو یہ حال معلوم ہو گیا۔ روشنی کا یک بیک
گھٹ جانا مکھیوں کے لئے ایک خوفناک منظر ہے جس سے ڈر کر گھر کو واپس
چلی آتی ہیں۔ ورنہ جس وقت آسمان میں اودے بادلوں کی گھنگھور گھٹا چھائے
رہتی ہے لیکن سورج کی روشنی ایک حالت پر قائم ہوتی ہے تو مکھیاں بلا تامل
اپنا کام کرتی ہیں۔ یہانتک کہ بوندیں پڑنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اطمینان
سے گھر کو لوٹتی ہیں۔ غرض اس وقت تک یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچی کہ
آنے والے طوفان کا حال دریافت کر لینے میں مکھیاں محض اپنی دوربین

نگاہوں سے کام لیتی ہیں۔ یا اُن کے جسم میں کوئی عضو ایسا ہے جو آلۂ سماعت
کا کام دیتا ہے۔

حسِ ذائقہ

مکھی کی سونڈ میں کوئی حصہ ایسا ہے جس میں حسِ ذائقہ پائی جاتی ہے گو کہ
مکھیوں میں ہر چیز کے مزے کو معلوم کرنے کی قوت موجود ہے لیکن وہ اس کو
زیادہ کام میں نہیں لاتیں۔ پھولوں کے رس کا ذائقہ چاہے کس طرح کا ہو لیکن
مکھیاں اسکو شہد بنانے کے لئے ضرور لاتی ہیں۔ بہت سے قسم کے پھول
ایسے ہیں جن کا رس بہت کڑوا اور زہریلا ہوتا ہے۔ امریکا میں اس طرح کے
پھول زیادہ ہوتے ہیں جن کے رس سے مکھیاں شہد بناتی ہیں یہ شہد زہر
قاتل ہوتا ہے جسکو کھا کر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ تمہارا خیال یہ ہوگا کہ
شہد ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ بات یہیں سے جا سکتا ذائقہ پھولوں کے مزے
پر موقوف ہے؟ مکھیاں جس ذائقہ کا رس لائینگی اس طرح کا شہد تیار ہوگا۔ املی
کے پھولوں کا شہد ترش ہوتا ہے۔ اس کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ مکھیاں
اپنی غذا کا ذخیرہ جمع کرنے میں کسی خاص ذائقہ کا خیال نہیں کرتیں لیکن اتنی
بات ضرور ہے کہ ان کو شیریں مادہ مرغوب ہے۔

حسِ شامہ

اس میں شک نہیں کہ شہد کی مکھی کی حسِ شامہ نہایت تیز ہوتی ہے۔
لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کونسا عضو ہے جو ناک کا کام دیتا ہے۔ بڑے
جانوروں میں تو حسِ شامہ کا ادراک ناک کے ذریعہ سے ہوتا ہے جس سے وہ
سانس لیتے ہیں۔ اگر اسی اصول کو لو تو مکھی کی ناک اس کے جسم کے سوراخ
ہیں جن سے ہوا اندر داخل ہوتی ہے۔ لیکن تجربہ اس کے خلاف رائے قائم
کرتا ہے اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مکھی کو جس عضو سے حسِ شامہ کا ادراک
ہوتا ہے وہ مُنہ کے پاس ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی مکھی کے مُنہ کو لئی سے

سند کرو تو جن چیزوں کی مہک سے وہ نفرت کرتی ہے انکو بو پاتے ہی گھبرا لیتی اور برانگیختہ
ہیجان ہوتی۔ مکھی کی قوت شامہ بلا کی ذکی الحس ہوتی ہے ایک چھتے کی مکھیاں آپس
میں ایک دوسرے کو سونگھ کر پہچان لیتی ہیں۔ اگر کوئی اجنبی مکھی چھتے میں گھس آئے
تو وہ فوراً قوت شامہ سے پہچان لی جاتی ہے اُس کی جھولی میں اگر شہد بھرا ہو تو
مکھیاں چھتے والی مہمان کے ساتھ بہت خلوص اور اخلاق سے ملتی ہیں کوئی
مکھی مزاحم نہیں ہوتی لیکن جب اُس مکھی کے پاس نہ شہد ہو تو چھتے کی مکھیاں
اس کے تیور دیکھکر سمجھ جاتی ہیں کہ وہ بھوکی ہے اور شہد چرانے کی فکر میں آئی
ہے۔ اس وقت انتہا درجہ کی بے مروتی اور سختی برتی جاتی ہے اور بیچاری مکھی کی
شامت آجاتی ہے۔ اکثر چیزوں کی مہک کو مکھیاں ناپسند کرتی ہیں۔ دھواں
تو انکے لئے کالی بلا ہے جس سے انکا دم بند ہو جاتا ہے۔ ذرا دھواں دیا اور
بھگدڑ پڑ گئی۔ پریشانی کے عالم میں مکھیاں اپنے چھتے کو چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہیں
اس وقت اُن کی حالت خطرناک ہوتی ہے اور مارے غصے کے اپنی جان دینے
پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ نوسادر کا فوراً اور تارپینٹ وغیرہ جیسی چیزوں کی تیز
مہک سے مکھیاں حد درجہ کا تنفر ظاہر کرتی ہیں اور فوراً برانگیختہ ہو جاتی ہیں تمباکو
کا دھواں مکھیوں کو بوکھلا دیتا ہے اور ان کی قوت شامہ بودی پڑ جاتی ہے۔
مکھی کے پالنے والے جب دو چھتوں کی مکھیوں کو ملا دینا چاہتے ہیں تو وہ یہ
ترکیب کرتے ہیں مکھیوں کو دھواں دیکر ایک ساتھ ملا دینے سے ایک چھتے کی مکھی دوسرے چھتے
کی مکھی کو نہیں پہچان سکتی جس کی وجہ سے آپس میں جنگ نہیں ہوتی اور سب
مکھیاں ایک ساتھ ملکر رہنے سہنے لگتی ہیں تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ سیاہ
رنگ کی مکھیاں بھورے رنگ کی مکھیوں کے ساتھ مل جاتی ہیں اور ایک ساتھ
کام کرتی ہیں اگرچہ ان دونوں انواع کی مکھیوں کا رنگ جداگانہ ہے لیکن پھر بھی جب وقت

لگی جس شاہ مکھی کے خاتمہ سے مغلوب کر دی جاتی ہے تو ایک نوع دوسری نوع کو تمیز نہیں کر سکتی ہے۔ ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ مکھیاں ایک دوسرے کو شناخت کرنے میں اپنی آنکھوں سے کام نہیں لیتیں جب کسی چھتے کی رانی مر جاتی ہے تو دوسرے چھتے کی ملکہ مکھی یا شاہزادی کو گرفتار کر کے لاتے ہیں اور اسکو قید کر رکھتے ہیں چند روز میں کل خادم مکھیاں اپنی نئی ملکہ کی خوشبو سے مانوس ہو جاتی ہیں اور اسکو اپنا حاکم تسلیم کر کے چھتے کی ساری حکومت اس کے سپرد کرتی ہیں

شہد کی مکھیاں آواز سن سکتی ہیں انکو رغبت دلا کر ملانے کے لئے زور سے ڈھول یا جھانجھ کا بجانا اسی اصول کی بنا پر ہے جس وقت مکھیاں جوق جوق ہوا میں اڑ رہی ہوں تو انکو ترغیب دیکر اپنے گھر لانے کے لئے باجوں سے شور مچاتے ہیں اس کرنے سے مکھیاں اتر آتی ہیں اور جو لبتا ہے اسکے گھر ڈیرا ڈال دیتی ہیں لیکن تجربے سے دیکھا گیا ہے کہ چھتے کے پاس جا کر اگر زور سے ہلاو یا تالیاں بجاؤ تو مکھیاں اسکی مطلق پروا نہیں کرتیں۔ توپوں کی ہولناک آواز اور بادلوں کی دل ہلانے والی گرج ان پر کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتی۔ مکھیاں اطمینان سے چھتے میں اپنا کام کرتی ہیں اور انکو ان آوازوں کی کوئی خبر تک نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی نے کچھ سنا ہی نہیں لیکن یہ بات نہیں ہے۔ وہ آواز کو ضرور سنتی ہیں اس لئے کہ جس وقت وہ غصہ یا نفرت یا اور اس طرح کے جذبات دلی کو اپنی آواز سے ظاہر کرتی ہیں تو دوسری مکھیاں اس کو سنکر سمجھ جاتی ہیں اور اپنی ہمدردی کا اظہار اسی طرح کی آواز سے کرتی ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ جس وقت چھتوں میں نیا جھول پیدا ہوتا ہے اور ان میں دو چار شہزادیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ اپنے شاہی خانوں میں جس میں خادم مکھیاں انکو بند کر دیتی ہیں ایک سریلی آواز سے دم بھرا کرتی ہیں جس سے ان کی تمکنت اور وقار شاہی عیاں ہوتا ہے۔ ملکہ مکھی اس آواز کو سن کر رشک کھاتی ہے اور نوخیز شہزادیوں کو ہلاک

کر ڈالنے کے ارادہ سے بار بار حملہ کرتی ہے لیکن خادم مکھیاں ملکہ کو اس ناپاک ارادے سے روکتی ہیں۔ اور جب ملکہ قابو نہیں پاتی تو اس طرح کی آواز سے اپنے نفرت انگیز جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ اور برابر سے جواب دیتی جاتی ہے۔ ملکہ مکھی جس وقت خادم مکھیوں کو کسی کام کے انجام کرنے کے لئے حکم کرتی ہے تو طرح طرح کی آواز سے بولتی ہے۔ ہر موقع اور ہر کام کے لئے ایک خاص آواز مقرر ہے جسکو سنکر خادم مکھیاں فرمانِ شاہی بجا لاتی ہیں +

سید احسن حسین بی اے

غزل

بن گئی دل پہ یہاں عشق کا سودا ہوکر — پھر بھی کمبخت رہا جان سے پیارا ہوکر

یاد ساقی جو ہمیں آیا تو آنسو میرے — خوں بھری آنکھ سے چھلکے مئے صہبا ہوکر

اے شہِ حسن ترے اقبال کی حد ہے کہ تجھے — گھیرے رہتا ہے ہما بلبلِ شیدا ہوکر

عقلِ انساں کی رسائی نہ ہوئی حسن تلک — اڑ گیا نام اسی حیرت کا عنقا ہوکر

خاک ہوے بھی دل سے تمنا نہ مٹی — کہ رہی چشم فسوں ساز میں سرمہ ہوکر

اک کھٹک تھی مگر اسکی بھی خوشی تھی ہمدم — عمر بھر دل میں رہا خار تمنا ہوکر

عہد تیغ و گلو کا نہ ہوا طے نہال — رہ گیا ابروئے قاتل کا اشارا ہوکر

تھی دمِ قتل جو قاتل پہ نظر اپنی نہال
یہ سماں کھچ گیا ان آنکھوں میں نقشا ہوکر

نہال تلمیذ جناب شاد عظیم آبادی

سینٹ پیٹرزبرگ

سفرنامہ سوڈاں · روس کا اسی حصے... میں ناظرین کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے
اس میں سینٹ پیٹرزبرگ کے بعض خاص ملکی تباہی کا ذکر دلکش پیرائے میں کیا گیا
ہے روس کی شخصی سلطنت · وہاں کے جابرانہ شہنشاہ کے خلاف جو کچھ
بیسی کی گئی ہے ... سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو دیوزنیں · اس کی رائے اس کے متعلق
کیا تھی۔ شاید ... دیوزنیں ... موجودہ · روس ... اس
کا فرق ... ہوگا۔

اب ہم شہر کے دریائی حصے میں پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت البتہ شہر اپنی پوری
رونق و عظمت کے ساتھ نظر آیا۔ سب ظلمتوں کے سب جنگی جہاز کے پیش آنیوالے
جھگڑے بھول گئے اور ہم عالیشان محلوں اور عمارتوں کے فرح بخش نظارے
میں جو ہمارے دونوں جانب بندرگاہ کے ایستادہ تھیں محو ہو گئے۔ دریائے
نیوا پر بعض پل بنے ہوئے ہیں بحالِ موجودہ دریا نہایت ساکت تھا اور
اس خوفناک طوفان کا اس پر گمان بھی نہ ہوتا تھا جس سے موسم بہار میں برف
پگھلنے پر تمام جزیروں کے غرق آب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ہوا کے
زور شور سے چلنے پر تمام شہر کو پانی سے بھر دیتا ہے اور اس کے خوف سے
مغرور شاہنشاہ روس تک ڈر رہا ہے کہ کہیں اس کی اعلیٰ درجہ کی عمارت
جڑ بنیاد سے غارت نہ ہو جائیں۔

جہاز سے اترتے ہی بڑی گڑبڑ مچی چنگی والوں کی متلاشی نگاہیں ہر شخص
کے اسباب کی طرف تھیں کہ کونسا کپڑا قابلِ محصول ہے یا کونسی کتابیں قابلِ گرفت
ہیں جن میں سلطنتِ روس کی پالیسی کے خلاف رائے زنی کی گئی ہو۔ یا

تو وہ افسر جن سے ہمیں سابقہ پڑا۔ اُس دن رعایت آمیز برتاؤ پر آمادہ تھے
ناشاید میرے اور میرے دوست کے چہرہ سے "غیر جمہوری" ہونا ثابت ہوتا
تھا۔ بہرکیف کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے کھلے ہوئے صندوق اور چرمی بیگوں
پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی اور تبسم آمیز طریقے پر ہم سے وہاں سے رخصت
ہونے کو کہا گیا۔ نہ ہماری کوئی کتاب لی گئی نہ کوئی لیٹر چھوا گیا۔ تعجب ہے
کہ جہاں اور تمام لوگ ایسی جھیلی ہوئی سختیوں اور تکلیفوں کے قصے بیان
کرتے تھے ہم بلا کسی قسم کی "رشوت" دیئے ہوئے وی جیگی حانہ کے صعوبت
آمیز امتحان میں صاف نکل آئے۔

ہم نے پہلے ہی سے "سٹرام" کو (جو سویڈن کا باشندہ تھا اور جسے ہم نے
سٹاکہوم میں ملازم رکھا تھا) سواریاں تلاش کرنے کے لئے بھیجدیا تھا۔ ایک
چھوٹی سی گاڑی اسباب کے لئے لیگئی اور دوسری گاڑی اپنی سواری کیلئے
ہم کرایہ کرکے اپنے ہوٹل کو روانہ ہوئے۔ بندرگاہ میں اُس وقت بڑی چہل
پہل تھی۔ ہر قسم کی گاڑیاں اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھیں۔ گاڑی والے نیچی
ٹوپیاں دیئے اور لانبا نیلا کوٹ پہنے ہر ایک اجنبی مسافر پر اس قدر لڑتے
تھے کہ وہ مہیب سے سواری رجالے کے بجائے منزلِ مقصود تک چلنا
غنیمت سمجھتا۔

سینٹ پٹرزبرگ ابھی کل آباد ہوا ہے لہذا اُس کی سیر سے دل میں وہ
جذبات نہیں پیدا ہوتے جو یورپ کے پُرانے شہروں کی گلیوں میں پھرنے
سے ہوتے ہیں۔ جہاں کی تاریخیں دیکھنے سے خیالات بے اختیار زمانہ قدیم کے
واقعات کی جانب رجوع ہو جاتے ہیں۔ جہاں نوجوان گذشتہ بہادروں کے
کارناموں میں محو رہتے ہیں اور جہاں قدامت پسند لوگ ازمنہ سابق کی یادگاری

علمات کی شکستہ دیواروں کا درشن ہی غنیمت جانتے ہیں۔ تاہم سینٹ
پٹرزبرگ دلچسپی سے خالی نہیں اور سیاح جب وہاں کی لمبی چوڑی سڑکوں
حد بڑے بڑے میدانوں کو جہاں کہ شاہی مکانات واقع ہیں دیکھتا ہے تو وہ
تعجب و متحیر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام چیزیں ایک عمیق دلدل[1] میں کس طرح بنائی
گئی ہیں۔

سب سے زیادہ دلکش عمارت اسحاق چرچ ہے جس پر ایک مبالغہ آمیز رقم کا
صرف ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محض بنیاد قائم کرنے میں دس لاکھ
روبل خرچ ہوئے ہیں۔ اس کا آغاز ۱۸۱۹ء میں الگزینڈر کے عہد میں ہوا
لیکن اس کی اندرونی آرائش ہمارے زمانہ سیاحت تک نہ ختم ہوئی تھی۔
اس وقت اگرچہ اس کی عمارت کے گرد دیواروں کے لئے چوبی لنگر لگے ہوئے
ہیں تاہم اس کی دلچسپی اور لطافت کے متعلق رائے قائم ہو سکتی ہے

قازان کا گرجا جو حضرت مریم کے نام پر بنایا گیا ہے روم کے **سینٹ پٹر گرجے**
کی نقل ہے۔ لیکن بیرونی عمارت میں پوری نقل اتارنے میں کامیابی نہیں ہوئی
عمارت کے اندر البتہ سونے چاندی اور بیش قیمت جواہرات کا استعمال
بکثرت کیا گیا ہے۔ دروازوں اور دالان کے ستون اور قربانگاہ کے
پردے کی تصاویر کے فریم خالص چاندی کے ہیں جو کاسکوں نے ۱۸۱۲ء
کی مہموں کے بعد اپنی لوٹ مار اور فتح کی نشانی کے طور پر مادر قازان کے
نذر کی تھی۔ ستونوں میں روسی افواج کے فتح کئے ہوئے شہروں کی کنجیاں
آویزاں ہیں۔ اور ادھر ادھر بیشمار جھنڈیاں اور مفتوحہ اشیا پھیلی ہوئی ہیں۔

[1] شہر سینٹ پیٹرزبرگ اور اس کی عمارات جہاں واقع ہیں وہاں پہلے ایک خوفناک دلدل تھا۔

سرمائی محل نے جو اُس عمارت کی جگہ تعمیر ہوا ہے جسے سنہ ۱۸۳۷ء میں آگ نے جلا کر خاک کر دیا تھا اور جس کی وجہ سے کئی پشتوں کا جمع کیا ہوا زر و مال غارت ہو گیا تھا ققنس کی صورت آتش زدگی سے بارہ مہینہ کے اندر ہی اپنی راکھ سے دوسرا جنم لے لیا۔ اس کی دوبارہ تعمیر کی زار نے خواہش کی اور وہ پوری ہو گئی۔ یہ ایک بہت وسیع چار گوشوں کی عمارت ہے۔ ہم "سفیر" کے زینہ سے جو سنگِ موسیٰ کے ستونوں سے بنا ہوا ہے۔ اس میں داخل ہوئے۔ اور ان کو کمرے کمرے اور دالان پھر کر دیکھا۔ جن کی تعمیر پر بہت سا روپیہ صرف ہوا ہے۔ اُن تمام میں سب سے زیادہ خوبصورت **سینٹ جارج** کا کمرہ ہے۔ یہ بہت وسیع ہے اور اس کے آخری حصہ میں تخت رکھا ہوا ہے۔ ایک قطار کارنتھیا کے بنے ہوئے صاف شفاف سنگ مرمر کے ستونوں کی جن سے سائبان اور دالان مشتمل ہے دیوار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی ہے۔ دیوار بھی سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ اس جگہ درباری موقعوں پر **شہنشاہ روس** اپنے زیوروں کے ساتھ اور دلفریب سٹاف کے ہمراہ جن کے زرق برق لباس سے آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ بسا اوقات اپنے حامی فوحات کے ترنگ میں سفراء وغیرہ سے ملاقات کرتا ہے۔

شہنشاہ الگزینڈر کا کمرہ اور نیز ایک دوسرا اسی کے محاذی یہ دونوں بہت نفیس ہیں اور بہت سی تاریخی تصاویر سے جو زیادہ تر روسی جنگوں کی ہیں مزین ہیں۔ اس عمارت کے ایک دوسرے حصہ میں محض ذی شہرت فیلڈ مارشلوں (سپہ سالاروں) کی تصویریں ہیں۔ اور ان کی ایک چوتھائی ان تمام جرنیلوں کی ہیں۔ جنہوں نے سنہ ۱۸۱۲، ۱۳ و ۱۴ کی جنگی مہموں میں خدمات انجام دی تھیں۔ اُن میں جو تصویر سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ہمارے خاص

ڈیوک[1] کی ہے

ایک خالی کمرے میں چار دلچسپ تصویریں شاہنشاہ بیگم اور اُس کے تینوں بیٹوں کی ہیں۔ یہ اِن تصویر کے نہایت قابل تعریف نمونے ہیں۔ انکو ایک انگلش لیڈی مسز رابرٹس نے کھینچا اور اُن پر رنگ آمیزی کی ہو۔ یہ بتلانا غیر ممکن ہو کہ دی شعور مصور نے اِن تصویروں کو دلکش بنانے میں کس قدر رعایت و مروّت سے کام لیا ہے تاہم اگر یہ گرینڈ ڈچیسز کے صحیح اور سچے عکس ہیں تو شاہنشاہ کو بیشک ایسی لڑکیوں کی حسن و خوبصورتی پر ناز ہو سکتا ہے۔

محل کے اندر دو گرجے ہیں ایک بالکل پرائیوٹ ہو اور دوسرا پبلک وہ خوبصورتی میں ایک دوسرے کے مقابل ہیں لیکن اُن کے اندر جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ ہو وہ چند حسن و سبع تصویریں ہیں۔

جواہر خانہ میں جس کے دروازے پر ہمیشہ ایک دستہ فوج بطور محافظ رہا کرتا ہے۔ لوازماتِ شاہی اور جواہرات رکھے ہوئے ہیں۔ شاہی عصا میں وہ ہیرا لگا ہوا تھا جو کوہ نور کے انگلینڈ پہنچنے تک سب سے بڑا خیال کیا جاتا تھا۔ ان جواہرات وغیرہ کی قیمت کا اندازہ کئی ملین پونڈ کا کیا جاتا ہے۔

شاہنشاہ بیگم کے پرائیویٹ کمرے کو جس میں گنگا جمنی اور سنہرا کام کیا گیا ہو۔ محل کا ہیرا کہا جا سکتا ہے۔ گنگا جمنی کام سبزی اور طلائی کام کی چمک دمک دونوں ملکر آنکھوں کو بہت لُطف اور فرحت بخشتی ہو۔ اِس جگہ اُن دونوں کمروں کا ذکر بھی کرنا ضروری ہو جن میں گرینڈ ڈیوک

[1] ڈیوک سے مراد غالبا ڈیوک آف ولنگٹن ہو۔

[illegible] عرشانند [illegible] کا لقب [illegible] [illegible]
[illegible] جتنے کہ اوّل الذکر کے اور مکانات [illegible]

. . . .

. . . .

یہ مکان (سرائی محل) اُس شخص کا قیام گاہ ہے جو آبادیٔ عالم کے ساتویں حصے پر حکمراں ہے اور ساٹھ ملین سے کچھ زیادہ نفوسِ انسانی پر فرمانروائی کرتا ہے جن میں سے ایک تہائی اُسے اپنا دیوتا خیال کرتے ہیں۔ اس چار دیواری کے اندر ہمیشہ اُن تجاویز پر خیالی پلاؤ پکایا گیا ہے جو اگر پوری ہو جاتیں تو تہذیب و تمدن کی رفتار رُک جاتی اور وہ دماغی ترقی جو چالیس برس سے اس ملک کو دوں بلکہ نشوونما پا رہی ہے قائم نہ رہتی۔

کیسترائن عظم کا جو نیرا ابھی اگرچہ اُس کے نام سے اُس کی گمنامی اور بے وقعتی ظاہر ہوتی ہے ایک وسیع محل ہے۔ یہ جگہ اس غیر معمولی اوصاف والی عورت نے اس لیے پسند کی تھی کہ وہ یہاں اُن تمام نامی گرامی اشخاص کے ساتھ جو اپنے علم و فضل یا اپنے بہادرانہ کارناموں اور اپنی لافانی صناعیوں کی وجہ سے مشہور زمانہ تھے۔ شاہی دربار کے رسوم و آداب سے الگ ہو کر بے تکلفانہ طریقہ پر سرگرم گفتگو رہتی تھی اور اُن مباحث کے سبب جس میں فلسفیانہ نکات اور ذہنی قابلیتوں اور جودتِ طبع کی بدولت خاص دلچسپی پیدا ہوتی تھی۔ اس سوشل مجلس کی بہت شہرت ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے اکثر ممبروں نے اپنی تحریروں اور یادداشتوں میں اس کا ذکر کر کے اُسے حیاتِ جاوید دیدی۔

جو نیرا میں ایک عظیم الشان میوزیم ہے۔ یہاں مختلف سکولوں کے مشہور [illegible] کی بنائی ہوئی تصاویر بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ نفیس نمونے گذشتہ اور موجودہ [illegible]

گوشہ میں ہیں۔ مینو لڈ کا ٹنج وغیرہ کی خوبصورت اشیا مادی قیمت
جواہرات بہم پہنچائے گئے ہیں۔ جنکو دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے اور
خیال ہوتا ہے کہ روس کے بادشاہوں میں شاید کوئی الہ دین تھا جس نے
اپنے عجیب غریب چراغ سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے +

سید محمد فاروق (شاہ پوری)

آصف اللغات سلسلہ شمس العلما نواب عزیز جنگ بہادر نے ایک کتاب لغت میں لکھنی شروع کی تھی جس کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے اور اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ کتاب اپنی طرز میں بے مثل ہی ہے۔ اور بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھی گئی ہے۔ خدا کرے کہ یہ مکمل ہو جائے تو فارسی اُردو دونوں زبانوں کے شائقین کے لئے بہت مفید ہوگی۔ پہلی جلد میں جس کے چھ سو صفحے ہیں۔ صرف الف ممدودہ ختم ہوا ہے۔ ۲۰ جلدوں میں ختم ہوگی۔ اور ہر جلد کے اسی قدر صفحے ہونگے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نواب عزیز جنگ بہادر نے کیسا عظیم الشان علمی کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس لغت میں۔ بان فارسی کے الفاظ مفرد و مرکب بترتیب حروف تہجی درج ہیں۔ ان کے آگے پہلے اُن کے معنے فارسی میں دئے ہیں اور معانی کے واضح کرنے کے لئے اساتذۂ ایران کے کلام سے سند کے طور پر عموماً اشعار اور مصرعے لکھے ہیں۔ اسکے بعد ہر لفظ یا محاورہ کے مرادف اردو لفظ کی توضیح کے لئے کوئی نہ کوئی سند درج ہے۔ کتاب کی خوبیوں اور لاگت کے لحاظ سے قیمت ارزاں ہے۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ اس ضخامت کی کتاب مجلد صورت میں اس قیمت پر کیونکر دیگئی ہے۔ مگر صاحب مؤلف کی ایک تحریر سے یہ تعجب رفع ہوگیا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "اگرچہ ہم کو اس ایک جلد کا اصلی خرچ مع جلد بندی فی جلد عہ ہوا ہے۔ لیکن ہم نے پبلک کے لئے اس کی قیمت عہ اور خرچ پیکٹ (یعنی ڈاک) ۸ قرار دیا ہے اور اسمیں اس لئے ہم کو نقصان نہیں کہ ہمارے نائب قیصر ہند نواب وائسرائے بہادر نے اس پہلی جلد کے ملاحظہ کے بعد باجلاس کونسل یہ حکم فرمایا ہے۔ کہ ہم کو اس ایک جلد کے صلہ میں پانسو روپیہ کلدار اعزازی انعام عطا ہو بلکہ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ہر ایک جلد کے لئے اسی قدر اعزازی انعام عطا کیا جائیگا۔" ہم نواب عزیز جنگ بہادر کو اس غیر معمولی عزت افزائی پر مبارکباد دیتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ اس لغت کے مکمل کرنے کا کام اُن کے ہاتھوں انجام پائے۔ آمین +

قیمت جلد اول عہ حالی۔ علاوہ محصولڈاک۔
ملنے کا پتہ:۔ نواب عزیز جنگ بہادر۔ سلطان پورہ۔ عزیز باغ۔ حیدرآباد۔ دکن +

رانی رُوپ سنگھار

مارچ [illegible]ء کی بارھویں تاریخ بدھ کے دن میں ایک ضرورت سے سفر کر رہا تھا مگر مجھے جہاں جانا مدِّنظر تھا وُہ مقام ریلوے کے فیض سے بالکل محروم رہا تھا اور نہ وہاں تک کوئی پکی سڑک تھی جس پر بگھی یا گھوڑا گاڑی جاتی آتی اور مسافر کو منزلِ مقصود پر جلد اور آرام سے پہنچا دیتی اس لئے میری سواری میں رتھ تھی اور میں اس کے اندر بیٹھا ہوا یہ غور کرتا چلا جاتا تھا کہ افسوس ہے ہندوستانی حرفت۔ دو ہزار برس ہونے آئے جب کہ مہابھارت کے عہد میں اسی صورت پر رتھ بنائی گئی تھی۔ اُس وقت سے آج تک برابر اُسی ہیئت پر چلی آتی ہے۔ نہ پیّون میں کسی کاریگر نے کوئی پُرزہ بڑھایا نہ دُھرے کی شکل میں کوئی جدّت کی نہ جوئے کو بدلا نہ ڈنڈوں میں کوئی ایجاد کیا نہ بُرجیوں کو گھٹایا بڑھایا۔ اسی دُھرے پہئے جوئے کے فیشن کو صنّاعانِ یورپ نے وُہ وُہ زیبا اور خوش ادا صورتیں دیں جنکو دیکھکر اگر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں تو دل فرحت پاتا ہے۔ ہر سال گاڑی میں ایسا ایجاد کیا جاتا ہے جسکو دیکھ کر عقل حیران اور جان قربان ہوتی ہے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں میری نظر اس انسانی صنعت کے نقائص سے ہٹ کر خلّاقِ عالم کے کارخانۂ قدرت پر جا پڑی۔ سامنے ایک میدان تھا اور اُس میدان میں جہاں تک نظر جاتی تھی ڈھاک کے درخت [illegible] [illegible] تھے۔ چونکہ آفتاب نقطۂ اعتدالِ ربیعی سے قریب ہوتا جاتا تھا۔ [illegible] خزاں کے لشکر نے عالمِ نباتات سے اپنی سواری اٹھالی تھی

[illegible] بھی بہت سے اپنی طراوت اور رحمت کے [illegible]
[illegible] پر طب برسا دیا تھا۔ اگرچہ جنگل میں بہت سے اور درخت سرسبز
اور شاداب غنچہ او شگوفوں سے سراپا گلدستہ بنے ہوئے تھے۔ مگر
اُس ڈھاک کے درختوں پر طرفہ عالم تھا۔ پستہ قدان پیڑوں میں نام کو پتا
نہ تھا۔ پھول سر سے پاؤں تک لدے ہوئے تھے اور پھولوں کے بوجھ سے
ہر شاخ اس طرح لچک کر جھک گئی تھی۔ جس طرح ایک نازک دا محبوب کے
کان سونے کی جڑاؤ بالی پتوں کے بار کو فرطِ نزاکت سے نہیں اُٹھا سکتے
ہیں۔ اور جھک جھک کر آخر گلِ رخسار تک آجاتے ہیں۔ ان ٹیسو کے پھولوں
کا [illegible] سیاہ غلاف دیکھکر (جس کے اندر اس کی رنگین پتیاں نشو و نما
پاتی ہیں اور جب تک بادِ نسیم کے جھونکے اُنکو نہیں چھیڑتے ایک پردہ نشین
باحیا کی طرح اس مخملی پردہ میں اپنے تئیں چھپائے رکھتی ہیں) ایک ترکی
گل اندام کی سیاہ بھویں یاد آگئیں۔ جس کی ہر جنبش تیغ اصفہانی کی طرح
دل پر چر کر دیتی تھی ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ اللہ اللہ یہ وہی ذلیل ڈھاک
ہے جس کی لکڑی خاص و عام چولہا و تنور اور بھٹیوں میں رات دن جلاتے
ہیں اور اس کی مدد سے قسم قسم کے لذیذ کھانے اور نفیس مٹھائیاں پکاتے
ہیں۔ ہماری دہلی میں اس کے کوئلے دو پیسہ سیر بکتے ہیں۔ اور انگیٹھی
آتشدانوں کو گرم کرتے ہیں مگر ایک حکیم تجربہ کار کے نزدیک یہ درخت
بہت پرفیض ہے اس کا گوند چنیا گوند کہلاتا ہے جو اکثر امراض کے
لئے مفید ہے۔ اہلِ صنعت اس گوند سے نیل کے ذروں کو منجمد کرتے ہیں اور
لاکھوں روپیہ کو فروخت ہو کر اُمرا اور تجار کے بکسوں کو [illegible]
سا ور ن سے بھر دیتا ہے۔ اس کے پھول اپنی خوش رنگی میں [illegible]

ہوتے ہیں۔ اسی وقت میں عرصے پہلے وہ سرخ کاغذ جو تعزیوں اور شبک پاس اور مستی سرمہ کی پڑیوں اور مختلف ضرورتوں میں استعمال ہوتا تھا۔ انہیں پھولوں کے رنگ میں رنگا جاتا تھا۔ حسینوں کے زرد و بسنتی نارنجی زعفرانی اور کافوری کپڑے ابتک انہیں پھولوں میں رنگے جاتے ہیں۔ اور ذی تجربہ حکما، ان پھولوں کے افعال و خواص عجیب و غریب بتاتے ہیں طبیعت میں قبض پیدا کرتے ہیں۔ بلغم کو دفع کرتے ہیں۔ پاشویہ میں اگر شریک کئے جائیں تو دماغ کی طرف ابخرے نہیں جاتے۔ ان کا بھپارہ درد گردہ وغیرہ میں از بس مفید ہے۔ ان کے قطرہ سے آنکھ کا جالا کٹ جاتا ہے۔ میری نظر ابھی ان پھولوں کے نظارہ سے پورا لطف نہ اُٹھا چکی تھی کہ مجھ کو اس درخت اور پھول کی ایک پہیلی یاد آگئی۔ جس میں ہندی شاعر نے برج بھاشا میں اس کی تشبیہات کو نظم کیا ہے اور اس کی معانی اور دقائق پر غور کرنے سے مجھے بہت لطف حاصل ہوا۔ پات پات کر آپ اڑاوے کالا منہ کر جگ دکھلاوے جب لالن کی لالی پاوے۔ یعنی شاعر کہتا ہے "ڈھاک کا پیڑ بڑا با ہمت اور سخی ہوتا ہے۔ مخلوق کے آرام اور آسایش کے واسطے ایک ایک پتا اپنے بدن سے جدا کر کے پھینک دیتا ہے کہ اس کے دونے بناؤ۔ اُن میں پھول اور شیرینی سجا کر لے جاؤ اور اُن سے اپنے کام چلاؤ اور اے مفلس فرزند اور غریب آدمیو! انکے ذریعہ سے اپنی اپنی غذائیں پکاؤ اور کھاؤ۔ پس جب وہ درخت اپنا دھانی لباس غیروں کے آرام کے لئے اپنے گلے سے اُتار کر دیدیتا ہے اور خود عریاں رہجاتا ہے تو عجب حالت بے خودی کی شان میں نظر آتا ہے اور سی برہنگی کے عالم

[illegible] کی شاخوں میں سیاہ رنگ کے نیچے پیدا ہو جاتے ہیں اور جو بیچ کا [illegible]
میں نکلنے کے لیے نہایت بدنما معلوم ہوتے ہیں مگر وہ بیچارا اس روسیاہی کو بھی
برداشت کرتا ہے۔ بالآخر اسی ایثار کی بدولت تو لعلِ آبدار کی طرح سرخروئی
حاصل کرتا ہے اور لوگ اسکو قدر اور شوق کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور
اُسکے پھولوں کو سر چڑھا کر بازاروں کو لیجاتے ہیں اور وہ پھول ہاتھوں ہاتھ قیمت
کے ساتھ بکجاتے ہیں اسی طرح اے ناوان انسان جب تک تو داد و دہش اُس حد
تک نہ کرے گا کہ لوگوں کو اپنے تن بدن کے کپڑے تک اُتار کر نہ دیدے
اور جب تک بندگانِ خدا کی عقدہ کُشائی میں اس قدر سعی نہ کرے گا کہ
اُس کے باعث سے لوگ تجھے روسیاہ اور راندہ درگاہ نہ کہیں سخاوت
اور اہلِ ہمت کے دفتر میں تیرا نام نہ لکھا جائیگا اور تو خاص و عام کے سامنے
سرخرو نہ ہوگا تقریباً ایک گھنٹہ تک میری آنکھیں اس قدرتی گلزار کی
سیر میں بیٹھے بیٹھے سیر کرتی رہیں۔ کیونکہ ان درختوں کا سلسلہ کوسوں تک
ختم نہ ہوتا تھا اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی۔ ہزاروں ماہرو بسنتی پوشاک
پہنے ہوئے جنگل کی سیر میں مشغول معلوم ہوتے تھے یا اُفق آسمان پر سُرخی
چھائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس عرصہ میں آفتاب سر پر اور سایہ پاؤں پر
آپڑا۔ گرمی بڑھی۔ پرندوں نے سایہ دار درختوں اور باغوں میں چھپ چھپ
کر پناہ لی۔ میں نے بھی چاہا کہ اگر کوئی درختوں کا جھنڈ ملجائے تو دوپہر
اُس میں بیٹھکر کاٹ دوں۔ مگر جس قدر ایسی آرام کی جگہ کے لئے نظر دوڑائی
اُتنی ہی ناکامی ہوئی۔ کیونکہ اس چمنِ قدرت کو طے کرنے کے بعد ایک
لق و دق میدان نظر آیا۔ جو دُور تک چلا گیا تھا اور اس میں سایہ دار درخت
کے نام کا سوائے مغیلان کے کوئی پیڑ نہ تھا اگرچہ اب دھوپ کے [illegible]

[illegible] جو جھلساتے تھے اور گرمی کے مارے [illegible]
[illegible] آرہا تھا۔ پیاس جدا لگ رہی تھی مگر اس وقت میدان میں پہنچ
چکے تھے اور چارہ کار نہ تھا۔ کیونکہ وحشت خیز اور ہولناک صحرا میں اُس
وقت ٹھہرنا گویا دوزخ میں مکان بنانا تھا۔ اسی مایوسی میں چلتے چلتے دُور
سے ایک پکی عمارت نظر آئی جو مسلمانوں کے مقبرہ کے مثل گنبددار
بنی ہوئی تھی اور مَیں نے رتھ بان سے کہا بھئی ذرا اپنے بَیلوں کو جلدی
جلدی ہنکاؤ تاکہ ہم تم اس مقبرہ تک جا پہنچیں اور سورج کی تیزی اور ہوا کے
گرم جھونکوں سے مقبرہ کے اندر بیٹھ کر اپنی اپنی جان بچا لیں۔ چنانچہ
تیس منٹ کے اندر اندر ہم وہاں جا پہنچے تو معلوم ہوا کہ قدیم زمانہ کا
مقبرہ نما ایک چھوٹی سی عمارت ہے جس کی گہ دو ڈھائی گز سے زیادہ
نہ ہوگی۔ اندر باہر سے پلاستر اور پلاستر پر سفیدی پھری ہوئی ہے۔ گنبد
نہایت خوشنما اور اندر سے خالی ہے۔ گنبد کی چھت میں ایک مضبوط
اور خوبصورت آہنی قلابہ نصب ہے اور قلابہ کے چاروں طرف لاجورد
سے ایک بہت خوبصورت بڑا سا پھول بنا ہوا ہے۔ مجھ کو یہ گمان تھا کہ
اس مقبرہ کے اندر کوئی مزار بنا ہوا ہوگا۔ مگر اندر گھس کر دیکھا تو معلوم ہوا
کہ مزار کیسا مزار کا نشان بھی نہیں ہے۔ اگر یہ خیال کیا جاتا کہ چونکہ مقبرہ
بہت پرانا ہے اس لئے قبر ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوگئی ہوگی۔ تو یہ بالکل
غلطی تھی۔ کیونکہ مقبرہ کی تہ زمین کہیں سے نام کو اُکھڑی ہوئی نہ تھی۔
بہت صاف چکنا فرش تھا۔ مہرہ کی ہوئی قلعی اس پر چمک رہی تھی اور جیسا
[illegible] پھول چھت میں بنا ہوا تھا ویسا ہی پھول فرش پر بنا ہوا تھا
[illegible] تھا کہ گویا اوپر کے پھول کا جواب ہوں۔ اس لئے یقین کرنا

[illegible] میں بہت عمدہ کندہ بنی ہوئی اُس وقت نیچے کا فرش بھی
اندر [illegible] اس ایسی قرار بنایا ہی نہیں گیا اور یہ عمارت کسی اَور غرض
سے بنائی گئی ہے۔ الغرض میں نے بہت بیتابی کے ساتھ اس مقبرے کے
اندر اپنا فرشِ [illegible] بچھایا اور تکیہ جو میرے ساتھ تھا سرہانے رکھ کر آرام کیا
اور رتھ بان سے کہدیا کہ یہ مکان بہت تنگ ہے میرے پاؤں بھی مشکل
سے پھیلینگے۔ اس لئے میں تم کو اپنے پاس اندر بٹھانے سے
مجبور ہوں۔ دیکھو وُہ پچاس قدم کے فاصلہ پر جو سامنے کیکر کا درخت
ہے اس کے نیچے جا بیٹھو۔ اور ان بے زبان بیلوں کو بھی اپنے پاس
چھاؤں میں کھڑا کرلو۔ دوپہر ڈھلے یہاں سے چلینگے۔ رتھ بان کیکر
کے درخت کے نیچے جا بیٹھا اور مَیں مقبرہ میں لیٹ رہا اور اب مَیں نے
اُس کے اندرونی حصّہ کو بنظرِ غور دیکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے
آنے کے واسطے بہت پست ایک محراب دار دروازہ ہے جس کے اندر
آدمی بہت ہی جُھک کر داخل ہو سکتا ہے۔ مشرقی اور مغربی دیوار میں
چھوٹے چھوٹے تین تین روشندان بنائے گئے ہیں۔ جن میں سے خفیف
خفیف روشنی اور ہوا آ رہی ہے اگرچہ یہ مقبرہ تین گز سے زیادہ بلند نہ ہوگا
مگر اس پر بھی اس میں خنکی تھی جس نے میری جلتی جھلستی رُوح کو بہت
آسائش پہنچائی۔ چونکہ اب ٹھنڈک اور راحت سے میرے ہوش و حواس
درست ہو گئے تھے۔ اس لئے میں سوچنے لگا کہ یہ عمارت کس نے بنائی
ہے اور کس غرض سے بنائی ہے کب بنائی ہے۔ اگرچہ در و دیوار کی [illegible]
اور کہنگی سے عمارت زبانِ حال سے یہ بتا رہی تھی کہ میں نے بہت زمانہ دیکھا ہے اور
میرے بانی نے مجھے بڑی ضرورت کے ساتھ بنایا ہے مگر [illegible]

شخص بھی جو یہاں مجھ کو پا ہو کر اسکا راز اور اسکی حقیقت مجھے بتا دیتی اور میرے
دل کی خلش مٹا دیتی۔ جب میں نے اپنے اس سوال کا جواب کسی سے نہ پایا
تو میرے دل کی آتشِ شوق نے میری رُوح کو گرم اور بے چین کر دیا تو
یہ سوچنے لگا کہ کیا اچھی بات ہو جو اس جنگل میں کوئی ایسا شخص آنکلے جو
اس زمین کے جغرافیہ سے ماہر ہو اور میں اس سے دل کھول کر اس عمارت
کے بھید کو دریافت کروں مگر میرا یہ خیال ایسا خیال تھا کہ جس کو سوائے وحشت
کے کیا کہا جا سکتا تھا۔ میں اسی دھن میں بستر پر پڑا ہوا تھا اور میری قوت متفکرہ
اور واہمہ دماغ کے سمندر میں غواصی کر رہی تھی۔ ناگاہ مجھ پر ایک کابوسی کیفیت
طاری ہوئی اور پٹھے پٹھے دماغ سے تشنج شروع ہو کر برقی قوۃ کی طرح اعصاب میں
پھیل گیا اور میرے دست و پا کو بیکار کر دیا۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں نے
اپنے زعم میں بہت زور کیا کہ کابوس کے بوجھ سے اپنے سراپا کو چھڑا لوں مگر
چونکہ اس نے مجھے بخوبی مغلوب کر لیا تھا اس لئے مجھ کو اس میں بالکل ناکامی
ہوئی اور میں مُردہ کی مانند غاشیہ بے حس پڑا رہ گیا مگر سماعت اور بصارت
میری بدستور تھی۔ مقبرہ کے تابدانوں میں سے جو زناٹے کے ساتھ ہوا آرہی تھی
اُس کی آواز میرے کانوں میں برابر چلی آتی تھی اور سقفِ گنبد میں جو
لاجوردی پھول اور پھول کے اندر آہنی قُلّاب نصب تھا۔ اُسے میں بخوبی
دیکھ رہا تھا چونکہ میں چت پڑا ہوا تھا۔ اس لئے میری نظر گویا چھت میں تیر
بنکر تازہ ہو گئی تھی۔ اس کابوسی حالت کو بیس منٹ گزرے ہونگے۔ جو میں نے
دیکھا کہ سقفِ گنبد میں ایک چھوٹا سا رخنہ پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ وہ رخنہ بڑھنے لگا
اور اس رخنہ کے اندر ایک سیاہی نمودار ہوئی جو آنکھوں کو بہت ہی بھلی معلوم ہوتی
تھی۔ آہستہ آہستہ وہ رخنہ اتنا بڑا ہو گیا کہ ایک غُرفہ بن گیا اور غرفہ کے اندر ایک نازنین پری جمال

چمکی ہوئی لالی تھی جس کے عارضِ تاباں کے سامنے ماہِ دو ہفتہ بھی ماند تھا۔ اس کے
سیاہ بال جو سیاہی میں سنبل کو اور خوشبو میں مشک کو پرے ہٹاتے تھے دونوں
طرف کو کیسے بل کھائے پڑے ہوئے تھے۔ جنکو دیکھ کر مجھے یہ شعر یاد آگئے ؎

کاکل ہیں خم بخم شکن ایک اس طرف ایک اُس طرف — ابرو ہیں چشم سحر فن ایک اس طرف ایک اُس طرف

زلف نگہ پہ سرگوشیاں سر رہ لامکی — غمزہ ہے گرم سخن ایک اس طرف ایک اُس طرف

آنکھیں اگر نرگسِ شہلا اور غزالانِ ختن کی آنکھوں کو شرمندہ کرتی تھیں تو بھویں بھی
کمان ابروی اور ہلالِ عید کو مات دیتی تھیں۔ دانت جیسے سچے موتی۔ آنکھوں میں
گہرا گہرا کاجل۔ مانگ میں سیندور بھرا ہوا گویا کالی گھٹا میں شفق اپنا جوبن دکھا رہی
ہو۔ کانوں میں ہیرے کے کرن پھول اور زمرد کے جھمکے۔ ناک کے اندر چھوٹی سی
سونے کی نتھ جس میں چڑیا کے انڈے کے برابر دو موتی اور یاقوت کی چُنی۔
گلے میں ہیرے کی بڑی ساری دُھگدگی اس طرح چمک رہی تھی جس طرح آسمان پر
آفتاب چمکتا ہے۔ دانتوں میں مسی اور ہونٹوں پر لاکھا جما ہوا تھا۔ سر سے پاؤں
تک گلابی رنگ کی ریشم کی ساڑھی سے بدن ڈھانکے ہوئے مگر دونوں ہاتھ
اور چہرہ بالکل کھلا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں نہایت باریک جواہر نگار چوڑیاں
بھی تھیں۔ اس نازنین کے دیکھنے سے مجھ پر ایک حیرت طاری ہوئی اور اُسکے
شوقِ دیدار میں ایسا مدہوش ہوا کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں کون ہوں کہاں سے آیا ہوں
کہاں جا رہا ہوں۔ یہ کیا مقام ہے اور کیا عالم ہے جس کی میں سیر کر رہا ہوں۔ اُس
حسین کی دیوی کو دیکھ کر اگرچہ میں متعجب ضرور تھا مگر دماغ کی قوتِ متخیلہ ابتک
قائم تھی اور گو بولا نہ جاتا تھا مگر جی یہی چاہ رہا تھا کہ اس ماہوش نازنین سے کسی طرح کا
پتہ نشان دریافت کروں۔ میرے دل میں یہ خطرہ گزر ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا وہ نازنین
اپنے یاقوتی ہونٹوں کے ساتھ مسکرائی اور اُس تبسم میں اسکے دانتوں سے ایک ایسی برق چمکی جس نے بالکل
خیرہ کر دیا ——— (باقی آئندہ)

پیداوار دولت

تعریف ۔ لفظ دولت یا دولتمند کس نے نہیں سنا اور کون اس کے معنے نہیں جانتا ۔ مگر لفظ دولت بہت غور طلب ہے ۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ اس پر غور کریں

یورپ کے دانشمند سالہا سال سے اس مضمون کے مطالعہ میں مصروف ہیں اور بہت سی کتابیں نہ صرف تاجروں بلکہ عام لوگوں کے فائدہ کی غرض سے اس پر لکھی جا چکی ہیں ۔ یہاں تک کہ آج کل تو اس نے ایسا فروغ پایا ہے کہ جو بادشاہ قوانین دولت کے علم سے واقفیت نہ رکھتا ہو حکومت کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا ۔

یہ تو ہم بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ سب لوگ یکساں دولتمند نہیں ۔ ایک دولتمند دوسرے دولتمند کے مقابلہ میں محض مفلس نظر آئیگا ۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ان چیزوں کا کھوج نکالیں جنکو لفظ دولت سے تعبیر کر سکیں ۔ یا دولت کا کوئی ایسا عام مفہوم پیدا کریں کہ ان اشیا پر جنکو ہم دولت سمجھتے ہیں حاوی ہو پس ہم کہتے ہیں کہ جس چیز کا دوسری چیز سے تبادلہ ہو سکے وہ دولت ہے ۔ وہ قاعدے جن کے رو سے ۔ ملکیت میں ۔ استعمال محنت ۔ روپیہ یعنی سونے چاندی کا تبادلہ اور ان کی قیمت میں اختلاف ۔ محصول سرکاری کے محصول اور وہ تاثیرات جن سے آبادی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے ۔ عمل میں آتے ہیں قوانین دولت کہلاتے ہیں ۔ اور انسانی دولت میں یہی سب کی سب چیزیں ہی شامل نہیں ۔ بلکہ اس ضمن میں اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جن ہیں کہ

جو ایک کا ایس میں ایک دوسرے سے تعلق اور ایک دوسرے پر انحصار رہتا ہے
شمار ہوتی ہیں۔

یہ بات جو ابھی بیان ہوئی ہے کہ محض وہی شے جس کا تبادلہ دوسری شے
سے ہو سکے۔ دولت ہے آغاز ہی سے صاف طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ جس
چیز میں یہ شرط پوری نہ ہوگی وہ دولت نہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص کے
پاس بہت گیہوں ہے اور گیہوں کے سوا اور چیز اس کے پاس نہیں اور اسے
خریدنا نہیں چاہتا یہ شخص دولتمند نہیں ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان صرف
گندم ہی پر بسر اوقات کر سکے۔ اس کے علاوہ پہننے کو کپڑے۔ پکانے
کو برتن رہنے کے لیے مکان کھیت بونے کے لئے بیل اور دوسری چیزیں
درکار ہونگی۔ جس کے لئے ضرور ہے کہ وہ کچھ گرہ سے ادا کرے اب سوائے
گیہوں کے تو اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں اور اس کا کوئی خواہاں نہ ہوا
تو پھر وہ دولتمند کیا ہوا؟ اب ایک شخص کا گھر سونے سے بھرا ہوا ہے
مگر وہ ایسے ملک میں رہتا ہے جہاں سونے کے عوض کوئی چیز خریدی
نہیں جا سکتی۔ جیسا کہ بعض وحشی ملکوں کا حال تھا اور اب بھی ہے یہ بیچارہ
بھی دولتمند نہیں کہلا سکتا اور نہ وہ شخص امیر کہلا سکتا ہے۔ جس کے پاس
سخت قحط سالی میں ایک ہزار بیل موجود ہیں۔ کیونکہ ایسے وقت میں مویشی
کی خریداری پر کوئی راضی نہ ہوگا۔

زمین۔ محنت۔ سرمایہ:۔

پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ دولت کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ دولت کے لئے
بالواسطہ یا بلاواسطہ تین چیزیں ضروری ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔ محنت زمین
اور سرمایہ۔ پہلی دو کو تو ہم جانتے ہیں۔ مگر تیسری توضیح طلب ہے۔ فرض کرو

کہ ایک کھیت کی نگہبانی کرنی ہے اور (محنت) کا مندرجہ بالا پہلو نہ گے کئے تیار ہیں۔ مگر یہ کام اس وقت تک شروع نہیں ہو سکتا جب تک کام دینے والا کو مزدوری دینے کے لئے کچھ موجود نہ ہو۔ یا ان کے کھانے کا کچھ بندوبست نہ کیا جائے۔ ضرور ہے کہ کسی شخص نے کچھ نہ کچھ بچا کر یا پس انداز کر کے اس مطلب کے لئے رکھا ہو جو یہاں صرف ہو۔ اُس بچت کو سرمایہ کہتے ہیں:۔

آلات۔ مویشی۔ عمارات اور ہنرمندی بھی ایک دوسری قسم کا سرمایہ ہیں۔ جن کو ضرور ہے کسی نہ کسی نے حاصل کیا ہو یا بچایا یعنی بچت کے ذریعہ حاصل کیا ہو۔ کیونکہ اُن کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ یوں ہل اور مویشی زمیندار کا سرمایہ ٹھہرے اور علیٰ ہذا بڑھئی کا سرمایہ آلات اور ہنرمندی بھی جو اس نے اپنے کام میں حاصل کی ہے اور نیز وہ روپیہ یا خوراک بھی جس پر مزدوری ملنے کے وقت اُسے گذارہ کرنا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرمایہ سے وہ دولت مراد ہے جس کو ہم مزید دولت پیدا کرنے کی غرض سے بچا رکھتے یا علیحدہ کر چھوڑتے ہیں۔

اب ہم تینوں چیزوں۔ زمین۔ محنت اور سرمایہ پر ایک ایک کر کے جُدا جُدا غور کرتے ہیں اور اُن کے مختلف مقامات استعمال کو زیادہ وضاحت سے ذہن میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلے زمین کو لیجئے۔ دولت کی پیداوار میں سب سے ضروری چیز ہے۔ انسان کے کام کی کوئی ایسی چیز نہیں جس کی اصلیت کا سُراغ زمین تک نہ پہنچے۔ کھانے کی خوراک۔ پہننے کا کپڑا۔ جلانے کی لکڑی۔ گھر روشن کرنے کا تیل۔ نیز تعمیرات کے مسالے سب زمین ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا ممکن ہے کہ زمین ہی پیداوار دولت کا ایک واحد ذریعہ ہے۔

یکن فائدے سے محروم ہو جائیگا کہ زمین سے حصول دولت کے لئے اس کے
تو محنت اور سرمایہ بھی لابدی ہیں۔ جب تک زمین میں ہل چلا کر اسے بویا نہ جائیگا
مکتب یا تخم ریزی نہ ہوگی فصل پیدا نہ ہوگی اور اس کے لئے محنت اور نیز سرمایہ درکار ہوگا
دنیز مہیا ہوں۔ مویشی اور مزدوری کی صورت میں محنت کو کام میں لگانے سے
پیشتر سرمایہ موجود رکھنا پڑیگا۔ اب ہم کو اپنے ذہن میں اس بات کا تصور پیدا
کرنا ہے کہ محنت سے کیا مراد ہے۔ اس کی نسبت یوں بیان کیا گیا ہے کہ چیزوں
کو دوسری چیزوں سے دور ہٹانے یا انکے نزدیک لیجانے اور انکو اپنے
مناسب ٹھکانے لگانے کا نام محنت ہے۔

یہاں صرف اسی محنت پر حاوی ہو سکتا ہے جو باضابطہ اور کارآمد اور بارور
ہو علاوہ بیکار محنت کی نسبت تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ چیزوں کو بے ٹھکانے
لگانا ہے۔ مثلاً جو محنت کنوئیں کھودنے نہریں نکالنے راہیں بنانے اور زمین
میں ہل چلانے میں یا کسی اور ایسے کام میں صرف کیجائے جس سے عوام الناس
کی بہتری ہو۔ مفید اور بارآور دولت ہوگی۔ اصطلاح میں ہم اسے محنت باردار
کے لقب سے تعبیر کرینگے اور اس کے برخلاف دوسری قسم کی محنت جس سے
حصول دولت نہ ہو محنت بے ثمر کہلائیگی عیش و عشرت میں روپیہ لٹانا قیمتی
لباس بغرض تزئین بنوانا اور بڑے بڑے محلات بغرض نمائش و آرائش تعمیر
کرنا یہ سب محنت بے بار میں شمار ہوگا۔

اس کے علاوہ محنت کی ایک اور قسم بھی ہے اور اسکو باردار بالواسطہ کہتے
ہیں۔ مراد اس سے یہ ہوتی ہے کہ براہ راست اور بلا واسطہ تو دولت اس سے
پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ انجام کار ایسے نتیجے مترتب ہوتے ہیں کہ ان سے دولت
میں ترقی ہو جاتی ہے۔ مثلاً دماغی محنت جس سے محروم [illegible]

فیس اور سرکار اور عمر انہیں ملک کے ساتھ پڑتا ہے ۔ یہی قسم کی محنت تیسرا ... کا کام
کا ... ایسی چیزیں پیدا نہیں ہوتیں جیسے ہم ... یا اُس کی خرید و فروخت ... لیکن
تاہم اُس کے بغیر دُنیا کا انتظام نہیں چل سکتا اور اسی سبب سے وُہ مفید اور ضروری
خیال کیجاتی ہے :-

تقسیم محنت :-

یہ امر ظاہر ہے کہ ایک ہی شخص اپنی سب ضرورت کی چیزیں نہیں بن سکتا اور نہ
سب دُنیا بھر کے کام سرانجام دے سکتا ہے ۔ اس لئے مختلف لوگ جدا جُدا
پیشے اختیار کرتے ہیں ۔ اب ایک ہی شخص سے ایک ہی پیشہ کے سب کام
انجام پانے نہ صرف محال بلکہ ناممکن ہیں ۔ اس وجہ سے اس پیشہ کے مختلف عملوں کو
جُدا جُدا انجام کرنے کے لئے جُدا جُدا آدمی لگائے جاتے ہیں ۔ اس میں فائدہ
ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے حصہ کار میں مہارتِ تامہ حاصل کر لیتا ہے ۔ اور
مشق اور چابکدستی کی بدولت اس کو بوجہ احسن اور نسبتاً تھوڑے وقت میں اختتام
کو پہنچاتا ہے اس کام کو مختلف شخصوں میں بانٹنے کے عمل کو تقسیمِ محنت کہتے
ہیں ۔ اور یورپ میں اس پر بہت زور دیا جاتا ہے ۔ کیونکہ کام کو جہانتک
ممکن ہوسکے نہایت چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا ہمیشہ فائدہ بخش ہوتا
ہے ۔ مثلاً سوئی بنانے کو دیکھئے ۔ اس میں قریباً آٹھ یا دس آدمی لگتے ہیں ۔
ایک سوئی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کے رکھتا جاتا ہے ۔ اور کچھ نہیں
کرتا ۔ اسی طرح دُوسرا ان میں صرف سوراخ کرتا ہے ۔ تیسرا سوراخوں کو بناتا ہے ۔
چوتھا شخص سوئیاں تیز کرتا جاتا ہے ۔ اور علیٰ ہذا اسی طرح سب عمل سرانجام پاتے
ہیں ۔ یہانتک کہ ان کو چھوٹی چھوٹی ڈبیوں میں بند کرنے پر بھی ایک خاص آدمی مقرر
ہوتا ہے ۔ ہر شخص ایک مقررہ عمل انجام دیتا ہے اور آخر کار ... کام ...

یہاں تک مشق ہو جاتی ہے کہ وہ اس شخص سے جو سوئی سازی کے سب کام اپنے ہاتھ سے کرنا چاہتا ہے۔ ہنرمندی و دستکاری میں بہت ترقی کر جاتا ہے۔ کام جلد ہو جاتا ہے اور اس لئے اندازاں بڑھتا ہے یہی وجہ ہے کہ حالانکہ روئی ہندستان سے ولایت جاتی ہے۔ تاہم جو کپڑا وہاں کل کی مدد سے تیار کیا جاتا ہے ہندوستانی جلاہے کے ہاتھ کے کپڑے سے سستا پڑتا ہے۔ وہاں سب کام تقسیم محنت سے ہوتا ہے اور یہاں بسا اوقات ایک ہی شخص کو روئی صاف کرنے کاتنے اور کپڑا بننے کے سب عمل اپنے آپ پورے کرنے پڑتے ہیں۔ تعمیر دیوار تقسیم محنت کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ایک شخص اینٹیں بناتا ہے دوسرا چونا ملاتا ہے ایک پانی لاتا ہے ایک دیوار پر اینٹیں پہنچاتا ہے اور جو ناسُرخی بہم کرتا ہے۔ یہاں تک کہ معمار اینٹ کو مناسب جگہ پر لگا دیتا ہے۔ اب اگر معمار کو یہ سب کام تنہا سرانجام دینے پڑتے تو اس کو کس قدر دقت پڑتی اور اگر بُری بھلی دیوار اس سے بن بھی جاتی تو بھی ایک مدتِ مدید میں۔ پھر لاگت بھی زیادہ پڑتی اور بدصورت بھی ہوتی۔

اب ہم محنت پر ایک اور حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک پولر یا پل پر ایک بڑا پتھر یا شہتیر اٹھا کر رکھنا ہے یہ کام ایک آدمی کے بس کا نہیں اگر وہ سارا دن کیا ساری عمر بھی اس کام پر زور لگاتا رہے تو بھی اس کی محنت اکارت جائیگی۔ اس لئے ضرور ہوا کہ کوئی اس کا ہاتھ بٹائے چنانچہ دس یا بیس آدمی مل کر ہمت کریںگے تو چشم زدن میں پتھر اور شہتیر اپنی جگہ پر جا بیٹھینگے۔

اس صفتِ محنت کا نام اتحادِ محنت قرار دیا گیا ہے۔ ریل کی سڑک پر تین یا چار آدمی ایک گاڑی کو بآسانی دھکیلے جاتے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ کام

آدمی سے ہو بشرطیکہ وہ کسی آلہ جبر تعقل سے کام نہ لے۔ ناممکن ہے پیدا وار دولت کا یہ طریق عمل دنیا بھر کے کاموں میں جاری نظر آتا ہے۔ یہاں ان امور کو بھی فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے کہ ذہانت۔ ہنرمندی اور ایمانداری سے محنت کی قیمت میں معتدبہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان اوصاف کی عدم موجودگی میں کام کرنے والا اپنے کام کے مسالے کو ضائع اور برباد کرتا ہے۔ اس پر اگر وہ قدرے بددیانت بھی ہے تو صرف خود ہی بدنام نہیں ہوتا بلکہ اپنے مالک کو بھی لے ڈوبتا ہے ہر احمق اور نادان آدمی ایسی دیوار بنائیگا جو دھوپ میں کھڑی رہے۔ مگر جس دیوار کو دیر تک دھوپ اور بارش میں رکھنا منظور ہو اس کے لئے ہنرمند اور دیانتدار کاریگر درکار ہوگا بے علم کاریگر وقت ضائع اور روپیہ رائگاں کرتا ہے۔ وہ دولت نہیں کماتا بلکہ اس کو برباد کرتا ہے۔ علاوہ بریں اناڑی اور بے دیانت کارندہ کے کام میں مزید احتیاط اور خبرداری ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کی نسبت ہندوستان میں نگرانی پر بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے ولایت کے کاریگر عموماً ہنرمند ہوتے ہیں اور مزید برآں عمدہ کام کرنے میں اپنا فخر سمجھتے ہیں۔

سرمایہ کا فائدہ:۔

۔ بیان ہو چکا ہے کہ ہر قسم کی جائداد جو پس انداز یا علیحدہ کر کے دولت بڑھانے کے لئے استعمال کیجائے سرمایہ کہلاتی ہے۔ اب بذریعہ چند مثالوں کے ہم اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرینگے۔

اچھا فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس ایک قطعہ اراضی کاشت کے لئے موجود ہے۔ اب جب تک بیل ہل چلانے اور بیج بونے کو سرمایہ نہ ہوگا۔ کام شروع نہیں ہو سکتا۔ پھر فصل کے پکنے۔ کٹنے اور بکنے تک خوراک لباس کا ہونا بھی لازمی

ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوں تو مدد چاہئے جس سے ضروریات پوری ہوں۔ پس یہ ضرور ہے کہ ضروری چیزیں یا تو کاشتکار نے خود بچا رکھی ہوں یا کسی دوسرے سے ادھار لے جو ادھار دینے پر راضی ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنے ہیں کہ ادھار دینے والے نے ان چیزوں کو اپنا پیٹ کاٹ کر یا کسی طرح بچایا اور ادھار دینے کے لئے تیار رکھا۔ کہ دولت کے پیدا کرنے میں بطور سرمایہ کام آئیں۔ ادھار دینے والے نے ان چیزوں کو بچانے اور ان کے احتیاط سے رکھنے میں ضرور کچھ نہ کچھ تکلیف اٹھائی ہو گی۔ اس تکلیف اور احتیاط کا معاوضہ ضروری ہے اور اس لئے وہ اپنا سرمایہ بغیر معاوضہ لئے قرض نہ دیگا۔ اب ظاہر ہے کہ کاشتکار صرف اتنی فصل پیداوار کرنے پر قانع نہ ہو جو اس کے اپنے گذارہ کے لئے کافی ہو۔ بلکہ وہ پیداوار اتنی ہونی چاہئے کہ تمام استعمال کے لئے سرمایہ دار کے سرمایہ کا معاوضہ بھی ادا کرے اور خود سرمایہ جو بطور قرض اٹھایا گیا تھا وہ پورا کر دے۔

اگر بیج۔ مزدوری اور خوراک کے لئے کوئی قرض نہ دے تو زمین بے کاشت پڑی رہے۔ اور بیچارہ جس کے پاس سوائے زمین کے کچھ نہ ہو۔ محض بیکار ہی رہے بلکہ دوسروں کی خیرات کا محتاج ہو جائے۔ پس معلوم ہوا کہ اگر گاؤں والے جو کچھ کمائیں سب کا سب کھا جائیں تو اسی حال میں جب تک وہ کسی دوسرے شخص سے جو فرض کرو کہ دوسرے گاؤں یا قریب کے شہر میں ایک ساہوکار ہے اور اس نے اپنی کمائی احتیاط سے بہت کچھ بچائی ہے۔ کچھ قرض دام نہ اٹھائیں۔ ان کی زراعت ترقی پذیر نہیں ہو سکتی۔

سرمایہ کی سودمندی کی ایک اور مثال یہ ہے۔ ایک راجہ مر گیا اور اس کا بیٹا اس کی گدی پر بیٹھا۔ بیٹے کے ترکے کا جائزہ لیا تو معلوم

ہوا کہ دوسری چیزوں میں ایک رقم دس لاکھ روپیہ کی نقد خزانہ میں پڑی ہوئی بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس سے گھوڑے اور ہاتھی خرید نے چاہئیں بعض نے نصیحت کی کہ تمام ملازمین اور متعلقین کے لیے لباس فاخرہ اور زرین تیار ہوں۔ مگر ایک پیر مرد دانا نے یہ سب باتیں سن کر کہا کہ اس طرح سے روپیہ اُڑانا ریاست کے لیے سود مند نہ ہوگا۔ تمہارے باپ کا روپیہ ایک مفید سرمایہ ہے اور بہتر ہے کہ اُسے سرکار کے فائدے اور رعایا کی بہبودی کے لیے کسی کام میں لگا جائے۔ اس سے اگر ایک نہر نکالی جائے تو بہت سی زمین جو بنجر اور بیکار پڑی ہے آباد ہو جائے۔ دس گاؤں اور بس جائیں۔ ان لوگوں کا جو بھوکے ننگے اور جو نئے گاؤں آکر آباد کریں سب پالا جائے۔ اور ابد الآباد کے لیے تمہارا نام ہو جائے۔ پیر مرد کی عملی نصیحت سارا دے کو پسند آئی اور اُس نے قبول کر لی۔ چنانچہ بعد میں ہمیشہ اظہار خوشنودی کرتا رہا کہ میں نے اچھا کیا کہ اس نصیحت کی قدر کی۔ واقعی اگر روپیہ زیورات اور گھوڑوں پر خرچ ہو جاتا تو اس سے کسی کا کچھ فائدہ ہوتا اور نہ ملک کی دولت میں کوئی اضافہ۔

سرمایہ کا استعمال :۔

بس یاد رہے کہ سرمایہ بچت اور کفایت شعاری کا نتیجہ ہے۔ وغیرہ۔ کہ جب تک اسے صرف نہ کیا جائے اور صرف بھی دُور اندیشی سے نہ کیا جائے وہ محض بیکار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اسراف (فضول خرچی) اور خیرات[1] سے کوئی آمدنی

---

[1] خیرات کے بارہ میں یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے علم سیاست مدن کے رو سے لکھا گیا ہے۔ اور مذہبی پہلو سے قطع نظر کی ہے جس کا بحث زیر نظر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو امر حیثیت استدلال علمی مفید نہ ہو وہ کسی دوسری طرح بھی مفید نہ ہو۔

نہیں ہوتی۔ سرمایہ ایسی باتوں میں خرچ کر ڈالا جائیگا تو وہ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائیگا۔ لیکن اگر دانائی سے مزدوروں کے کھلانے میں لگایا جائیگا تو روز بروز ترقی کریگا۔ اور اپنے مالک اور استعمال کرنے والے دونوں کے لئے فائدہ بخش ہوگا۔ غیر منتظم سلطنت میں کسی کے روپیہ بچانے اور دوسرے کو کام میں لانے کے لئے روپیہ دینے کی اُمید فضول ہے۔ کیونکہ جب اس امر کا یقین ہو کہ جس وقت چاہینگے مال چور لیجائینگے یا سرکار کے کارندے اسے بذریعہ جرمانہ اور ناجائز محصول کے لوٹ لینگے تو جمع کرنے کی تکلیف کون گوارا کرے گا۔ ایسی باتیں باقاعدہ اور مستحکم حکومت کے سوا عمل میں نہیں آسکتیں۔ اور کوئی ملک بدون اچھی حکومت کے سرسبز اور شاداب نہیں ہو سکتا۔

صادق علی خاں

جمی کب گردِ تہمت حضرتِ یوسف کے دامن پر
پڑی ہے خاک اڑانے سے کہیں خورشید روشن پر

زمانے میں کوئی غارتگرِ ایماں نہیں ملتا
متاعِ دل لئے بیٹھے ہیں ہم خود راہزن پر

ذرا سا بادۂ انگور پیکر دیکھ تو زاہد
ارے کمبخت تیرا بارِ عصیاں میری گردن پر

یہ نقشِ خونچکاں ہے کس شہیدِ ناز کی بابت
لہو چھڑکا ہوا ہے جا بجا محشر کے دامن پر

گذر کس غیرتِ گل کا ہوا یا رب گلستاں میں
پسینا آگیا گل کو پڑی ہے اوس گلشن پر

نہ دی کچھ فرصتِ نظارہ ظالم نے دمِ کشتن
ہماری حسرتوں کا خون ہے خنجر کی گردن پر

ظہیر اٹھو چلو ملکِ عدم کو راہ لو اپنی
نہ رہنے دیگی وحشت چار دن حرصِ مسکن پر

کلامِ اکبر

شیخ نے ناقوس کے سُر میں جو خود ہی تان لی
پھر تو یاروں نے بھجن گانے کی کھلکر ٹھان لی

جانِ دل محبوب تھے لیکن نتیجہ یہ ہوا
دل نے تڑپایا ہمیشہ زندگی نے جان لی

مدتوں قائم رہینگی اب دلوں میں گرمیاں
میں نے فوٹو لے لیا اُس نے نظر پہچان لی

رو رہے ہیں دوست میری لاش پر بے اختیار
یہ نہیں دریافت کرتے کس نے اسکی جان لی

میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہوگیا
رہ گئے نغمے حدی خوانوں کے ایسی تان لی

حضرتِ اکبر کے استقلال کا ہوں معترف
تا بمرگ اس پر رہے قائم جو دل میں ٹھان لی

آفتِ دل ہے تو پھر عقل کا سودا کیا ہے
ہو بھی جا محوِ جنوں ہوش میں رکھا کیا ہے

جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

موت جب سر پہ کھڑی ہے تو یہ غفلت کیسی
تجھ کو اِس بزم سے اُٹھنا ہے تو بیٹھا کیا ہے

عام الزام ہے اکبر پہ کہ مبتلا ہے یہ کیوں
دل کی پرسش نہیں ہوتی کہ یہ کھاتا کیا ہے

جوششِ سودا کو طبعِ لاابالی چاہیے
منظرِ مجنوں کو تصویرِ خیالی چاہیے

انکے مضمونِ کمر کا باندھنا آسان نہیں
مدتوں مشاقیِ نازک خیالی چاہیے

ہر دم میخانہ اکبر کے لئے دلکش نہیں
بادہ صافی چاہیے اور ظرف عالی چاہیے

مذہب سکھا رہا ہے کہ تردید کیجیے
کہتا ہے فلسفہ مری تقلید کیجیے

سرگرمِ بحثِ عقل و عقیدہ ہیں دیر سے
کس کس کی ان جدال میں تائید کیجیے

محشر میں کہہ رہی ہے کسی کی نگاہِ ناز
جو کچھ کہیں ہم آپ سے تائید کیجیے

دنیا طلسم خانۂ اہلِ نظارہ ہے
ممکن ہو جس طرح سے ہوسِ دید کیجیے

کب سے دکھا رہا ہوں دلِ داغ داغ کو
کچھ تو نگاہِ ناز سے تنقید کیجیے

سمجھا ہو موت کو جو مداوائے دردِ دل
اس بوالہوس سے کیا کوئی امید کیجیے

اب اختیار کچھ دلِ خود رفتہ پر نہیں
ناحق ضبطِ عشق کی تاکید کیجیے

آزادگی پسند طبیعت مری عزیز
ضد شیخِ محترم کو ہے تقلید کیجیے

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

اشکِ ارماں

حال میں ہمارے دوست مرزا احمد حسن صاحب بی۔ اے وکیل الہ آباد اور ان کے خاندان کو ایک جانگزا ماتم پیش آیا۔ ذیل کے اشعار میں ان جذبات کا اظہار ہے جو اس سانحۂ روح فرسا سے پیدا ہوئے۔

سازِ دل اپنا عجب درد کا ساماں نکلا
اس کے ہر پردہ سے صد نالہ و افغاں نکلا

نوحۂ غم کی تڑپ نغمۂ شادی میں ہی
خندۂ عیش بھی نکلا ہے تو گریاں نکلا

عبرت انگیز ہے نیرنگِ طلسماتِ جہاں
جو یہاں آیا سراسیمہ و حیراں نکلا

ہمت آہ و فغانِ بلبلِ شیدا ہی نہیں
شاہدِ گل بھی سدا چاکِ گریباں نکلا

ہر نفس سے ہے یہاں محشرِ آلام عیاں
بحرِ ہستی کی ہر اک موج سے طوفاں نکلا

زندگی کو طرب آمیز سنا کرتے تھے
یہ نوا اک قصۂ پُر درد و پُر ارماں نکلا

یادگارِ غم و اندوہ ہے تصویرِ مریض
عکس میں بھی اثرِ سوزشِ پنہاں نکلا

جس پہ دُنیا کی دوا اور دُعا صرف ہوئی
اس کی صحت کا نہ پہلو کسی عنواں نکلا

شورِ تقدیر سے تدبیر گراتی ہی گئی
جسکو کہتے تھے مرض موت کا ساماں نکلا

تپِ دق تپ خلق میں پیدا نہیں جس تپ کی دوا
درد وہ درد ہے جس درد کا درماں نکلا

دلِ تسکین حوصلہ فرسا تھا وہ ہنگام کہ جب
دیکھکر نبض مسیحا بھی پریشاں نکلا

بے بسی چارہ گروں کی تھی عجب روح فزا
اُس سے یاس ہوئی یاس سے حرماں نکلا

بسترِ خاکِ لحد پر تو ملی چین کی نیند
تجھ پہ قربان۔ کہو اب تو یہ ارماں نکلا

دل میں رہتی تھی سدا خدشۂ فردا کی کھٹک
جان کے ساتھ یہ کانٹا بھی رگِ جاں نکلا

خوابِ راحت سے اٹھو۔ آؤ کوئی بات کرو
کہو کیا حاصلِ ہستی امکاں نکلا

راز کچھ عالمِ بالا کے بھی معلوم ہوئے
کچھ پتہ ہستیٔ مابعد کا ایماں نکلا

دیکھو سو مرتبہ تاراج خزاں ہو ہو کر
پھول پھر نکلے ہیں پھر سبزۂ بستاں نکلا

تم کہاں جا کے چھپے ہو کہ نکلتے ہی نہیں
چھپ کے سو مرتبہ پھر مہرِ درخشاں نکلا

اب تو آجاؤ کہ ساون میں ہیں آیا کرتے
دیکھو نکھرا ہوا پھر رنگِ گلستاں نکلا

نہ تھمی موسمِ برسات میں اشکوں کی جھڑی
نہ تم آئے نہ خوشی کا کوئی ساماں نکلا

غم و اندوہ کا اعجاز ہوا دل پہ ہجوم
اک سنبھل ہاتھ سے پھر صبر کا داماں نکلا

اعجاز

سیلِ زمانہ

مخزن کی گذشتہ جلدوں میں ایک مضمون رفتۂ ہستی جناب سید سجاد حیدر بی۔ اے کا لکھا ہوا دیکھ کر بے ساختہ دل میں امنگ پیدا ہوئی کہ اس مضمون کو نظم کرنا چاہیے۔ چنانچہ جس قدر ممکن ہوا۔ مذکورہ بالا مضمون کا جامہ پہنایا ہے۔ بحر جو اس مضمون کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ وہ بحر ہے جس میں اس سے قبل حضرت اعجاز "زمزمۂ لاہور" کا دلفریب ترانہ اڑا چکے ہیں۔ اس لحاظ سے نظم بے بضاعت بہ نسبت حضرت اعجاز کی تقلید ہے۔

بہائے جا۔ اُڑائے جا۔ ڈبائے جا۔ مٹائے جا
قسم ہے تجھ کو ایسی ہی یہی روش نبھائے جا

مگر او سیلِ حادثہ	خدارا صبر کر ذرا
یہ دیکھ سامنے ہے کیا	جزیرہ ایک خوشنما
ہری بھری یہ ڈالیاں	لالہ و گل کی لالیاں
یہ نہریں اور یہ نالیاں	یہ لطفِ زندگی ہیں کیا
وہ دیکھ چند مہ جبیں	حسین اور نازنیں
لئے ستار اور بین	بُلا رہے ہیں مجھ کو۔ آ
زمیں یہ دیکھ لینے دے	یہ گانے سُن تو لینے دے
ذرا سا دم تو لینے دے	مگر سُنے تیری بلا
یہ سلسلے ہیں جو عیاں	مٹے ہوؤں کے ہیں نشاں
یہ دارا یہ نوشیرواں	ہیں یہ سب کے سب فنا!

وہ رومیوں کی عز و شاں | وہ جامِ جم کی داستاں
حجازیوں کے وہ نشاں | وہ ہند و چیں کی خوبیاں
مری نظر سے سب نہاں | مگر تو دیکھتا رہا !
وہ پہلوانِ نامور | وہ خسروانِ تاجور
وہ اہلِ علم با نظر | وہ دینِ حق کے راہبر
گئے یہ سب کے سب گذر | گذر رہی ہے تجھے بقا !

سید نذیر حسین ناشاد

کوہِ شملہ پر ریل

(از جناب محمد نواب جان صاحب ناقب حقی واصل)

کوہ پر تیری سواری اے صبا رفتار ریل | باد ہی صرصر ہی کیا ہے اے ہوا رفتار ریل!
کجروی میں بھی خدا کی شان تو ہموار ہے | راہ ناہموار میں ہر دم سدا ہموار ہے
ہر بلند و پست میں تیرا قدم ہے استوار | تیز پائی تیز رفتاری میں تو ہی پائدار
آڑے آتی ہے جو آئے تیرے آگے کوئی آڑ | کوہ پر چڑھنے کو گویا تیری چھاتی ہے پہاڑ

یاد آتا ہے خدا تیرا تماشا دیکھ کر
جلوۂ حق دیکھتے ہیں تیرا جلوا دیکھ کر

تیری ہر اک کل صفت میں ہے صنعت کی پری | تیرے ہر اک کیل کانٹے میں ہے پُر صنعتگری
چوٹیوں پر بید سرک جاتی ہے کیسا کانپتا | تازہ دم رہتی ہے تو ہر وقت کیسا ہانپتا
تیرہ و تاریک راہوں سے گذر جاتی ہے تو | دیکھتے ہی دیکھتے جادو سی کر جاتی ہے تو
تیرا بل کھا کر نکلنا راہ پُر ظلمات سے | ایک آفت ہو نکل آتی ہے جو آفت سے

وہ رومیوں کی خود ستاں   وہ جام جم کی داستاں
حجازیوں کے وہ نشاں   وہ ہند و چیں کی خوبیاں
مری نظر سے سب نہاں   مگر تو دیکھتا رہا!
وہ پہلوانِ نامور   وہ خسروانِ تاجور
وہ اہلِ علم باخبر   وہ دینِ حق کے راہبر
گئے یہ سب کے سب گذر   مگر رہی ہے تجھے بقا!

سید نذیر حسین ناشاد

کوہِ شملہ پر ریل

(از جناب محمد نواب جان صاحب منشی فاضل)

کوہ پر تیری سواری اے صبا رفتار ریل!   باد ہی صرصر ہے کیا ہے اے ہوا رفتار ریل!
کج روی میں بھی خدا کی شان تو رہوار ہے   راہ ناہموار میں نام خدا ہموار ہے
ہر بلند و پست میں تیرا قدم ہے استوار   تیز پائی تیز رفتاری میں تو ہی پائدار
آڑے آتی ہے جو آئے تیرے آگے کوئی آڑ   کوہ پر چڑھنے کو گویا تیری چھاتی ہے پہاڑ

یاد آتا ہے خدا اتنا تماشا دیکھ کر
جلوہ حق دیکھتے ہیں تیرا جلوا دیکھ کر

تیری ہر اک کل حقیقت میں ہے صنعت کی پری   تیرے ہر اک کیل کانٹے سے ہے پیدا صنعتگری
چوٹیوں پر بے دھڑک جاتی ہے کیسا کانپنا   تازہ دم رہتی ہے تو ہر وقت کیسا ہانپنا
تیرہ و تاریک راہوں سے گذر جاتی ہے تو   دیکھتے ہی دیکھتے جادو ہی کر جاتی ہے تو
تیرا بل کھا کر نکلنا راہ پر ظلمات سے   ایک آفت ہے نکل آتی ہے جو آفات سے

تیرے سر میں بہتے ہیں تجلائے جال ہر دم | دیکھ کر تجھ کو سرک جاتے ہیں تیرا کلام
کروٹ پر پہلو بدلنا تیرا آ دیکھے کوئی | کھینچ لیتی ہے تو چلنے میں ملنا ہیں کوہ کی
گرم رہتا ہے گویا آتش کا پرکالہ ہے تو | تیرا انجن آتشیں خود دُود دُنبالہ ہے تو

سرزمینِ کوہ کو خوشحال تو نے کر دیا
برکتوں سے اپنی مالامال تو نے کر دیا

تجارت

(استاد میر سید رضا صاحب اکبرآبادی)

گرم بازار ہے طبیعت کا | شوق ہے مدحتِ تجارت کا
خوب بیوپار کی ہو مدح و ثنا | دل میں اس وقت ہے یہی سودا
ہے تجارت کی خاک بھی اکسیر | اس سے مفلس ہو گئے ہیں امیر
راحتِ روحِ شیخ و شاب ہے یہ | ضوفگن مثلِ آفتاب ہے یہ
کامیاب اس سے آج ہے محنت | اس پہ نازاں ہیں صنعت و حرفت
رونقِ شال و دلی ہے اس سے | گرم بازارِ خلق ہے اس سے
اُٹھ گیا مال و زر دوکانوں سے | کوئلہ آ رہا ہے کانوں سے
چاند کی پڑ گئی چمک پھیکی | روشنی ہو رہی ہے بجلی کی
گھر کے ہر طاق میں رسائی کی | شان دیکھو دیا سلائی کی
محفلِ ناز کی ہے زینت پھول | تختۂ برگِ سبز ہے مقبول
جسکو رہنا ہو قصرِ دولت میں | کام حاصل کرے تجارت میں

لہ انگریزی لفظ بمعنی ہوڈ -

اس کا پابند مال و زر نہ ہے — بس نصیبے کی یہ سکندر ہے

ہو بہر شکل اس کی زیبائی — آخر آئنہ پہ رعنائی

پردہ پوشی اسی کی ہے خصلت — یہی پہناتی جامۂ عزت

راستے ہر نئے دکھاتی ہے — تجربے سینکڑوں سکھاتی ہے

سکۂ ملک تربیت ہے یہ — ہو رواج اس کا مصلحت ہے یہ

یہی ہر جا پہ کام آتی ہے — سیر ملکوں کے یہ دکھاتی ہے

ہے یہی حسن کو بڑھا دیتی — آدمیت یہ ہے سکھا دیتی

اس سے ناکام کامیاب ہوئے

ذرے مہتاب آفتاب ہوئے

اس کی تعریف کی خدا نے بیاں — نہ یقیں ہو تو دیکھ لو قرآں

اس کے نفعوں سے فیضیاب کیا — حکم اس کا نبی نے ہم کو دیا

فائدے اسکے کیا کروں میں رقم — اس کے مداح سب ہیں لوح و قلم

قوم ناکام کو ترقی دی — اہل اسلام کو ترقی دی

ہیں بہ اسکے فائدے محدود — بن گئے اس کے گر سے اہل ہنود

اس کی دھن ہی عجب نشاط انگیز — آبرو اس سے پا گئے انگریز

اس تجارت کا لوگ دیکھیں ظہور — ملک گمنام ہو گئے مشہور

رشیہ جاپان اٹلی افریقہ — چین جرمن فرانس امریکہ

شہر بھی کتنے ہو گئے آباد — سنو اس وقت مجھ کو ہیں کچھ یاد

وائنا اور برلن اور پیرس — لندن و نیویارک اور وینس

بمبئی کانپور کلکتہ — اکبر آباد دہلی انبالہ

جتنے تاجر ہیں سب ہیں اہل دول — اپنی محنت کا پا رہے ہیں پھل

فیض ہے اُن سے دیہی گاہکو   قرض دیتے ہیں بادشاہوں کو
شور کیسا بپا ہے سُنئے تو   غل یہ کیا ہو رہا ہے سُنئے تو
کہہ رہا ہے ہر ایک راہی کیا
ہے تجارت کے آگے شاہی کیا

ہستی

(از جناب ہستی ، دھرم سنگھ صاحب مسٹر آر ایم آر لے ایس)

کیا میں ہستی کی لکھوں مدح و ثنا   یہ تو کوئی شے نہیں ۔ سمجھو ذرا
جس کو ہستی کہہ رہا ہے ہر بشر   شکل تو اس کی نہیں آتی نظر
کیا کہوں معشوق ہوں کیا نام لوں   نیستی کو کس طرح ہستی کہوں
واقعی ہے بات ۔ کب ہو سکے کوئی   نیستی ہستی ہے ۔ ہستی نیستی
بہت دنیا ہستی دکھا لی بے الم   مر گئے جب پھر کہاں کا رنج و غم
نیستی دریا بنا دے قطرے سے   بحر سے قطرہ جُدا ہستی کرے
کر رہے ہیں صاف یہ عقل و قیاس   ہستی کا کھیل ہے ہو گا بھیاس
خندہ زن ہے خلق ہستی پر مدام   اس قدر ہستی کرے تھوڑا قیام
جس قدر دُنیا میں ہیں راحت طلب   ہستی کے نام سے روتے ہیں سب
خرم و شاداں ہیں ہستی پر کمال   سوچتے ہرگز نہیں اس کا مآل
آپ ہی روتا ہے بچہ دیکھئے   جب نکلتا ہے وہ ماں کے پیٹ سے
رنج کرنے کے لئے پیدا ہوا   ہستی موہوم پر شیدا ہوا

حیف انساں ہو کر باتمیز — بھول جاتا ہے کہ ہستی کیا ہے چیز
نام کو ہستی ہے۔ لیکن بے گماں — صورتِ عنقا نہیں کچھ بھی نشاں
ہو سکے کس طرح ہستی کا شمار — جب نہیں خود زندگی پر اعتبار
ہستیٔ انساں ہے دو دن کا شباب — جس طرح دریا میں ہو شکلِ حباب
اشکِ شبنم رہتے ہیں شب بھر رواں — کب نظر آتے ہیں دن کو وہ عیاں
دیکھ لو پروانہ کی ہستی ذرا — شمع جب روشن ہوئی وہ جل بجھا
آدمی کیوں ہستیٔ نابود پر — شاد ہے اترا رہا ہے اس قدر
وہم کی صورت ہے اسکی کائنات — ہستیٔ ہر انس و جاں ہے بے ثبات
ہستیٔ ظرفِ گلی کو دیکھئے — ٹوٹ جاتا ہے ذرا سی چوٹ سے
کس کو ہستی کی فنا میں ہے کلام — کون رہ سکتا ہے دنیا میں مدام
خوبیاں اس میں ہیں اچھے ہوں عمل — ہر گھڑی موجود ہے سر پر اجل
کیا بھروسہ ہستیٔ موہوم پر — موت کب آئیگی کس کو ہے خبر
ایک دن مرنا ہے سب کو بالیقیں — آئیگا دم مارنے کا دم نہیں
ہستیٔ انساں ہے کیا سے جان لو — خوب اپنے آپ کو پہچان لو
جانتے ہو جبکہ مرنا ہے ضرور — کس لئے اِتنا ہے ہستی پر غرور
جسم میں یہ روح رہنے کی نہیں — ناؤ کاغذ کی ہے بہنے کی نہیں
ہے اگر جینا تو مرنے کے لئے — اور مرنا ہو ابھرنے کے لئے
مرنے سے پہلے اگر مر جاؤ گے — جستجو جس کی ہے اسکو پاؤ گے
فیصلہ سب کا ہے یہ بالاتفاق — نیستی ہے میل ہستی ہے نفاق

یاد رکھنا بات یہ سرکار کی
نیستی ہستی ہے ہستی نیستی

برسات

آئی برسات ہرے پھر ہوئے دل کے سب زخم
باغ میں پھر ہو جنوں خیز ہواؤں کا گذر

آگئی گھنگھور گھٹا چھا گئے بادل ہر سو
آئیں بگلوں کی قطاریں تو دریا ہو کر

کوئلیں کوکیں پپیہوں نے صدا دی گلشن
ہو کے خوش موروں نے بھی ناز سے پھیلائے پر

نو دخت دیدہ میں ہر سبزہ ہی کے مشغول
مسکرائے ہوئے غنچوں پہ ہے بلبل کی نظر

بھونرے کرنے لگے پھولوں کی بلا گردانی
آ کے سب بیٹھ گئے نغمہ سرا شاخوں پر

شور قمری نے کیا باغ میں حد سے جو زیا
ضعف سے برس ہمارے بدلے تیور

بال سنبل کے جو الجھے ہوئے بکھرانے
شانہ کرنے لگی منقار سے قمری آکر

کالی کالی جو گھٹا میں کبھی بجلی چمکی
پھر گئی آنکھ میں اس شوخ کے غصہ کی نظر

پھر غش آنے لگے مجھ کو عنبر سرشتہ
کسی بے درد کی الفت کا ہوا دل پہ اثر

پھر کھلتے ہوئے سنبل کے جو گیسو دیکھے
ایسے الجھے کہ رہا کچھ بھی نہ قابو دل پر

یوں نکل جائیں یہ دن ہجر کے صدمے میں نہال
تم ہی انصاف کرو صبر کریں ہم کیوں کر؟

نہال عظیم آبادی

انجامِ بہار

مے بھی تھی مینا بھی تھا اور ساقی میخانہ تھا
بزم تھی آراستہ اور جلوہ جانانہ تھا

پھول کھلنے سے ہوا سارا چمن رشکِ جناں
بلبلوں کا ولولے انداز کچھ مستانہ تھا

ہنسی خوبی پر تھا اِتراتا ہر اک غنچہ وہاں
قمریوں کا سرو سے برتاؤ بیباکانہ تھا

جو لئے گلہائے زرِ زربفت کے جھولے بچھے
جبکہ خود گلچیں بھی اُنکے حُسن کا دیوانہ تھا

سبزۂ خط سیر تا تھا ہر اک طائر شیریں بیاں
اور یگانہ ہوگیا جو سبزہ بیگانہ تھا

چہچہانے کی صدائیں آرہی تھیں کان میں
اِس سے بڑھکر کیا کہوں وہ اک عجائب خانہ تھا

یک بیک جھونکا ہوائے تند کا آیا وہاں
کچھ نہ تھا گویا کہ مدت کا وہ اک ویرانہ تھا

دیکھتے اپنے وہ بکھرا ایسا شیرازہ وہاں
گل ہوئی وہ شمع جس کا اک جہاں پروانہ تھا

آشیانِ بلبلِ بیکس جو یوں درہم ہوا
زاغ کا اور بوم کا اک خاص خلوت خانہ تھا

دیکھکر یہ حالِ دل منظور یوں گویا ہوا
جو کہ دیکھا خواب تھا اور جو سنا افسانہ تھا

قاضی عبداللہ خان ازلآخ

قطعہ در صفتِ انبہ

(سردار عبدالحمید خان صاحب حمید یوسفی مرادآبادی نے یہ قطعہ غالب مرحوم کے قطعہ کی زمین میں لکھا ہے۔

تحفۂ آم مرے دوست نے بھیجے ہیں مجھے
متحیر ہے طبیعت کہ انہیں کیا کہیے

سر فرو بردہ تفکر کہ انہیں کیا سمجھے
ناطقہ مہر بلب ہے کہ انہیں کیا کہیے

نخلِ الطاف و کرم کے یہ ثمر تازہ ہیں
انکی صورت کو محبت کا ہیولا کہیے

بھرا ہے رنگ حلاوت کا جھلکتا ان میں
مئے الفت کا ہر اک جام چھلکتا کہیے

یہ نمونہ لطف کی شیرینی وفا کی ہر بوند
قند کیا چیز ہے ان کو جو میٹھا کہیے

لبِ شیریں سے کسی کے ہیں حلاوت میں بہا
رنگ میں لمس میں رخسارۂ عذرا کہیے

کسی محبوب کے ہاتھوں کا ترنج ان کو کہیں
یا کسی حور کا جوبن انہیں اُبھرا کہیے

باغِ رضواں سے خدانے ہے یہ ہدیہ بھیجا
آم ہے یا ثمرِ سدرۂ طوبیٰ کہیے

شہد کے پانی سے قدرت نے انہیں سینچا ہے
بند کوزوں میں حلاوت کے ہیں دریا کہیے

سر بمہر آئے ہیں جنت سے یہ کوثر کے گلاس
مہرِ صنعتِ قدرت ہے ہویدا کہیے

رس بھرے چرخ سے بن جن کے چلے آتے ہیں
کس طرح پھر نہ ان آموں کو رسیلا کہیے

لبِ شیریں سے حسیں چوستے ہیں جب انکو
انکی شیرینی کو پھر کیوں نہ دو بالا کہیے

کیجیے وصف انہیں بحرِ عسل کے ہیں حباب
خلد میں جاری اگر شہد کے دریا کہیے

بلبلیں گل پہ چہکتی ہیں تو کوئل ان پر
دلربائی میں گر ان کو نرالا کہیے

انکی سرخی رخِ معشوق کی سرخی سے سوا
انکی سبزی کو گیابی سا وہ چہرا کہیے

کونسی چیز سے دیجے انہیں تشبیہ حمید
مختصر یہ کہ سب سے انہیں بالا کہیے

قطعہ

کیا منہ کی کھائی ہے

الحمد عشق و شوق سے کیا منہ کی کھائی ہے
بولا ستم ظریف کہ ہاں ہاں بجا درست

کیا حالِ غم درپیش کہے جا آپ ہی تو دیں
کیا آپ ہی کے دم سے ہے نقشِ وفا درست

لکھتے ہیں خط میں آپ ہی کیا حالِ غم فزا
انشا درست جس کا نہ املا ذرا درست

تحریرِ حالِ درد میں کیا آپ ہی ہیں فرد
جس کی خبر ہی ٹھیک نہ کچھ مبتدا درست

کیا واسطہ مذہب سے مگر آپ ہی تو کیا — سمجھے ہیں آپ ہی کہ ستم ناروا درست
کیا پیر و طریقِ برہمن ہیں آپ ہی — کیا مسلک آپ ہی کا ہے نام خدا درست
کیا آپ ہی نمازیِ ماہِ صیام ہیں — سر پر عمامہ رکھ کے پہن کر عبا درست
کیا آپ ہی کی آہ ہے برہم کن مزاج — جس سے رہی نہ زینتِ زلفِ رسا درست
کیا آپ ہی ہیں وحشیِ نجدی کے جانشیں — شیرازۂ کتابِ جنوں کر دیا درست
کیا اہلِ دل ہیں آپ ہی ہنستے ہیں کہہ کے یہ — انسان کے حواس کو رکھے خدا درست
دیکھے ہوئے ہوں عشق میں ہر ایک ولولہ — سمجھے ہوئے ہوں آپ کا ہر ادعا درست
کیا فائدہ ہے بوالہوسی سے بتائیے — کیا لطف اگر نہ بن کے عاشق نما درست
کی ہم نے ہنس کے بات تو دل میں ٹھان لی — سب کام اپنے شوق کا بس ہو گیا درست
بس بس علاج کیجئے سودائے خام کا — رہیے وہاں جہاں کی ہو آب و ہوا درست

مقراض کی طرح سے چلا کی زبانِ یار
محشر ہم اتنا کہہ کے اٹھے ہاں بجا درست

محشر لکھنوی

تازہ غزلیں

(از نواب سید علی حسن خاں بہادر طاہر)

بھول کر چھیڑ نہ کرنا دلِ ناداں کوئی — دل لگی میں نہ اٹھا لے مرے ارماں کوئی
نظر آتا نہیں دل بچنے کا ساماں کوئی — خالی جاتا ہی نہیں ناوکِ مژگاں کوئی
چشمِ دل میں ہو جو ہر وقت نمایاں کوئی — کیوں رہے آٹھ پہر پردہ میں پنہاں کوئی
کر دیا سوز کی شوخی نے حیا کو بے باک — رکھے اب اپنے نگہباں کا نگہباں کوئی

شکوہ کیونکر کروں یہ تو نہیں کیا جاتا
سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہوں پشیماں کوئی

ہائے کیا تیری محبت میں مزہ ہے ظالم
دل کو حسرت ہے کہ بن جائے وہ ناداں کوئی

امتیاز ہوس و عشق ابھی دکھلا دینگے
شوق سے ہو تو فدا جان کا خواہاں کوئی

مر کے پاتے ہیں شہیدانِ محبت جو حیات
تیغ کا گھاٹ ہے یا چشمۂ حیواں کوئی

خیر گھیرے انہیں بیٹھے رہیں کیا غم مجھ کو
نظروں نظروں ہی میں ہو جائیگا بیجاں کوئی

اے اجل ایک نظر دیکھ تو لینے دے انہیں
بال بکھرے ہوئے آتا ہے پریشاں کوئی

ہے حسینوں ہی سے اس بزم جہاں کی زینت
گل گلزار کوئی شمع شبستاں کوئی

کیسے کہدوں تری صورت کو میں بے مثل و مثال
اسی صورت کا مرے دل میں ہے پنہاں کوئی

آپ ظاہر سے جو واقف نہ ہوں ہم بتلا دیں
کبھی راتوں کو نکلتا ہے غزل خواں کوئی

(از حاجی سید نور الرحمن صاحب نور عظیم آبادی)

نیچی کئے ہوئے ہیں نظر بولتے نہیں
جاتے ہو میری جان کدھر۔ بولتے نہیں؟

جلوہ کسی کا جب سے ہے آنکھوں کے سامنے
سکتا ہے چپ ہیں اہلِ نظر۔ بولتے نہیں

غربت نے ایک بات سکھائی ہے یہ ہمیں
سنتے ہیں سب کی بات مگر بولتے نہیں

آیا جو یار اپنی زباں بند ہو گئی
سب سمجھتے ہیں دل میں مگر بولتے نہیں

کہتا ہے کوئی حضرت موسیٰ کا حال جب
ہنستے ہیں سن کے اہلِ خبر بولتے نہیں

جنکو تمہاری دید کا لپکا پڑا ہے۔ وہ
کھاتے ہیں چپکے تیر نظر۔ بولتے نہیں

اس جستجو پہ بھی نہیں پایا جو کہتے یار
چپ لگ گئی ہے شمس و قمر بولتے نہیں

جو واقفی ہیں دل سے فدائے نگاہ دوست
کھاتے ہیں چوٹ دل پہ مگر بولتے نہیں

معلوم ہو نشان تو کس طرح سے بھلا
جو جانتے ہیں آپ کا گھر بولتے نہیں

تھک ہو چکی عمر زمانے سے اس طرح — آنکھیں لگی ہیں جانب در بولتے نہیں

کیوں چپ ہیں آپ نذر یہ سکتہ ہے کس لئے
جلوہ ہے حسن کا پیشِ نظر۔ بولتے نہیں

(از جناب محمد حامد علی خاں صاحب حامد۔ لکھنوی)

ہزاروں طرح سے صاحب تمہیں ہم یاد کرتے ہیں — کبھی چپ ہیں کبھی روتے ہیں گہ فریاد کرتے ہیں
یہی بس صاف کہتے ہیں خفا ہو یا کوئی خوش ہو — اثر جتنا ہے دل پر اس قدر ہم یاد کرتے ہیں
قفس میں بے مشقت آب و دانہ ہم کو دیتا ہے — تری مدح و ثنا ہر وقت اے صیاد کرتے ہیں
وہ طائر ہوں شکستہ پر کہ جس پر اک جہاں رویا — خدا سمجھے جفائیں مجھ پہ جو صیاد کرتے ہیں
تری قدرت کا اے خالق یادی سا مرے ہر — کہ ہم بس عالمِ ایجاد میں ایجاد کرتے ہیں
جو زمدہ تھی تو زینت تھی تری محفل کی اے دلبر — پسِ مردن ترے کوچہ کو اب آباد کرتے ہیں
پگھلتا ہے دلِ سختِ بتاں آنکھوں کی گرمی سے — زیادہ موم سے بھی نرم ہم فولاد کرتے ہیں
سماں وہ دیدنی ہے روبرو انکے اشاروں میں — بیاں جس وقت ہم افسانۂ فرہاد کرتے ہیں
یہ دل ٹکڑے بلا سے ہو کلیجہ ضبط سے شق ہو — جو گذرے وہ گذر جاوے کہیں فریاد کرتے ہیں
وہ آہیں دل میں گھر کرتی ہیں جو دل سے نکلتی ہیں — وہ دل کو تھام لیتے ہیں جو ہم فریاد کرتے ہیں

مرے دل کی دوا حامد وہی بوٹا سا اک قد ہے
تسلی قلبِ مضطر کی کہیں شمشاد کرتے ہیں

(از سید مصطفیٰ صاحب دمیں)

اے عندلیب! رونقِ بستاں ہے چند روز — فصلِ بہار باغ میں مہماں ہے چند روز
دو دن کو خوشنوائی قمری چمن میں ہے — خوش قامتی سروِ خراماں ہے چند روز

بلبل ہیں گلوں کے دیتی ہے حرفِ خلش
ہوگا یہ خلد زارِ گلستاں ہے چند روز

لالہ کو بے ثباتیِ عالم کا داغ ہے
یوں دیکھنے کو باغ میں خنداں ہے چند روز

مجھنے نہ دیگی رنگ یہ نیرنگیِ خزاں
اے باغباں! بہارِ گلستاں ہے چند روز

گل کی طرح گذاریے یاں ہنس کے زندگی
باغِ جہاں میں صحبتِ یاراں ہے چند روز

کہتی ہے نے کہ تلخ بیاں کی ہیں لذتیں
دنیا کے ساز عیش کا ساماں ہے چند روز

انساں کیا ہے؟ بحرِ جہاں کا ہے بلبلہ
مہماں سرائے دہر کا مہماں ہے چند روز

دنیا کے رنج و غم سے اسیر نہ ہو ملول
چھوٹو گے اس سے جلد یہ زنداں ہے چند روز

ہے کچھ دنوں جہاں میں گدا کی گداگری
واحسرتا حکومتِ سلطاں ہے چند روز

کیا مالِ جاہ و حسن و جوانی پہ کیجیے ناز
افسوس زندگانیِ انساں ہے چند روز

اک حال پر کوئی نہیں رہتا یہاں مدام
خنداں ہے چند روز تو گریاں ہے چند روز

(از مولوی عابد حسن صاحب زیدی کھیڑوی)

نہیں کے لفظ سے للہ بدلو لفظ تم ہاں کا
کہ ہو جائیگا خوں امید کا حسرت کا ارماں کا

تڑپنے کے مزے سینے میں اپنے دل جگر دونو
وہ گھائل تیرے نشتر کا یہ بسمل تیری مژگاں کا

جلا دل سوزِ فرقت میں یہی ہونا تھا ختم اس کا
ہوا صد چاک وحشت میں یہی حق تھا گریباں کا

ترے تیروں کو سینے سے لگا کر دل میں رکھا ہے
کہ بیشک میزباں پر حق ہوا کرتا ہے مہماں کا

رہا ان سے بلا میں مبتلا راحت ملی ان سے
برا ہو آرزوؤں کا بھلا ہو یاس حرماں کا

یہ رسوائی کی باتیں ہیں یہ کیا کرتے ہو اے عابد
اسے گھورا اسے تاڑا ادھر تاکا ادھر جھانکا

(از حافظ ولایت اللہ صاحب آرشا جہانپوری)

شمعِ فانوسِ خیالی کب بسر ہوتی نہیں — پھرتے ہیں شب بھر یہ تکلیفِ سفر ہوتی نہیں

حلقۂ مستی ہوئی۔ کب صبح۔ آئی شام کب — ہم کو اسکی بھی خبر دو دو پہر ہوتی نہیں

ایک میں بیہوش ایسا جسکو دنیا کی خبر — ایک تم جس کو خبر مگر خبر ہوتی نہیں

شمعِ سوزاں کی طرح اس شمع رو کی ہے تلاش — محو ہیں رونے میں تکلیفِ سفر ہوتی نہیں

صورتِ سنگِ فلاخن ہم کو چکر ہر گھڑی — گردشِ چشمِ صنم کو کچھ خبر ہوتی نہیں

ابر کے رونے کی اک عالم کو ہوتی ہے خبر
اس کو کب روتے ہو تم اسکی خبر ہوتی نہیں

(از مولوی حمید الدین صاحب حمید)

کھلی ہے دل کی گرہ بمشکل مگر ہمہ تن گداز ہو کر
پتا ملا نازِ دلبری کا وہ لے سراپا نیاز ہو کر

تمہارا اندازِ کبریائی غضب کی تھی شانِ خود نمائی
وہی تو اب ... رہی وجہ کے نمودِ خوباں میں ناز ہو کر

کہیں سراپا غرور بنکر کیا ہے محمود نام اپنا
کہیں سکھائی نیازمندی ادائے نازِ ایاز ہو کر

ہے حصولِ مراد و راحت مٹا دیں آہنگ جو دسری کو
تمہارے دفتر کا اک یہ نکتہ جہاں میں آیا ہے راز ہو کر

جو آبرو میں ذلیل و بیجا تمہارے رندوں کے دل سے عالی
وہ جا کے بیٹھی ہیں دل میں زاہد کے سب کی سب حرص و آز ہو کر

حمید کہنا یہ اب ادب سے حرم کے سالارِ کارواں کو
[illegible]

(از جناب [illegible] صاحب [illegible])

[illegible] پھرتی رہی یار کی نظر
لیکن وہی ہے طالب دیدار کی نظر

شدت سے خون بنکے ٹپکتا ہے چشم شوق
چھپتی نہیں ہے طالب دیدار کی نظر

[illegible] کے آنکھ دیکھ بھی سکتے نہیں ہیں ہم
کھلتے نگاہ میں نہ کہیں یار کی نظر

تھی حسن دیکھنے کو کبھی چشم شوق میں
اب نام کو ہے طالب دیدار کی نظر

دشمن فلک زمانہ عدو دوست منحرف
جب سے پھری ہے مجھ سے مرے یار کی نظر

وہ اپنا جلوہ آپ دکھاتے ہیں شوق سے
پہچانتے ہیں طالب دیدار کی نظر

سو رہ گئی ہے چشم عنایت کی آرزو
پھر پھر گئی ہے ہم سے ستمگار کی نظر

جلوہ کسی کا برق تجلی سے کم نہیں
جمتی نہیں ہے طالب دیدار کی نظر

کھینچے ہوئے ہیں بخشنے والے کی آنکھ کو
حلقہ نبی ہوئی ہے گنہگار کی نظر

چمکیگا اور حسن ترا میری چاہ سے
سب دیکھتے ہیں چشم خریدار کی نظر

رہ رہ کے آرہے ہیں مزے وصل و ہجر کے
مل مل کے لڑ رہی ہے ستمگار کی نظر

بھولیگا کس طرح سے فروغ وفا شعار
وہ مہربانیاں وہ تری پیار کی نظر

(از جناب منشی اصغر حسین صاحب [illegible] میرٹھ)

ستم ہے جور ہے بیداد ہے کاوش ہے کینے سے
ستمگر آزماتا ہے مجھے کس کس قرینے سے

جو نکلا آہ کا شعلہ شب غم میرے سینے سے
فلک پر جلکے اختر بنگئے کس کس قرینے سے

نہیں ملتی ہمیں دم بھر بھی راحت رنج دنیا سے
یہی ہے زندگی تو موت بہتر ایسے جینے سے

نہ ہوگا کچھ بھی حاصل زہد و تقوی سے تجھے زاہد
صفائے قلب ہوتی ہے صفائی [illegible] سے

[illegible] بہت مشکل ہے [illegible] ارماں ہیں باقی
جو تم آکر لپٹ جاؤ کسی دن [illegible]

[illegible] سے
تم [illegible]

محسن الملک سینٹ

طبِ یونانی کی بقا کے لیے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب رئیس اعظم دہلی

جو صفات اخلاص دی ہیں اُن کا معقول حصہ شہرت کے سطح پر آ چکا ہے۔ اطراف ہند میں ان کا نام
کے لئے سب کی نظریں ان ہی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت
اگر کچھ امیدیں ہیں تو وہ اُن ہی کی ذات سے ہیں اور ان ہی کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ جناب
حاذق الملک احساس فرض کے ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی
سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی اس مہتم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی
دواخانہ ان کے احساس فرض کا ثبوت اور ان کی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمرہ ہے گو اس کی
ظاہری حیثیت ایک تجارتی کاروبار کی حیثیت ہے۔ لیکن حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ
ایک بیوپاری کا کام نہیں۔ طب یونانی کی بقا کا سامان ہے۔ شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا
ہے۔ اسلئے جس غرض سے یہ قائم ہوا ہے اس کے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا۔
اصلی اور کھرے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور ان کے طرز ساخت میں تہذیب و ترقی دینا
کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے عام طور
رائج رہتے ہیں۔ بلکہ حکما کے وہ اصلی نسخے جو صرف رؤسا و امرا کو میسر آتے تھے بالکل
اصل اصل اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اس دواخانہ
کی ادنیٰ ... شفاخانہ کو دکھاتی ہے نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی
خاص خلوص و ہمت بھی اس دواخانہ کو عطا فرمائی ہے۔ صحت تندرستی ایک بڑی نعمت ہے اور ہر ایک انسانی جسم اس کی تو
جہد کا گذرگاہ۔ اس لئے تمام ابنائے وطن کو ان اعلیٰ اور منتخب یونانی ادویات سے جو اس دواخانہ میں خاص اہتمام
سے بنتی ہیں فائدہ اٹھانا اور اس کے ساتھ اس کار خیر کی مدد کا موقعہ ملتا ہے۔ خوبی انتظام اور حسن معاملہ کے سبب

معیارِ زیست

ہندوستان میں ایک نہایت اہم مسئلہ حل طلب ہے۔ جس کے حل کرنے کی طرف اہل الرائے نے تا حال توجہ نہیں کی اور وہ یہ ہے کہ ملک بھر میں معیارِ ملیست کو بڑھانا چاہئے یا نہیں۔ معیارِ زیست سے مراد اہلِ ملک کا طریقِ ماند و بود اور اس کے اخراجات کا پیمانہ ہے۔ جسے اصطلاح اقتصاد میں معیارِ زیست یا معیارِ معیشت کہہ سکتے ہیں۔ علمِ اقتصاد کے مسائل میں اس مسئلہ سے زیادہ ضروری مسئلے کم ہونگے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یورپ کی موجودہ ترقی کے مختلف اسباب میں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ یورپ والوں نے اس مسئلہ کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے۔ کہ ملک میں معیارِ زیست بلند رکھنا ملک کی تجارت اور دولت کی ترقی کا موجب ہوگا اور اہلِ ملک کی ہمت اور محنت کے لئے تازیانہ کا کام دیگا۔ اور عجب نہیں کہ ایشیائی قوموں کی مفلسی اور پستی کی وجوہات میں اُن کا پست معیارِ معیشت ایک قوی وجہ ہو۔ جب سے انگریزی راج اس ملک میں آیا ہے۔ اہلِ ملک کے طریقِ ماند و بود میں بتدریج بہت فرق آتا جاتا ہے اور اس کا پیمانہ اعلیٰ کرنے کی طرف روز بروز لوگوں کا

میلان ہے ۔ مگر یہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے باہم ہونے کا
قدرتی نتیجہ ہے اور بغیر کسی ارادہ یا کوشش کے خود بخود پیدا
ہو رہا ہے ۔ ہم لوگوں نے اپنی جگہ سوچ بچار کے بعد کچھ فیصلہ
نہیں کیا ۔ کہ آیا یہ میلان ہمارے ملک کے لئے اور اس کے خاص
حالات کو دیکھتے ہوئے مفید ہے یا مضر ۔ تاکہ اگر مفید ہو تو اسکی
رفتار کو تیز کریں اور اگر مضر ہو تو اسے روکنے کی کوشش کریں ۔

یہ بات سہی ہے کہ معیارِ زیست کا بڑھانا ضروریاتِ
زندگی کا بڑھانا ہے ۔ اور ضروریاتِ زندگی کا بڑھانا دو نتیجوں سے
خالی نہیں ۔ یا تو ضرورت کی بدولت مختلف ایجادات ہونگی ۔ ملک
والے نئے نئے طریقے روزی کمانے کے اور آمدنیاں بڑھانے
کے نکالیں گے ۔ زراعت کا رنگ اور ہوگا ۔ اور تجارت کا ڈھنگ اور ۔
ملک کے اپنے وسائل جب ادا ختم ہو جائینگے تو لوگ طلبِ معاش
میں دوسرے ملکوں کی طرف دوڑینگے اور جس طرح بن پڑے گا اپنی بڑھی
ہوئی ضرورتوں کو پورا کرینگے ۔ اور اس ہمت اور تگ و دو کا اثر ملک کی
عام خوشحالی اور ثروت پر پڑے گا ۔ مگر ہر مسئلہ کے دو پہلو ہوتے ہیں ۔
ایک ہی پہلو کو دیکھکر یہ خیال کر لینا درست نہ ہوگا کہ جب معیارِ زیست
بڑھانے کے ایسے مفید اثرات ہیں تو فوراً ہمیں اس کے بڑھانے پر متوجہ
ہو جانا چاہئے ۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے باشندوں کی
ہمت ۔ لیاقت ۔ قوتِ ایجاد ۔ شوقِ سفر ۔ اور قابلیتِ تجارت اسی تناسب
سے ترقی نہ کریں جس نسبت سے اُن کا "معیارِ زیست" بلند ہوتا جائے تو
ملک کو انتشار روز بروز دیکھنا پڑے گا ۔ اور اس کے باشندے اپنی معمولی

حالت سے بھی گر جائینگے۔ ضرورتیں زیادہ ہونگی اور وسائل کم۔ اور اسی سبب سے اُن کے اخلاق گرجائینگے۔ جب اچھے وسائل سے ضرورتیں پُوری نہ ہونگی تو بہت سے اہلِ ملک بُرے وسائل سے بھی پرہیز نہ کرینگے۔ خرابیاں بڑھتی جائینگی اور رفتہ رفتہ بے دستی اور افلاس کا سامنا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے قدیمی تمدن کی بُنیاد دیکھنے والوں نے معیارِ زیست کے پست رکھنے کو اس کے بلند کرنے پر ترجیح دی تھی۔ اور ایسی سادہ طرز زندگی کی بُنیاد ڈالی تھی جس سے زیادہ سادہ زندگی خیال میں آنی مشکل ہے۔ دُنیا بھر کے متمدن ممالک میں شاید کسی مُلک کا معیارِ زیست اِسا کم نہ ہوگا۔ جتنا ہندوستان کا ہے۔ جہاں اس وقت نسبتاً قحط سالی کے زمانہ میں بھی ایک غریب آدمی ڈھائی آنے روز پر زیست بسر کرسکتا ہے۔ برعکس اس کے انگلستان میں غریب آدمی کو بھی کم سے کم روپیہ بارہ آنہ روز کی ضرورت محض اپنی ذات کے لئے ہے اور وہ بھی قُوتِ لایموت کے واسطے۔ اسی طرح متوسط طبقہ کی زندگی کی ضروریات اور اخراجات میں بھی دونوں جگہ نمایاں تفاوت ہے۔ یہاں ایک متوسط طبقہ کا آدمی دس پندرہ روپیہ ماہوار میں تن تنہا اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔ مگر انگلستان یا دگر ممالک یورپ میں اس جماعت کے آدمی کو کم از کم پچاس ساٹھ روپیہ محض کھانے پینے کے لئے درکار ہیں۔ ان کا اسبابِ خانہ داری سینکڑوں روپے صرف کئے بغیر مہیا نہیں ہوسکتا اور محض ضروریات کے بعد اس کی تفریحات کے لئے جو ضروریات کے درجہ تک پہنچی جاتی ہیں ایک اور رقم درکار ہوتی ہے۔

ہندو بزرگوں نے جس وقت ہندوستان میں بے انتہا سادہ زندگی

کا بیج بویا تھا۔ اُس وقت غالباً جو دُور اندیشی اُن کے پیشِ نظر تھی وہ
یہ تھی کہ ہماری آیندہ نسلیں صدیوں بلکہ قرنوں تک قائم رہیں۔ اہلِ یورپ
نے اپنے جدید تمدن کی بنا جس اصول پر رکھی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری
آیندہ نسلیں جب تک رہیں۔ معزز۔ بلند حوصلہ اور خوش حال رہیں۔
گویا وہ آئیڈیل یا منتہائے خیال ہمارے سامنے ہیں ایک میں طولِ زندگی
مدِ نظر ہے۔ ایک میں لطفِ زندگی۔ متقدمین نے طولِ زندگی کو ہمیشہ
زیادہ ضروری ٹھہرایا ہے۔ ہماری عمارات کے در و دیوار اس کے شاہد
ہیں کہ بنانے والے اپنی طرف سے اس ارادہ سے تعمیر کرتے تھے
کہ عمارت ہو سکے تو ہمیشہ قائم رہے۔ یہ خصوصیت نہ صرف ہماری بڑی
اور مشہور عمارات میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ معمولی عمارات میں بھی کم و بیش
اس شوق کا شراغ ملتا ہے۔ برخلاف اس کے متاخرین کا طرزِ عمل اس کا
شاہد ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ موجودہ آرام و آسائش متیقن ہو جائے اور
جلد حاصل ہو جائے۔ دیرپا ہو یا۔ ہو۔ متقدمینِ ایشیا نے اپنے اس
معیارِ معیشت پست رکھ کر یہ بات پیدا کی کہ ہزاروں برس گزر گئے۔
بڑے بڑے انقلابات آئے۔ حکومتیں بنیں اور بگڑیں۔ مگر عالم اپنے
غریبانہ انداز پر برابر زندہ رہی اور اقوامِ ایشیا کی ہستی مٹنے نہ پائی سہ

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
دشمن ہے مدتوں سے دَورِ زماں ہمارا

اب بھی اگر اہلِ ہندوستان کو یہ منظور ہو کہ ہندی اقوام دیر تک
دُنیا میں موجود رہیں۔ مگر اِس سے کچھ بحث نہ ہو کہ قوی ہوں یا ضعیف۔
خوشحال ہوں یا خستہ حال۔ ترقی میں ہوں یا تنزل میں۔ حکمراں ہوں یا محکوم۔ تو

اس میں شک نہیں کہ انہیں پرانے بزرگوں کی دانائی سے سبق لینا چاہئے
اس لئے اپنے اس سیدھے سادے طریق پر قائم رہنا چاہئے۔ جس سے نہایت
غریبی میں بھی زندگی کے دن کاٹ دینے ممکن ہیں۔ لیکن اگر وہ دنیا میں دیر
تک رہنے بارے کو یکساں سمجھیں اور یہ خیال کریں کہ انجام ہر قوم
کا مثل ہر فرد بشر کے فنا ہے اور جب فنا یقینی ہے تو اس کا ہزار سال
کے بعد آنا یا دو ہزار برس کے بعد آنا چنداں فرق نہیں رکھتا لیکن
جو چیز قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ جو مدت زندگی کی قوم کے
حصہ میں آئے وہ عزت اور آبرو اور ترقی اور آرام کی ہو۔ تو انہیں وہ
ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جو دیگر ترقی یافتہ قومیں اختیار کر رہی ہیں
اور ان میں ایک ذریعہ معیارِ زیست کا بڑھانا اور اس کے ساتھ
وسائلِ معاش کو ترقی دینا ہے۔

اس مضمون کے آغاز میں لکھا گیا ہے کہ ملک کے اہل الرائے
اصحاب نے اس مسئلہ کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ یہ الزام فقط اس بارے
میں ہی عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ بیشتر معاملات میں اہل ملک کی یہی عادت
ہے۔ اتفاقات پر سارا انحصار ہے۔ اگر بیرونی اور غیر ارادی
اثرات کسی طرف دھکیلے لئے جاتے ہیں تو اسی طرف جا رہے ہیں۔ اگر
ان اثرات میں کوئی انقطاع کی آ گئی تو حالتِ سکون پیدا ہو گئی۔ اگر
حالتِ سکون پھر اتفاق سے مبدل بہ حرکت ہو گئی تو مضائقہ نہیں۔ اس
عادت کی بدولت مفید چیزوں کے نفع سے ہم ایک حد تک محروم رہتے
ہیں اور مضر چیزوں کے ضرر سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ جس رفتار
سے اور جس طرح ملک کے بعض حصوں میں اور اہل ملک کے بعض طبقوں میں

معیارِ زیست بلند ہوتا جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ہی نسبت سے سارے ملک کے معیار میں ترقی ہو۔ اس سے بجائے فائدہ کے نقصان متصور ہے صرف ایک محدود طبقہ کی عادات بدلتی ہیں۔ اور ضروریات بڑھتی ہیں۔ لوگ وہ اپنی لبساط سے بڑھکر صرف کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو مشکلات میں پھنساتا ہے۔ مگر اپنے سے نیچے کے طبقے کو نفع نہیں پہنچا سکتا۔ علاوہ بریں جہاں جہاں معیار میں فرق آ رہا ہے۔ اس تبدیلی میں ایک خاص نقص ہے۔ یعنے وہ تغیر ساری طرز ماند و بود پر یکساں اثر نہیں ڈالتا۔ بلکہ صرف ایک حصہ معیشت کو بدل کر باقی عموماً اسی طرح کا اسی طرح چھوڑ جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص یورپ والوں کے اعلیٰ معیار زیست کی تقلید کے شوق میں انگریزی لباس فوراً اختیار کر لیتا ہے۔ مگر مکان کی صفائی۔ غذا کی درستی اور صحت کی احتیاط میں اس معیار کی پیروی نہیں کرتا۔ ایسے شخص کو بہ بتادینا چاہئے کہ اس نے معیارِ زیست کی ترقی غلط راستے سے شروع کی ہے۔ زیادہ مفید طریق یہ ہوتا کہ وہ مکان کی صفائی اور عمدگی کو مقدم رکھتا۔ جس پر اُسکی اور اس کے عیال و اطفال کی تندرستی کا مدار ہے۔ اس کے بعد اپنے مقدور کے موافق غذا میں اصلاح کرتا۔ اور پھر لباس تک نوبت آتی۔ یہاں ہر ایک چیز بے قاعدہ طور پر کی جاتی ہے۔ اور اس طرح جو نفع اُس کو حاصل ہونا ممکن ہوتا ہے۔ اِس سے بھی ہم بسا اوقات محروم رہ جاتے ہیں۔

اب وہ وقت آگیا ہے کہ اہلِ ملک معیارِ زیست پر باقاعدہ غور کرکے یہ طے کرلیں۔ کہ اسے آئندہ گھٹانا ہے یا بڑھانا۔ اور جو فیصلہ ہو اس کے مطابق کس صورت سے عمل کریں کہ سب طبقات ترتیب

قریب یکساں کسی قرارداد سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہماری رائے میں بزرگان
قدیم کی دانشمندی جس سے انہوں نے معیارِ زیست پست رکھ کر ہندی
اقوام کو قرنہائے دراز تک زندہ رکھا۔ اپنا مقصد پورا کر چکی۔ اب نیا
دور شروع ہوا ہے۔ اور کسی قوم کا خستہ حالی میں زندہ رہنا زندگی میں
شمار نہیں ہوتا۔ اب زندگی نام ہے ترقی و اقبال کا۔ محنت اور ہمت
کا۔ اسی منتہائے خیال کو سامنے رکھ کر اہلِ ہند کے لئے لازم
ہے کہ وہ اپنے معیارِ زیست کو بلند کریں۔ اس میں شک
نہیں کہ ابتدا میں انہیں بہت سی مشکلات پیش آئینگی۔ اُن کی
محنت اور خدمت کا معاوضہ ان کے پہلے طرزِ معیشت کے
تخمینہ پر مبنی ہے اور کچھ عرصہ تک وہ جس صیغہ میں کام کرینگے
انہیں تنخواہ یا معاوضۂ خدمت ایسے پیمانہ پر ملے گا۔ جو اُن کی نئی ضروریات
کے لئے کافی نہ ہوگا۔ لیکن جب بہ علم طور پر معلوم ہو جائے گا
کہ اہلِ ہند کا معیارِ زیست بھی دیگر متمدن اقوام کے قریب
قریب پہنچ گیا ہے۔ تو لامحالہ اُن کے معاوضۂ خدمت میں بھی
متناسب ترقی ہوگی۔ اور وہ خود بھی نئے نئے ذرائع آمدنی زیادہ
کرنے کے سوچیں گے۔ اور استعمال کریں گے۔

معیارِ زیست بلند کرنے کی کوشش اگر باضابطہ طور
پر شروع ہو تو ایک دو باتوں سے نظرِ احتیاط حسند لازم ہوگا
ایک تو یہ کہ عجلت سے کام نہ لیا جائے۔ جو ترقی ہو بتدریج۔
ملک و قوم کے حالات کو ہر وقت مدِ نظر رکھتے ہوئے تجویز
کی جائے۔ بہت سے حالات ایسے ہیں۔ جن پر ہمارا اپنا کچھ قابو

نہیں۔ اور وہ ہمارے معیار کی ترقی میں سدِّ راہ ہو سکتے ہیں۔
اگر ان کا لحاظ کئے بغیر ہم قدم بڑھائیں گے تو ٹھوکریں کھانی
پڑیں گی۔ دوسرے یہ کہ ترقی خاص طبقوں تک محدود نہ رہنے
دیں۔ بلکہ اوّل غربا کا معیارِ زیست کسی نہ کسی حد تک
بلند کرنے کی سعی کریں۔ کیونکہ وہ حد سے زیادہ پست ہے۔ اور
تیسرے معیارِ زیست کی ترقی میں اُن عناصر کو دخل نہ دیں۔
جنہوں نے بلا ضرورت یورپ میں معیارِ زیست کو بڑھا رکھا
ہے اور بجائے نفع کے یورپ کے تمدن کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔
مثلاً یورپ میں ہر معمولی شخص دن بھر میں ایک معقول تعداد
سگرٹ یا سگار کی استعمال کرتا ہے اور ایک خاصی مقدار شراب کی
اس کی غذا کا جزو ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس کے مصارفِ
روزمرہ کو بہت بڑھاتی ہیں۔ حالانکہ اگر وہ ان کے بغیر رہتا
تو اس کے لئے نہ صرف مالی طور پر بلکہ اخلاقی طور پر بہتر ہوتا۔ ہم
یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان میں معیارِ زیست اس معنی میں
بلند ہو۔ کہ یہ اور اس قسم کی اور دیوالہ نکالنے والی اشیاء ضروریاتِ
زندگی میں داخل ہو جائیں۔ بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ معیارِ زیست
کے وہ اجزا جن سے زندگی کی آسائش بڑھتی ہے۔ جن سے صحت کو
مدد ملتی ہے اور جن سے دولت کی راہیں کھلتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ملک اور
اہل ملک میں رواج پا جائیں +

عبدالقادر

حکم سولون

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

کسی نے سولون سے پوچھا کہ تم نے ماں باپ کے قتل کی سزا کیوں نہیں مقرر کی [illegible] کہ میرے نزدیک ایسا قبیح کام کبھی کسی سے سرزد نہ ہوگا۔

اپنے دوستوں سے وہ ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ جس شخص کی عمر ستر برس کی ہو گئی اسکو موت سے ڈرنا چاہئے نہ تکالیفِ حیات کی شکایت کرنی چاہئے۔

اس کا قول ہے کہ بادشاہوں کے ہمنشیں بمنزلۂ آلاتِ لعب مثل مہرۂ شطرنج کے ہوتے ہیں۔ کہ بادشاہ جس طرح چاہتا ہے ان سے کھیلتا ہے۔ مقربِ شاہی کا مقصد محبوب بننا نہیں ہوتا بلکہ نفع اٹھانا۔ عقل سے زیادہ انسان کا کوئی مالک نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ جو کچھ کرے اس کے اشارے کے موافق کرے۔ ثقہ شخص کو چاہئے کہ مخلوق کی اصلاح کا اپنی قسم پوری کرنے سے زیادہ خیال رکھے۔ انسان کو چاہئے کہ کسی شخص سے دوستی کرنے سے پہلے اس کے متعلق اچھی طرح غور وفکر کرے۔ کیونکہ دوستی کے بعد دوستی کا جاتا رہنا سخت [illegible]۔ نقصان رساں کے نقصان کا بیخ رفع کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ اس کے نقصان کو بھول جائے۔ کسی کو حاکم بنانے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ کسی غیر کی اطاعت کرتا ہے یا نہیں۔ کذب تمام دنیا کا دشمن ہے۔ انسان کو چاہئے کہ عبادتِ عملی اور [illegible] کی صحبت سے پرہیز کرے۔

[illegible]

چھپاتی ہے۔ اور اُس پر قابض ہوا چاہتا ہے۔ سولن نے نہایت کوشش کی وہ
اپنی مخاصمت سے باز آجائے۔ اور لوگوں کو مجمع عام میں بلایا اور خود بھی تمام
ہتھیار لگا کر اُن میں شامل ہوا اور بیزسترانس کی کارروائیوں سے سب کو
مطلع کیا اور کہنے لگا کہ اے ایتھنز کے باشندو میں اُن لوگوں سے
زیادہ عقل رکھتا ہوں جو بیزسترات کے اِس عمل میں کوئی برائی نہیں دیکھتے۔
میں اُن لوگوں سے زیادہ شجاع ہوں جو بیزسترات سے واقف ہیں۔ مگر اُن
لوگوں کا خوف اور قلتِ شجاعت اُن کو لڑنے سے باز رکھ رہا ہے۔ مگر میں مستعد
ہوں کہ میں تمہارا سپہ سالار بنوں اور حمایتِ آزادی وطن کے لئے نہایت خوشی
کے ساتھ لڑائی شروع کروں۔"
یہ تقریر سُن کر جو لوگ بیزسترات کے حامی تھے کہنے لگے کہ سولن
دیوانہ ہوگیا ہے۔ بیزسترات نے چند روز صبر کرکے خود ہی اپنے کچھ زخم لگائے
اور لوگوں سے کہا کہ ان ہی خون کے بھیگے ہوئے کپڑوں میں اُسکو لپیٹ
کر اور ایک گاڑی پر ڈال کر باہر لے چلیں اور پھر یہ ظاہر کیا کہ میرے دشمنوں
نے سخت بے ایمانی کرکے مجھے زخمی کیا اور اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ یہ دیکھ کر
لوگوں کو غیرت آئی اور انھوں نے بیزسترات کی حمایت میں ہتھیار اُٹھائے
سولن نے اُس سے کہا کہ میں خوب سمجھتا ہوں کہ تو نے خود ہی یہ حیلہ کیا ہے۔
تاکہ میرے دشمن تجھے اِس حال میں دیکھکر تجھ پر رحم کریں۔ اور تیرے شہر والے
تجھکو زخمی دیکھ کر طیش میں آجائیں اور سب تیری حمایت کا بیڑا اُٹھالیں۔
غرض بیزسترات کی یہ ترکیب کارگر ہوئی اور لوگ فوراً اس کے حامی
ہوگئے۔ سولن نے مجمع عام میں لوگوں کو اس خطرہ سے آگاہ کیا جو ملک پر
پڑنے والا تھا۔ لیکن لوگوں پر اُس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ اُسیوقت چار سو آدمی

سولون کی جماعت سے نکلکر پیزستراتش کے ساتھ شامل ہوگئے۔ شہر ایتھنز
کے رہنے والے یہ واقعہ دیکھکر سخت حیرت میں رہ گئے۔ اور ہر شخص نے
جدھر کو منہ اٹھا بھاگ جانے کا قصد کر لیا۔ باوجود اس کے سولون کی ہمت
نہیں ٹوٹی۔ اور بعد اس کے کہ لوگوں کی حماقت اور نامردی دیکھ لی۔ ان لوگوں
سے کہا کہ اس مصیبت کے پڑنے سے پہلے اس کا ٹال دینا تمہارے لئے
بہت ہی آسان تھا۔ مگر اب مصیبت آ پڑنے کے بعد تمہارا فرض اس میں ہے کہ
اسکو بیخ و بُنیاد ہی سے اُکھاڑ دو۔" لیکن ان باتوں اس قسم کے اور الفاظ نے
لوگوں کے دلوں پر کوئی اثر نہ کیا۔ اور جو کچھ وہ ارادہ کر چکے تھے اُس سے
باز نہ آئے تو سولون اپنے مکان پر گیا اور وہاں سے تمام ہتھیار لگا کر
اس مکان کے دروازہ پر پہنچا کہ جہاں اراکین مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور
بلند آواز میں کہا کہ اے وطن عزیز! واللہ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا میں نے
اپنے قول اور فعل کے ساتھ تیری مدد کی۔ میں اس پر خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے
حمایت قانون اور حمایت آزادی وطن میں ایسا کوئی کام نہیں ہے کہ نہ کیا ہو۔
اے وطن عزیز! اب میں تجھ سے جدا ہوتا ہوں اور تیری مفارقت ابدی صرف
اس لئے گوارا کرتا ہوں کہ میں نے ہی پہلے اس حاکم ظالم کی عداوت ظاہر کی
اور تمام لوگوں نے اس پر اتفاق کر لیا کہ اس ظالم کو اپنا حاکم بنا لیں لیکن سولون
سے یہ کبھی نہ ہوگا کہ وہ پیزستراتش کا مطیع ہو کر رہے۔ اور اس قانون کی
خلاف ورزی ہوتی دیکھے جس کی حفاظت پر اہل ایتھنز حلف اٹھا چکے
ہیں۔ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ سولون برضا و رغبت خود وطن عزیز کو چھوڑ
دے۔ ایتھنز میں بے عزتی کی زندگی گذارنے سے یہی بہتر ہوگا۔" سولون
یہ کہتے ہی فوراً مصر کی طرف روانہ ہوگیا اور بہت مدت تک شاہ امیسس کے دربار میں

حقیقت یہ ہے کہ بزسترات کو یونان پر جس قدر کامل تسلط تھا وہ اُس کے شہر کے لوگوں کو یک وطن کرنے سے بزسترات کو رنج ہُوا اور حسب ذیل ایک خط نہایت ادب کے ساتھ اس کو لکھ کر پھر ایتھنز میں بلایا۔

تمہیں معلوم ہو کہ میں پہلا ہی شخص نہیں ہُوں کہ یونان کے شہروں پر قابض ہُوا ہوں۔ میں نے کوئی کام خلافِ قانون یا خلافِ مذہب نہیں کیا۔ کیونکہ میں شاہ قصوص کی اولاد میں سے ہُوں کہ جس نے یونانیوں سے عہد لیا تھا کہ سلطنت کو اُسکی اولاد میں باقی رکھیں۔ میں نے تمہارے احکام کے قیام و حفاظت کو مدنظر رکھا ہے اور صرف خراج وصول کرنے تک کفایت کی ہے اور اُس میں کسی طرح کی زیادتی نہیں کی۔ میں نے اپنی ذات کے لئے کوئی بات سوا اس کے کہ جو میرے منصب کے لئے ضروری تھی۔ ایسی اختیار نہیں کی کہ جو مجھے عوام سے تمیز کرے۔ مجھے تم سے کوئی کسی طرح کی عداوت نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے تعریریں کی ہیں وُہ تم نے اپنے وطن عزیز کی محبت سے مجبور ہو کر کی ہیں ورنہ تم کو مجھ سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ نیز تم کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کن خیالات کا آدمی ہوں۔ اگر تم کو یہ معلوم ہوتا تو ضرور تھا کہ تم مجھ سے راضی رہتے۔ بہتر ہو کہ اب تم نہایت اطمینان کے ساتھ واپس چلے آؤ۔ میری تحریر کا اعتبار کرو۔ تمہارے جیسے حکیم کو مناسب نہیں ہے کہ وُہ بزسترات جیسے آدمی سے ڈرے۔ کیونکہ میں اُن لوگوں کو ضرر پہنچانے پر راضی نہ ہُوا کہ جو عمر بھر میرے دشمن رہے ہیں۔ اس صُورت میں مجھ سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ میں دوستوں کو کوئی نقصان پہنچاؤں۔ میرا ہمیشہ سے یہ اعتقاد ہے کہ تم میرے دوستوں میں سب سے زیادہ عزیز ہو۔ تمکو میری طرف سے بالکل اطمینان کرنا چاہیئے۔ کیونکہ میں جانتا ہُوں کہ تم نے نہ کبھی کوئی جرم کیا ہے اور نہ تم سے کبھی خیانت سرزد ہُوئی ہے۔ اگر

سبب یہاں نہ آنے میں کوئی اور وجہ مانع ہوتی ہو تو اس طرف سے بھی تم مطمئن رہو۔ اور جس وقت چاہو اور جہاں چاہو چلے آؤ۔ کہ یہ امر میرے غایت سرور کا باعث ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری غربت کی وجہ میں نہ بنوں بلکہ کوئی اور ہی سبب ہو۔

سولن نے اس خط کا یوں جواب دیا کہ۔

مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی مجھے باوجود تمہاری زیادتی کے میں تمہارا دوست رہا ہوں۔ جو لوگ کہ زیادتی اور بغاوت کے دشمن ہیں اُن ہی میں سے ایک میں بھی ہوں۔ گو تمام دنیا انسانوں سے خالی کر دی جائے۔ اور عقلیں سلب کر لی جائیں۔ تب بھی اس میں شک نہیں ہے کہ ملک ایتھنز کے لئے مناسب یہی ہے کہ اُس پر کئی حاکم ہوں۔ اور مشورے سے کام لیا جائے۔ ضرور ہے کہ ایک حاکم سے جو فعل مختار ہو۔ ترکیب حکومت زیادہ نفع رساں ہے۔ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ تم اور زیادتی کرنے والوں میں سے بہتر ہو۔ لیکن میرا حال ہے کہ بعد اس کے کہ میں نے قوانین و حدود مرتب کرے اور جو امانت لوگوں کو میں نے عطا کی تھی۔ اس کو تم نے سلب کر لیا۔ میرا شہر ایتھنز میں واپس آنا مناسب نہیں ہے۔ اگر میں واپس آجاؤں تو لوگوں کا حق ہے کہ مجھے ملامت کریں اور یہ خیال کریں کہ میں تمہارے ظلم پر اس وقت راضی ہو گیا کہ از خود واپس چلا آیا۔

نیز حکیم سولن نے ایک اور خط اپیمینڈیس کو لکھا کہ

تمہارے مرتبہ قوانین سے ملک کو کوئی بڑا فائدہ نہ ہوا۔ اور اس کے فتح ہونے سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہو گئے۔ گر مرقدہ متعلقین سے نہیں ہو سکتا کہ ملک کو نفع پہنچے۔ جن لوگوں کو نفع پہنچے ہیں وہ اپنے حسب خواہش علما کو

گھیٹے پھرتے ہیں۔ اگر فرض کیا جائے کہ اُن کی نیت نیک ہے۔ اور میرے
قوانین سے ملک کو نقصان ہی پہنچا۔ تب بھی اس میں شک نہیں رہتا کہ میرے مخالفین
نے جمہوریت اور آزادی کو باطل کر دیا۔ اور پیزستراتش کے غلبہ کو روکا۔ اس کا
نتیجہ جو کچھ ہونے والا تھا۔ مَیں اسکو پہلے ہی لوگوں پر ظاہر کر چکا تھا۔ مگر کسی نے میرا
کہا صحیح نہ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ پیزستراتش جو شہر ایتھنز بھر میں سب سے زیادہ
لالچی ہے۔ مجھ سے کہیں اچھا ہے۔ وہ اچھا ہے ور مَیں کھوٹا ہوں۔ مَیں نے
اُن پر بہ اصرار پیش کیا کہ وہ مجھ کو رئیس شہر مانیں۔ تاکہ جو کچھ نقصان پہنچنے والا
ہو اُسکا مَیں تدارک کرتا ہوں۔" اس پر مجھ کو دیوانہ کہا گیا اور پیزستراتش کو اپنا حامی و
محافظ بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شہر پر قابض ہو گیا۔ اور رعایا کو لوٹ لیا۔ مَیں نے ان ہی
وجوہ سے شہر کو چھوڑ کر ہجرت اختیار کر لی"۔

اکرسیوس شاہ لدیاس نے حکم دیا کہ جو یونانی ایشیا میں رہتے ہیں جزیہ ادا کریں
اکثر بڑے بڑے آدمی بھاگ کر اس بادشاہ کی دار السلطنت شہر ساردس میں چلے
آئے۔ اس زمانہ میں یہ شہر آباد اور متمول تھا۔ معزّزین و امرا یہاں رہتے تھے۔ باہر سے
جتنے لوگ آتے تھے وہ حکیم سولن کی تعریف کرتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ بھی اس
حکیم سے ملنے کا مشتاق ہوا اور نہایت اشتیاق ظاہر کر کے بُلا بھیجا۔ سولن نے
بادشاہ کے نامہ کے جواب میں لکھا کہ آپ کا شوق و محبت اور میری عزت و منزلت
جو آپ کے دل میں ہے ظاہر ہوئی۔ خدا شاہد ہے کہ جب سے میں اپنے وطن سے
نکلا ہوں کسی آزاد ملک میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ کی
سلطنت میں آکر رہوں۔ اور شہر ایتھنز کی اُس وقت تک صورت نہ دیکھوں کہ
جب تک پیزستراتش اُس پر قابض ہے۔ مگر میری حالتِ معیشت اسوقت یہ ہے کہ
عوام الناس میں اور مجھ میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ اگر مَیں آپ کے پاس آیا تو یہ

حاصل نہ تھی۔ مگر خیر مجھے آپ سے ملنا اور چند روز آپ کے پاس آ کر رہنا ضرور تھا۔
آخر اکرسیوس کے اصرار اور اظہار اشتیاق پر سولون شہر سارڈیس کی طرف
روانہ ہوا اور جب سرحد لدیا میں داخل ہوا تو اعیان و ارکان سلطنت نے اس
تزک و احتشام کے ساتھ اس کا استقبال کیا کہ سولون جس کو دیکھتا تھا اس کو
خود بادشاہ ہی سمجھتا تھا۔ بادشاہ نے حکیم کی خاطر سے اور بھی زیادہ تجمل و احتشام
کیا تھا۔ اور خود بہترین لباس و جواہرات زیب تن کر کے سولون کو اپنے سامنے
بلوایا۔ لیکن اس حالت سے حکیم پر کوئی اثر نہ پڑا اور نہ وہ مرعوب ہوا۔ اکرسیوس نے
اس سے دریافت کیا کہ اے مہمان عزیز! میں جانتا ہوں کہ تمہاری حکمت دور
دور تک مشہور ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے سفر بھی بہت سے کئے ہیں۔ سچ
کہنا کہ کسی کے پاس میرے جیسے کپڑے یا جواہرات تم نے دیکھے ہیں؟ سولون
نے کہا کہ "ہاں بہت سی ایسی خوبصورت چڑیوں اور خاص کر موروں کے پاس ایسے لباس
ہیں کہ جو تم سے کہیں اچھے ہیں۔ کیونکہ وہ قدرت کاملہ ہی نے انکو عطا فرمائے
ہیں۔ اور کسی ظاہری تکلف کے محتاج نہیں ہیں"۔ بادشاہ یہ فی البدیہہ جواب
سنکر حیران رہ گیا اور اپنے اہلکاروں کو حکم دیا کہ حکیم سولون کو تمام خزانے
اور توشہ خانے دکھلا کر پھر حاضر لائیں۔ اس حکم کی تعمیل کے بعد حکیم سے بادشاہ
نے پوچھا کہ سچ کہنا کہ مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی خوش نصیب تمہاری نظر سے گزرا ہے؟"
سولون نے جواب دیا کہ "ہاں طیلوس باشندہ اتھنز مجھ سے زیادہ خوش نصیب تھا
اس نے تمام عمر اس کوشش میں صرف کر دی کہ شہر کو حکومت جمہوری مل جائے۔ دو بیٹے
اور سامان کے گزارے کے قابل مال چھوڑ مرا۔ مرتے وقت اسکو یہ اطمینان تھا کہ
میں نصرت وطن میں شمشیر بکف مرا ہوں۔ اتھنز والوں نے بھی اس کی خوب قدر کی
اور جس جگہ وہ مرا تھا اس جگہ بہت بڑی قبر بنائی۔ اور اس کے جنازے کو نہایت

تب وقت کے ساتھ اٹھایا گیا"

یہ سنکر اکرسیوس اور بھی متعجب ہوا۔ اور یہ سوچا کہ سولون فی الحقیقت بیوقوف ہے۔ بادشاہ نے پھر پوچھا کہ اچھا طیلوس کے بعد پھر کون شخص زیادہ خوش نصیب تھا؟ سولون نے کہا کہ زمانہ سابق میں دو بھائی تھے ایک کا نام اکلیوبیس تھا۔ اور دوسرے کا بیطون دونوں نہایت شجاع تھے اور اکثر لڑائیوں میں اُن سے مدد لیجایا کرتی تھی۔ تمام لوگ انکو عزیز رکھتے تھے۔ اُن کی والدہ بُت خانۂ یونو کی قسیسہ تھی۔ وہ دونوں اپنی ماں کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اور ماں بھی انکو بہت پیار کرتی تھی۔ ایک مرتبہ ماں نے بتخانہ پر کچھ قربانی چڑھانے کا ارادہ کیا۔ اور ایک گاڑی پر سوار ہوگئی۔ اس کے دونوں بیٹوں نے بجائے بیل لگانے کے خود ہی گاڑی کھینچ کر اُس کو بتخانہ تک پہنچا دیا۔ تمام لوگوں نے یہ دیکھکر اُن کی بڑی تعریف کی اور بہت دعائیں دیں۔ اُن کی ماں بہت ہی خوش ہوئی۔ اور بُت یونو سے دعا کی کہ تمام صلاح و فلاح ان دونوں بیٹوں کو دے۔ قربانی اور کھانے پینے سے فارغ ہوکر سب اپنے مکان کو واپس آگئے دونوں بیٹے رات کو تندرست سوئے۔ مگر صبح کو مُردہ اُٹھے۔

اکرسیوس یہ قصہ سنکر غصہ ضبط نہ کر سکا۔ اور سختی کے ساتھ کہا کہ تم مجھ کو خوش نصیبوں کی ذیل میں بھی شمار نہیں کرتے؟ سولون نے جواب دیا کہ تم بھی نہایت خوش نصیب ہو۔ اور تمہاری رعایا اکثر بادشاہوں کی رعایا سے زیادہ خوش نصیب ہے لیکن زمانہ تغیر پذیر واقع ہوا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو کہ دنیا میں بڑے بڑے حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ شب و روز حوادث پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کو خبر تک نہیں ہوتی کہ جنگ سے پہلے ملک کا انتظام کر رکھے۔

یہ تقریر سنکر بادشاہ کو تاب نہ رہی اور فوراً سولون کو اپنے سامنے سے نکلوا دیا اور پھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھی۔

حکیم ایزوپ۔ معروف بہ لقمان حکیم۔ اسوقت شاہ اکریسوس سے ملنے کے لئے آرہا تھا تھا۔ سارڈیس میں سولون اس سے ملا اور بادشاہ کے سلوک کا حال بیان کیا۔ ایزوپ چونکہ سولون کے علم و فضل سے واقف تھا اس لئے اسکو سخت رنج ہوا۔ اور کہا کہ اول تو بادشاہوں کے تقرب سے بچنا چاہیئے اور اگر اس سے چارہ ہی نہ ہو تو اُن کے حضور میں ایسی بات کرنی چاہئیے جو انکو ناگوار ہو۔ سولون نے کہا کہ بیشک اول تو بادشاہوں کے تقرب سے بچنا چاہئیے اور اگر یہ حاصل ہی ہو جائے تو انسان کو چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے انکو نصیحت کرتا رہے اور ہمیشہ حق بات کہے۔

کہتے ہیں کہ قروس بادشاہ عجم نے شاہ اکریسوس کے نانا استیاگس کو شکست دیکر اس کے تمام ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اکریسوس کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی اور اہلِ عجم سے اپنے نانا کا بدلا لینے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک اس کے پاس سب سے زیادہ دولت و حشمت تھی۔ اور اس کی رعایا تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ شجاع تھی۔ لیکن بدقسمتی سے شکست فاش پائی۔ اور شہر سارڈیس میں بھاگ کر آ گیا۔ اہل عجم نے چودہ روز کے محاصرہ کے بعد اکریسوس کو زیر کر لیا۔ اور مقید بطوق و زنجیر شاہ قروس کے حضور میں پیش کیا۔ شاہ مظفر و منصور نے حکم دیا کہ بدنصیب قیدی کو ایک تختہ پر مضبوط باندھ دیا جائے اور اس کے گرد بیس لکڑیاں چنکر ہمارے سامنے آگ لگا دی جائے۔ اکریسوس اس حالت رنج والم میں ان باتوں پر غور کر رہا تھا کہ جو سولون نے اس سے کہی تھیں۔ لوگ اس کے جلانے کی فکر میں تھے اور اس نے نہایت تاسف کے ساتھ تین مرتبہ

آواز بلند سولون کا نام لیا۔ قیروس یہ سنکر حیران ہوا اور اس سے پوچھا کہ یہ کس کا نام ہے! آیا اس کے دیوتاؤں میں سے کسی کا نام تو نہیں ہے کہ جس سے خلاصی کی اُمید ہو؟ اکرسیوس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن جب اس کو بہت تنگ کیا تو اس نے کہا کہ "یہ ایک ایسے شخص کا نام ہے کہ جس کی صحبت بادشاہوں کو غنیمت سمجھنی چاہیئے۔ اور جس کی نصیحتوں کو ہمیشہ سننا اور عمل کرنا چاہیئے۔ خزانے اور دفینے بادشاہوں کے لئے اتنے کار آمد نہیں ہیں کہ جتنی سولون اور اس جیسے آدمیوں کی باتیں"۔ قیروس نے کہا کہ بہت جلد اس کا مفصل حال بیان کر۔ اکرسیوس نے کہا کہ "وہ شخص یونان کے حکمائیں سب سے بڑا ہے۔ میں نے اُسکو بلا کر چاہا تھا کہ اسے تمام اُمور میں اس سے مشورہ لیا کروں۔ مگر اُس نے پہلی ہی صحبت میں نہایت بے پروائی کے ساتھ یہ بیان کیا کہ یہ دُنیا اور اس کی زندگی باطل اور زائل ہونے والی چیز ہے مجھے دوسری زندگی کی فکر کرنی چاہیئے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ انسان کو اپنی خوش نصیبی پر کبھی غرہ نہ ہونا چاہیئے اور نہ اُس پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ کیونکہ آدمی پر بے انتہا مصائب پڑتے ہیں۔ اُس وقت تو میں نے سولون کو اپنے سامنے سے نکلوا دیا۔ مگر آج اُس کا ایک ایک حرف صحیح معلوم ہوتا ہے"۔

اثنائے کلام میں آگ بھڑک اُٹھی تھی اور قریب تھا کہ اکرسیوس تک پہنچ جائے کہ قیروس کو اُس کے قصہ اور حالت پر رحم آیا۔ اور ڈرا کہ کہیں کل کو وہ بھی اکرسیوس کی سی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ فوراً آگ بجھانے اور اکرسیوس کو رہا کر دینے کا حکم دیا۔ اور اُس پر بڑے احسانات کئے اور اپنا ایسا معتمد بنا لیا کہ ہر بات میں اس سے مشورہ لینے لگا۔

حکیم سولون شاہ اکرسیوس سے رخصت ہو کر شہر تیلیقیا کی طرف متوجہ ہوا

اور وہاں اپنے ہی نام پر ایک بہت بڑا شہر آباد کیا۔ یہاں اسکو اطلاع پہنچی کہ پزستراتث اب بھی بدستور اتیھنز پر قابض ہے۔ بازار ظلم گرم کر رکھا ہے۔ رعایا اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے سخت نادم ہے۔ یہ سنکر سولون نے ان لوگوں کو لکھا کہ :-

"تم لوگوں نے اپنی بدقسمتی کا پہلے اندازہ نہیں لگایا تھا جس بلا میں تم اس وقت گرفتار ہو۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تم نے اس شخص کی قدر و تصدیق نہیں کی جو تم سے زیادہ سردار تھا اور تم سے زیادہ وطن کے فواید کی تدبیر کر سکتا تھا۔ اس کی سزا ہے کہ تم نے ایسے شخص کا اعتبار کر لیا جو تم کو سراسر دھوکا دے رہا تھا اس نے اپنے آپ کو بطور تمہارے احسان کے پیش کیا اور تم نے اسکو تسلیم کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمہارے وطن پر قابض ہو گیا۔ اور تم کو عمر بھر کے لئے غلام بنا لیا"

ریاست کورانت نے سولون کو اپنے سامنے سوال دولت پیش کئے اور اسکو ہر امر میں اپنا مشیر بنانا چاہا۔ حکیم سولون نے اس عہدہ سے انکار کیا اور لکھ بھیجا کہ -

"اگر میں تم کو ان دشمنوں سے بچا بھی دوں کہ جنہوں نے تم کو مغلوب کر رکھا ہے اور انکو قتل بھی کر دوں تب بھی تمہاری حالت درست نہ ہوگی۔ کیونکہ جو شخص لوگوں کو تمہارا دشمن بنا دے اسکو کوئی اور شر اٹھا دینے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ یاد رکھو کہ دشمن تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل تو وہ جنکو تم سے ذاتی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ دوئم وہ جنکے نفس تمہارے منصفانہ افعال کو باسانی قبول نہیں کرتے۔ سوئم وہ جو تمہاری عداوت میں اپنے وطن کا بہت بڑا نفع سمجھیں۔ آخر الذکر قسم کے دشمن سے زیادہ ڈرنا چاہیئے۔ اور

اس سے حسن سلوک کرنا چاہئے ۔ ورنہ سلطنت کو بالکل چھوڑ دینا چاہئے ۔ اگر اس پر صبر نہ ہو سکے تو غیر ممالک کے باشندوں کی فوج اپنی ذات کے لئے قائم کر لینی چاہئے کہ وہ تمہارے ملک کی حفاظت کریں تمہارے مددگار بنیں ۔ اور تمہیں کسی طرف کا خوف باقی نہ رہے ۔ اسکے بعد یہ ضرور ہے کہ تم ان لوگوں میں کسی کو اپنے ملک سے باہر نہ نکالو۔

اسکے بعد حکیم سولون جزیرہ قبرص چلا گیا ۔ رئیس شہر اپیا کے ساتھ جا ٹھہرا ۔ یہ شہر اس زمانہ میں ایک ایسے مقام پر آباد تھا کہ جہاں کھیتی نہ ہو سکتی تھی ۔ سولون نے رئیس کو رائے دی کہ اگر دوسرے مقام پر شہر آباد کیا ۔ تو وہ اس سے کہیں بہتر ہوگا ۔ چنانچہ حکیم سولون کی پسند کے موافق ایک نہایت سرسبز قطعہ انتخاب کیا گیا ۔ اور اسی ذرخیز زمین میں اہل شہر نے حکیم کے اظہار شکر کے لئے اس شہر کا نام اس کے نام پر سولوس رکھا ۔

سولون تمام عمر لطف زندگی اٹھاتا رہا ۔ خوش ذائقہ کھانوں کو بہت پسند کرتا تھا ۔ علم موسیقی اسے بہت عزیز تھا اور اس سے لطف اٹھاتا تھا ۔ اشعار اور بے ٹھکانے نقلیں کہ جن سے کوئی خاص فائدہ متصور نہ ہو اسے ناپسند تھے ۔ کہا کرتا تھا کہ یہ جمہور کو نقصان پہنچاتے ہیں ۔ نیز یہ اکثر ایسے فتنہ و فساد کے بانی ہوتے ہیں کہ جن کا فرو کرنا مشکل پڑ جاتا ہے ۔ سولون کا ایتھنز میں چونکہ بہت اشتہار تھا ۔ ایک شخص تھیسپس نامی نے بعض قصے اس کے نام پر لکھکر پڑھنے شروع کئے جس سے رعایائے شہر نے نہایت لطف اٹھایا ۔ سولون کو خبر پہنچی تو اس نے کہا کہ تمہیں اس جھوٹ بولنے سے شرم نہیں آتی ۔ تھیسپس نے حکیم کے الفاظ میں جواب دیا کہ اس سے کسی فتنہ کے اٹھنے کی امید نہیں ہے ۔ کیونکہ ان لفظوں میں ہزل ہی ہزل ہے " حکیم سولون نے غصہ کے ساتھ اپنا عصا زمین پر مار کر کہا کہ ابھی تم ہزلیات میں جھوٹ بولتے ہو ۔ یہ عادت پختہ ہو گئی تو سنجیدہ امور میں جھوٹ بولو گے یہاں تک کہ تہمات ملکی میں جھوٹ بولنے لگو گے ۔ آخر یہ فتنہ نہیں تو کیا ہے ؟ "

بعض کا خیال ہے کہ محکمہ شوریٰ حکیم سولون ہی کی ایجاد ہے کہ جس میں بڑے منصب دار اور اُمراء شامل کئے جاتے تھے۔

کسی نے سولون سے پوچھا کہ بہترین سلطنت و مملکت کونسی ہے کہ جسکو غیر ممالک پر ترجیح دی جا سکے۔ جواب دیا کہ بہترین سلطنت وہ ہے کہ جس کی رعایا ذلیل اور مظلوم نہ ہو۔ اور اگر وہ سلطنت کسی غیر سلطنت کی رعایا کو ذلیل و مظلوم دیکھے تو اُنکی مدد کرے اور اُن کے حقوق بجبر دلوائے۔ رعایائے مظلوم کو دیکھکر اہلِ سلطنت کو اتنا رنج ہو کہ جیسے وہ خود ہی مظلوم ہے۔

آخر عمر میں سولون نے ایک قصیدہ جزیرہ اطلانطس و اہلِ مصر کی تعریف میں لکھنا شروع کیا تھا۔ مگر موت نے مہلت نہ دی اور وہ پورا نہ ہو سکا

سال پانچسو اولمپیاد میں حکیم سولون جزیرہ قبرص ہی میں جاں بحق ہو گیا۔ اور اُس وقت اُس کی عمر قریب اسی برس کے تھی۔ وصیت کر مرا تھا کہ میری ہڈیاں مملکت سلامینا میں لیجا کر جلا دی جائیں اور راکھ دریا میں بہا دی جائے

اہلِ ایتھنز نے اس کے بعد امیرِ عسکر کے لباس میں اس کا مجسمہ بنایا اور ہاتھ میں وہ قانون دیدیا کہ جو اُس نے وضع کیا تھا۔ پھر سلامینا والوں نے اُسکا بُت خطیب کی صورت میں بنایا کہ جیسے وہ وعظ کہہ رہا ہے اور اس کے ہاتھ چادر کے اندر ہیں +

محمد حبیب الرحمن

روپیہ اور مالیت

ماہ اگست کے نمبر میں ایک مضمون "پیداوار دولت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ وہ علم اقتصاد کی ایک انگریزی کتاب "[illegible] ویلتھ" یعنے "قوانین دولت" کا پہلا باب تھا جسے ہمارے دوست منشی محمد صادق علی خاں نے ترجمہ کرکے اشاعت کے لئے بھیجا تھا۔ دوسرا باب اسی کتاب کا بحوالہ شائع کیا جاتا ہے۔ ہمیں نہایت مسرت ہوتی ہے کہ منشی صادق علیخاں صاحب جو مخزن کے آنریری معاونوں میں ہیں۔ پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔

مالیت کی تعریف

ہماری زبان میں لفظ قیمت[ا] اور مالیت بالکل عام فہم اور تقریباً ہم معنی ہیں۔ تاہم علم سیاست مدن کے رُو سے ان میں تمیز لازم ہے۔ فرض کرو کہ دس گز کپڑے کے عوض پانچ سیر گیہوں مل سکیں تو ہم کہیں گے کہ دس گز کپڑے کی مالیت پانچ سیر گیہوں ہے اور پانچ سیر گیہوں کی مالیت دس گز کپڑا ہے۔ پس ہر چیز کی مالیت دوسری چیزوں سے اس کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ جب ایک چیز کی مالیت کو جانچنا منظور ہو تو یہ دیکھنا لازمی ہے کہ دوسری اشیاء کس قدر اور کس مقدار سے اس کے معاوضہ میں مل سکتی ہیں۔ پس لفظ مالیت مقابلہ پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ جب ہم کہتے ہیں کہ دس گز کپڑے کی مالیت پانچ سیر گندم ہے تو گویا ہم کپڑے اور گیہوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔

[ا] یہاں لفظ ویلیو کی جگہ مالیت جو قریب الفہم اور مستعمل لفظ ہے استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ بعض مترجم اس کی جگہ لفظ قدر لکھتے ہیں مگر چونکہ تجارت کے کاروبار میں ہندوستان میں اس کا رواج نہیں۔ ہم نے اسے ترک کیا ہے۔

سب چیزوں کی مالیت نہیں بڑھ سکتی۔ قیمت ان کی بڑھ سکتی ہے۔

ہم کو معلوم ہو کہ ہر چیز کی مالیت کسی نہ کسی باعث سے بیش و کم و بیش ہوتی رہتی ہے۔ جب ایک شے پُرانی ہو جاتی ہے تو اس کی ارزانی یا بے قدری ہوتی ہے یعنی اس کی مالیت کم ہو جاتی ہے اور اسی طرح جب دوسری اشیاء کی مالیت کسی نہ کسی وجہ سے زیادہ ہو جاتی ہے تو بھی اس چیز کی مالیت مقابلۃً لازمی طور پر گھٹ جاتی ہے۔ اوپر کی مثال میں ایسے نوعیت پیدا ہو سکتے ہیں جن سے گیہوں کی مالیت کم ہو جائے اور دس گز کپڑے کے عوض بجائے پانچ سیر کے چھ سیر گیہوں آنے لگے۔ پس کپڑے کی مالیت بڑھ گئی اور کپڑے کے مقابلے میں گیہوں (خواہ اس کی مالیت کھانڈ وغیرہ وغیرہ دیگر اشیاء کے مقابلہ میں بڑھ ہی کیوں نہ گئی ہو) کی مالیت گھٹ گئی۔ اب یہاں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جب خاص خاص اشیاء کی مالیت بڑھ جاتی ہے تو ان کے مقابلہ میں دوسری اشیاء کی مالیت کم ہو جاتی ہے۔ نیز یہ کہ یہ اتفاق کبھی نہیں ہو سکتا کہ کل دنیا کی اشیاء کی مالیت بڑھ جائے یا اس کے برخلاف سب چیزوں کی مالیت گھٹ جائے۔ عام گفتگو میں ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ آجکل تو ہر چیز مہنگی یعنی بیش قیمت ہو گئی ہے جو کوئی بات ہوئی ہو مگر علمی حیثیت سے ایسے فقروں کی کچھ وقعت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہم یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ جیسے ہی ایک چیز کی مالیت کم و بیش ہوتی ہے تو مقابلتاً دوسری اشیاء کی قیمت ضرور بیش یا کم ہو جاتی ہے۔ اور اگر یہ نہ مانا جائے تو بعینہٖ ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی کہے کہ ایک گیہوں کے کھیت میں ہر پودا دوسرے پودوں سے بلند ہے یا یہ کہ ایک پودا دوسرے ہر پودے کی نسبت پست تر ہے۔ جب کسی چیز کی مالیت کا اندازہ زر سے کیا جاتا ہے۔ تو وہ مالیت لفظ قیمت سے بدل جاتی

ہے۔ چنانچہ جب ہم کہتے ہیں کہ اس بیڑ کی مالیت پانچ روپیہ ہے تو گویا ہم چیز
کی قیمت بتلاتے ہیں۔ یعنی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی مالیت کا اندازہ بواسطہ
سکہ کیا گیا ہے۔ پس مالیت اور قیمت میں یہ فرق ہوا کہ جب کسی چیز کی حیثیت
کا اندازہ ماسوا نقد رائج الملک کے کسی دوسری چیز یا چیزیں جس کے تبادلہ میں لگا
لین دین ہو سکے۔ کیا جاوے تو اس حیثیت کو لفظ مالیت سے تعبیر کیا جائیگا
اور جس وقت کسی چیز کی مالیت نقدی یا سکہ رائج الوقت میں ادا کی جائے
تو اُسے قیمت کہینگے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ہر چیز کی مالیت میں عالمگیر گھٹاؤ یا
بڑھاؤ نہیں ہو سکتا۔ مگر ہر چیز کی قیمت یعنی مالیت نقد میں جیسا کہ اکثر اتفاق
ہوتا ہے یا امر واقع ہو سکتا ہے۔ اس کے کئی وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ جب چیزوں
کی قیمتوں کی طرف اشارہ ہوگا تو گویا انکا تبادلہ زر نقد سے قرار پائیگا۔ زر دنیا
کی دیگر اشیاء میں سے صرف ایک شے ہے اور جیسا کہ بعض اوقات ہوتا ہے۔
نہایت کمیاب ہو جاتا ہے تو خواہ مخواہ سب چیزوں کی قیمتیں ترقی کر جاتی ہیں۔
مگر ان کی مالیت میں کچھ تفاوت نہیں آتا۔ مثلاً اگر ایک وقت دس گز کپڑا
پانچ سیر گیہوں کے عوض فروخت ہوتا تھا تو ہر دو کی قیمت دوچند ہو جانے سے انکی
تناسب مالیت تبادلہ میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ جن ایام میں روپیہ کا رواج
نہ تھا۔ لوگ اشیائے ضرورت کے تبادلہ سے گزارہ کرتے تھے۔ مثلاً ایک
شخص کے پاس تیل ہے اور اسکو ایک گائے کی ضرورت ہے۔ وہ تیل کے چند پیمانے
اور چند دیگر اشیاء گائے والے کو دیکر گائے خرید کرتا تھا اور گائے بیچنے والا
تیل لئے لئے بازار میں جاتا اور اس کے عوض میں کپڑا اور جوتی وغیرہ خرید کر لاتا۔
اور علیٰ ہذا القیاس۔ لیکن یہ طریق عمل نہایت تکلیف دہ تھا اس لئے لوگوں
نے سوچا کہ کوئی ایسی چیز نکالیں جسکو سب لوگ پسند بھی کریں اور ساتھ ہی ہر چیز کے

تبادلہ میں بھی بآسانی لگ سکے چنانچہ بعض ممالک میں کوڑیاں اور گھونگھے اور بعض میں نمک اور چمڑا اس قسم کا معیار قرار پایا - جو کام آج کل روپئے پیسے سے لیا جاتا ہے وہی اُن سے نکلتا رہا - مگر بلحاظ زر یہ سب چیزیں دقت سے خالی نہیں اس لئے رفتہ رفتہ سونے چاندی اور تانبے نے اُنکی جگہ لے لی - اور تقریباً دُنیا بھر میں آج کل انہیں کا سکہ رواں ہے - علاوہ بریں اب ہر چیز کی نسبت کا اظہار روپئے پیسے سے کرنے کا رواج ہو گیا ہے - اب لازم ہے کہ ہم ان شرائط کی جن سے زر مفید اور کارآمد ہے توضیح کریں -

شرائط

اوّل زر عام معیار مالیت اور اسکا عام ذریعہ تبادلہ ہو -

دوئم اسکی مالیت باقاعدہ یکساں اور قابل اعتبار ہو -

سوئم وہ کوئی ایسی چیز ہونی لازمی ہے جس کی خواہش عام ہو اور جو تھوڑی جسامت میں بہت مالیت رکھتی ہو -

شرط اوّل کی ضرورت صاف ظاہر ہے - اگر زر کا ہر شخص کے لئے کارآمد ہونا لازمی ہے تو ضرور ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز ہو جسکو سب کام میں لاتے ہوں جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ بعض ممالک میں کوڑیاں گھونگھے اور چمڑے اور دیگر اشیا بطور زر مستعمل ہوتے تھے اب یہ ظاہر ہے کہ چمڑے سی چیز کا ایک ملک میں چل جانا تو ممکن بھی ہے - مگر دوسرے ملک میں جہاں اس کو ناکارہ سمجھا جائے وہ کیسے قبول کیا جائیگا - لامحالہ اس سے تجارت اور تبادلہ محال بلکہ ناممکن ہو جائیگا -

شرط دوم بھی تقریباً ویسی ہی واضح ہے کہ زر کی قیمت باقاعدہ ہو اور ہر شخص کو جسکے کام وہ آتا ہے اعتبار ہو کہ اس کی قیمت ظاہرہ اور مالیت اصلی میں کچھ تفاوت نہیں - ناعاقبت اندیش اور خائن حکمرانوں کا دستور

تھا کہ اپنی آمد بڑھانے کو کھوٹا سکہ چلاتے تھے۔ یعنی ایسا سکہ جس کا اصل وزن و مالیت۔ سونے چاندی کے وزن معروف و قیمت منقوش سے کم ہو۔ مگر ایسا سکہ چونکہ لوگوں کو مرغوبِ خاطر نہیں ہوتا۔ اس لیے اگرچہ کچھ عرصہ تک مجبوراً رہتا بھی پڑے تو بھی آخر کار متروک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ اپنی اصلی قیمت زر سے زیادہ پر فروخت نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا وجود صریحاً لوگوں کے لیے باعثِ تکلیف اور نقصان ہوتا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب زرِ ناقص جاری کیا جاوے تو تھوڑے ہی عرصہ میں خالص زر ملک سے ناپید ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ بروقت خرید و ادائیگی قرض اس ناقص روپیہ کو کام میں لاوے اور اصلی زر جہاں تک ہاتھ آئے اپنے لئے جمع کر رکھے۔ بر اعظم یورپ کے سب بڑے ممالک میں یہی کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو زرِ مروجہ کے وزن اور مالیت میں فرق نہ آئے۔ یہی سبب ہے کہ انگلستان کا طلائی ساورن (پونڈ) دنیا کے سب ملکوں میں برابر چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ زر کامل عیار ہے۔ اور اس کی پاکیزگی اور صفائی میں کبھی تفاوت نہیں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہیں وجوہات سے وہ ہندوستانی ممالک میں کمال آزادی سے چلتا ہے۔

شرط سوم یہ ہے کہ زر عموماً ایسی چیز ہونی چاہیے کہ جس کے سکے بنائے جا سکیں اور جس پر سعدی کا مقولہ کہ "بقامت کہتر و بقیمت بہتر" راست آ سکے۔ یہ شرط سونے چاندی اور تانبے میں اچھی طرح پوری ہوتی ہے اور اب تمام دنیا میں انہیں دھاتوں کے گول گول سکوں کا رواج ہے جس سے سب واقف ہیں۔

زرِ عالمگیر	اگر تمام ممالک میں ایک ہی قدر و قیمت کے اور ایک ہی شکل و صورت کے سکے رائج ہو جائیں تو سچ مچ سیاحوں اور تاجروں کو بڑا آرام

ہوجائے۔ اس کے متعلق اکثر تجاویز بھی ہوئی ہیں مگر جیسا کہ ہم سمجھ سکتے ہیں ایسے معاملہ میں سب کا اتفاق ہونا مشکل ہے۔ کیونکہ بددیانت حکمران کھوٹے اور کم وزن سکے چلا کر ضرور روپیہ کمانے کی کوشش کرینگے اور انکی روک تھام ناممکن ہوگی۔ در بارہ روپیہ دولت نہیں۔ زر کے متعلق اس امر کا فیصلہ کہ اسکو دولت تصور نہیں کرلینا چاہئے نہایت ضروری ہے۔ دولت کی تعریف میں بیان ہوچکا ہے کہ ملک میں جو چیز قابلِ مبادلہ ہو وہ دولت ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ مدعیٰ کرنے سے سب کچھ مل سکتا ہے مگر کبھی کبھی نہیں بھی ملتا۔ پس زر کو اسی وقت تک دولت کہہ سکتے ہیں جب تک اس کے مبادلہ میں اشیائے ضرورت دستیاب ہوسکیں ورنہ وہ دولت نہیں۔ روپیہ دولت کے شمار کا ایک آلہ ہے اور اس کی حقیقت ان پردوں سے زیادہ نہیں جن پر کھلاڑی فرضی قیمت ٹھہرالیا کرتے ہیں۔

نوٹوں کا بیان } زر کی ایک دوسری صورت بھی ہے جسکو نوٹ کہتے ہیں۔ نوٹوں کا رواج تمام ممالک یورپ میں کثرت سے ہے اور اب ہندوستان میں بھی عام ہوتے جاتے ہیں۔ ایک قسم کا کاغذ ہوتا ہے جو عموماً حاکم وقت کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے اور اس پر اس مضمون کا وعدہ درج ہوتا ہے کہ عندالطلب رقم موجودہ ادا کیجائے لیکن درحقیقت اس کا اصلی اور بازاری نرخ لوگوں کی رائے پر موقوف ہوتا ہے۔ جب انکے خیال میں نوٹوں کے شائع کرنے والے دیانت دار اور مالدار ہوتے ہیں تو انکی پوری قیمت پڑتی ہے۔ اور اگر اس میں کچھ شبہ ہوتا ہے تو نوٹ پر تحریری مالیت میں نسبتاً کمی بیشی واقع ہوجاتی ہے۔ ممالکِ انگلستان اور ہندوستان میں نوٹوں کا لین دین پوری مطبوعہ مالیت پر ہوتا ہے۔ مگر بعض حکومتیں ایسی بھی ہیں جن پر سبب مقروض

علاوہ نادار یا بد دیانت ہونے کے پورا اعتماد نہیں ہوسکتا یا بباعث جنگ و فساد وغیرہ امن عامہ اور انتظام حکومت میں خلل ہونے کا اندیشہ دامنگیر رہتا ہے وہاں نوٹ کا پوری قیمت پانا ناممکن ہے اور انکی خرید و فروخت سونے چاندی کے سکہ کی طرح باسانی نہیں ہوسکتی۔

معیارِ زر { ہر ملک میں زر کا ایک مقررہ اندازہ ہوتا ہے جسکو معیار کہتے ہیں۔ بعض ممالک مثلاً چین و ہندوستان میں چاندی کا سکہ معیار ہے۔ ہندوستان کے سکہ کو روپیہ اور چین کے سکہ کو ڈالر کہتے ہیں۔

انگلستان اور دیگر مالدار ممالک میں زر کا معیار طلائی سکہ ہے۔ معیار سے وہ سکہ مراد ہے جس کے ذریعہ خانگی و ملکی قرضوں کا حساب کتاب ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے سکے مثلاً شلنگ وپنس و اٹھنی و چونی وغیرہ محض عوام کی آسانی کے لئے کام آتے ہیں ورنہ ان کی مالیت وضعی مصنوعی ہوتی ہے۔ انگلستان میں بجستثنائے خفیف رقم کے کوئی شخص اپنا قرضہ بجز طلا کے اور کسی شئے سے ادا نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر قرض خواہ مان لے تو وہ جدا بات ہے۔ اسی طرح چونکہ ہندوستان کا معیار روپیہ ہے۔ کوئی شخص بھی اپنا قرض طلائی سکہ میں ادا کرنے پر مجبور نہیں +

صادق علی خاں

دوست تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ کہ اگر راہ میں دور سے نظر آئیں تو ہم راستہ بدلکر بھی اُن سے ملنے جائیں۔ دوسرے وہ کہ اگر بازار کی ایک طرف وہ چل رہے ہوں اور دوسری طرف ہم تو ہم دوسری طرف جاکر انہیں ملنے کی پروا نہ کریں۔ تیسرے ایسے بھی دوست ہیں۔ کہ اگر راہ میں نظر پڑیں تو ہم تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹک جائیں کہ وہ گذر لیں تو ہم آگے چلیں +

(ترجمہ)

رانی رُوپ سنگھار

(گذشتہ سے آگے)

اُس نے اپنا سد ھا ہاتھ جس میں ایک گلاب کا ترو تازہ پھول تھا میری طرف بڑھا کر کہا کہ "اے انسان! اے عاقبت فراموش! اے ناشکرگذار! اے غافل! اے کاہل! اے نادان! اے خدا کو بھول جانے والے! تُو نے دُنیا کی چند روزہ زندگی پر بیٹھے ہُوئے سوچا سا ہے کہ اس عمارت کے راز سے آگاہ ہو مگر آج اس جہان میں نہ تو کوئی کتاب ایسی ہے جسکو تو پڑھ کر اس سے واقفیت حاصل کرلے۔ نہ کوئی خضر جیسا بڑی عمر والا آدمی ہے جس کے سامنے یہ عمارت بنی ہو اور وہ تجھے اسکی علّت غائی سے خبردار کرے۔ مگر چونکہ میں تجھ میں ایک صوفیانہ انداز اور حکیمانہ خیال پاتی ہوں اس لئے مَیں تجھے اس بھید سے آگاہ کرتی ہُوں۔ سُن۔ اب سے ۶۵۵ برس پہلے سمت ۱۳۰۲ بکرماجیتی میں اس سرزمین پر دان تال نام راجہ راج کرتا جو یک اعلیٰ خاندان میں سے تھا جس طرح وُہ اپنی ذات میں ایک گیا جاتا تھا اسی طرح وُہ شجاعت اور مردانگی میں بھی ارجن اور بھیم کے نام کا روشن کرنے والا تھا۔ اس پُرانے شہر کو جو یہاں سے اب دو میل ہے اسی راجہ نے آباد کیا تھا۔ اس شہر میں قلعہ اور قلعہ کے اندر قصر اور ایوان شاہانہ باغ نمونہ ارم بنائے تھے۔ شہر گلزار تھا اور اس میں چوسر کا بازار تھا جو دہلی کے چاندنی چوک کو شرماتا تھا۔ شہر میں ہزاروں آدمی رہتے تھے۔ جن میں بڑے بڑے سیٹھ مہاجن بید پنڈت وید انتی رشی مُنی بھگت جوگی جوتشی سورما تھے۔ اس راجہ کو

پرمیشور نے ایک بیٹا دیا تھا جسکا دلیپ سنگھ نام تھا۔ جب یہ کنور کنہیا اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا چودہ برس کا ہوا تو اس کی خوبصورتی کا شہرہ تمام عالم میں اس طرح ہونے لگا جس طرح پورن ماشی کو چندرماں دیوتا کا سبھاؤ تم نے دیکھا ہو۔ رانی نے راجہ سے کہا کہ مہاراج اب میں نے دلیپ سنگھ کو جوان کیا اس کے بیاہ کی فکر ہو کیونکہ میرے سر پہ سفید بال آگئے۔ جینے کی آس کم ہے۔ دلیپ سنگھ کی دلہن آجائے تو میرا گھر آباد ہو جائے اور میرے دل کا ارمان بھی نکلے۔ راجہ نے اسی وقت برہمنوں اور پروہتوں کو روانہ کیا۔ تاکہ دلیپ سنگھ کے لئے ایسی ہی دُلہن تلاش کریں جیسا وُہ خوبصورت اور پری پیکر ہے۔ چنانچہ ایک برہمن نے تھوڑے ہی دن میں واپس آکر راجہ کو خبر دی کہ ایشور نے کول کے راجہ کو ایسی کامنی اور موہنی بیٹی دی ہے جس کو اگر پری کہیں تو اچنبا نہ ہوگا اگر اس سے کنور دلیپ سنگھ کا بیاہ ہو جائے تو چاند سورج کی جوڑی بن جائے۔ راجہ دان پال اور اس کی رانی اسکو سنکر بیقرار ہو گئے۔ اور اسی وقت انہوں نے پیام بر دہان کول کے راجہ کے پاس کنور دلیپ سنگھ کے پیغام نسبت کے لئے روانہ کیا۔ چونکہ میرا باپ یعنی کول کا راجہ اور راجہ دان پال ہم قوم تھے۔ اس لئے میرے باپ نے اس بات کو فوراً منظور کر لیا اور نائی کے ہاتھ چند دیگر راجہ دان پال کے پاس ٹیکا بھیجدیا اور بہت جلد بڑی دُھوم دھام اور بڑے چاؤ کے ساتھ میرا بیاہ کنور دلیپ سنگھ کے ساتھ ہو گیا۔ میرا نام رانی روپ سنگھا دیتا تھا۔ جب میں اپنے سُسرال میں آگئی سات سُہاگنوں نے مجھے لباس اور زیور اور پھولوں کے گہنے پہنا دُلہن بنایا۔ رات کے وقت کنور دلیپ سنگھ میرے تنہا کمرے میں بڑے شوق کے ساتھ گئے۔ مگر چونکہ ہمارے مذہب میں شراب کی ممانعت کم ہے اور راجہ

مہاراجہ تو سب ہی پیا کرتے ہیں۔ اس لئے دلیپ سنگھ نے اُس شب کو خوب
شراب پی تھی اور چونکہ شادی کا موقع تھا اس لئے بڑی تیز اور تُند شراب منگائی
گئی تھی۔ اس لئے دلیپ سنگھ کے دل و دماغ کو اُسکے نشہ اور حدت کی سہار
نہ ہوئی اور وہ میری چھپر کھٹ میں آکر گر پڑے اور ایسی گرے کہ پھر کبھی نہ اُٹھے
صبح جب کنور دلیپ سنگھ کو بیہوش پڑے ہوئے دیکھا تو اُن کا منہ کھولا اور معلوم
کیا کہ مرغ روح نے قفس جسم سے پرواز کیا ہے اور شراب اور دھوئیں سے سراب
بڑی اُبل آئی تھی۔ جس نے مُراد مارغ متعفن کر دیا تھا۔ کل محل میں کہرام مچگیا اور
خاص و عام زن و مرد سب جمع ہو گئے۔ نالہ و زار اور آہ و بکا کی آوازیں تھیں جتنے
آسمان تک جانے لگیں مگر دلیپ سنگھ کی لاش ایسی ٹھنڈی بے حس اور بے خبر پڑی ہوئی
تھی۔ راجہ دان پال اور اُس کی رانی نے رو رو کر اور پیٹ پیٹ کر جو اپنا حال
تباہ کیا اس کا کیا بیان کیا جائے اور میں نے اپنے شوہر کے صدمۂ فراق میں
جو کچھ مصیبت اُٹھائی وہ آپ پر عنقریب روشن ہو جائیگی۔ چونکہ میرا میکہ میرے
سسرال سے بہت دُور نہ تھا۔ اس لئے سواری بھیجی گئی۔ اور انہوں نے میرے
ماں باپ کو نوجوان اور نامراد و ناشاد داماد کے مرنے کی سنانی سنائی اور
صبح تک میرا باپ کول سے چلکر میرے سسرال میں آگیا۔ ادھر دلیپ سنگھ کے واسطے
صندل کی خوشبودار لکڑیوں کی چتا بنائی گئی اور میں نے بھی اسے مرنے کی تیاری
کی۔ میرے سسر اور میرے باپ نے منع کیا کہ بیٹی تو ستی نہ ہو اور اپنی جان نہ کھو
کیونکہ ہم دونوں کی اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ اب تو ہی دلیپ سنگھ ہے اور تجھے
ہی دونوں گھروں کا راج پاٹ سنبھالنا ہوگا مگر میں نے کسی کی نہ سُنی اور کہا
کہ اگر میں آج اپنے شوہر کے ساتھ جلکر نہ مری تو بھی ہمیشہ زندہ نہ رہونگی۔ موت
ایک نہ ایک دن ضرور آئیگی۔ اس لئے میں ہندوستانی رسم و رواج کو جو

ہزاروں برس سے چلی آتی ہیں۔ کیساں بٹہ لگاؤں اور قوم کو بدنام کروں۔ کیا میں
اب پتنگے سے بھی گئی گذری ہوگئی جو شمع پر قربان ہوکر اپنی جان دے دیتا ہے
میرے نزدیک یہ چتا کی آگ بہتر ہے جو تھوڑی دیر میں جلاکر خاک کر دیگی۔ مگر
رنڈاپے کی آگ وہ آگ ہے جو خدا جانے اب سے پچاس برس یا ساٹھ برس یا کب تک
میرے تن من کو جلائیگی۔ خدا کسی عورت کو رنڈاپا کر کے نہ جلائے۔ کیونکہ رانڈ
عورت میکہ اور سسرال دونوں مقاموں میں ذلیل ہو جاتی ہے۔ ساس اور
سسرے کے نزدیک تو اس سے زیادہ کوئی منحوس ہی نہیں ہو سکتا جس نے
آتے ہی اُنکے بیٹے کو کھا لیا۔ ساس سسرے کے علاوہ اور سسرال کی عورتیں
تو اسکو جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتیں۔ بات بات پر طعنہ بات بات پر تشنیع دیتی
ہیں۔ کپڑا اچھا پہنے تو بانکی کہیں۔ پان کھائے تو بے غیرت کہیں۔ ہنسے تو سنگار
نام رکھیں۔ اگر بھولے سے کوٹھے پر چڑھے تو انگشت نما کریں۔ اوّل تو بیوہ
کا میکہ امیر نہیں ہو سکتا۔ جو کسی وقت۔ بعضے اپنی سسرال سے ناخوش ہو کر
چلی جائے تو باپ جب تک اسکی روٹی کپڑے کی کفالت کریں اور بالفرض باپ
بھائی اس کے مصارف کا بار اُٹھالیں تو بھاوجیں اور بہنیں اسکو زبان کے
تیر اور حد تک لگانے کے واسطے ہر وقت موجود رہتی ہیں اور اس کو پھر اپنے
سسرال یاد آتے ہیں اور آخر تو لاکر میکے سے پھر سسرال چلی جاتی ہے اور جب
وہاں لے دے ہوتی ہے تو پھر میکے چلی آتی ہے۔ غرض اس سسرال اور میکے کی
آواگون میں اس کی عمر بہت ذلت اور خواری کے ساتھ کٹتی ہے اور ہمیشہ
پچھتاتی ہے کہ کاش میں اپنے شوہر کے ساتھ اُسی دن جس دن وہ مرا تھا جل
مرتی تو اچھا ہوتا اور اگر میکے سسرال میں بیوہ نے فرض کیجئے کوئی تکلیف نہ اٹھائی
اور سب سامان آرام اور راحت کے اُسے نصیب ہوئے تو اس کے حق میں وہ

سب سے زیادہ آزار رساں اور زہریلے ثابت ہوتے ہیں کیونکہ راحت و آرام کا خاصہ ہے کہ رنج والم کو بھلا دیتا ہے اور خوشی کو اُبھارتا ہے۔ پس ایک بیوہ کے دل میں خوشی کے مواد کا اُبھرنا گویا چیونٹی کے پر نکلنے ہیں۔ جو موت کا مقدمہ ہے اس لئے یا تو وہ بدقسمت عورت کسی ایسے گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہے جسکو نہ گنگا جی کے اشنان پاک کر سکتے ہیں۔ نہ دوارکا جی اور متھرا جی کی ریاضت مٹا سکتی ہے۔ یا وہ کسی ایسے مرض میں پھنس جاتی ہے جو ہر وقت سکرات موت کا مزہ چکھاتا رہتا ہے۔ اس لئے میرے عہد میں ہندوستان کی بیوہ عورت کے لئے ستی ہو جانا ضرور تھا۔ کیونکہ اُس وقت تک ویدوں اور شاستروں پر نظر ثانی نہ ہوئی تھی اور اس قسم کی عورات کی دُوسری شادی کی دھرم کی پوتھی کتابیں اجازت نہ دیتی تھیں۔ اسی بڑھاپے کا ناٹک بڑا بھاری جانگداز رسم کو اپنے ناقبال ہاتھوں سے مٹا دیتا۔ الغرض جب چتا تیار ہو گئی تو کنور دلیپ سنگھ کے بیجان سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا اور بڑے تحمل کے ساتھ اپنی جان آگ میں جھونکنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس وقت عام تماشائیوں نے مجھ سے فرمائش کی۔ رانی روپ سنگھار! اپنا گھونگٹ کھولدے تاکہ ہم تیرے درشن کرلیں کیونکہ ایسی ستی سنیاسن اور دھرم والی رانی کی زیارت کب کب نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اُنکے کہنے سے اپنا مُنہ کھولدیا اور قوم سے مخاطب ہو کر کہا۔ اشعار

دُنیا میں ہیں سب عیش کے ساماں کوئی دن کے
ہیں رنگ و بہارِ چمنستاں کوئی دن کے
ہیں نغمۂ مرغانِ خوش الحاں کوئی دن کے
یہ جلوے نظر کے ہیں ناداں کوئی دن کے

دل دیکھے اب اس شمع پہ جاتی ہے مری جاں
ہیں اور بھی تقدیر میں نقصان کوئی دن کے

اَے میرے دھرم کے باپ اور بھائیو! تم نے دُنیا کی بے ثباتی اور عیش و آرام کی کمزوری دیکھی۔ آج ہی رات کو تمہارے شہر میں کیا چہل پہل اور کیا دُھوم دھام تھی۔ کنور دلیپ سنگھ کی شادی نے راجہ سے لیکر پرجا تک کو کس قدر خوش اور مگن کر رکھا تھا۔ تمام بازار آئینہ بند ہو رہا تھا۔ ہر گھر سے گانے بجانے کی دلکش صدائیں آ رہی تھیں۔ قلعہ کی گھما گھمی محلوں کی زیب و زینت راجہ اندر کے اکھاڑے سے کہیں زیادہ تھی۔ مگر ایک آن میں آسمان پیر نے عیش و سرور کی محفل کو درہم برہم کر کے ماتم خانہ بنا دیا۔ یا تو در و دیوار سے مُبارک سلامت کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یا زمین کے چپے چپے سے واحسرتا اور واویلا کا شور و غل بلند ہُوا۔ ہنسی کے مارے یا تو پیٹوں میں بل پڑے جاتے تھے مارے روتے روتے پیٹوں میں دم نہیں سماتے۔ دوست دشمن کے گریباں چاک ہیں۔ آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں لگ رہی ہیں۔ گلِ رخسار بیٹھتے بیٹھتے رنگِ سوسن ہو گئے ہیں۔ تو سینہ جو صفا میں آئینہ بنا ہوا تھا مارے دُہتڑوں کے گلِ نیلوفر کو شرمندہ کرنے لگا۔ کنور دلیپ سنگھ جو کئی گھنٹہ پہلے شاہانہ پوشاک پہنے پھولوں اور موتیوں کا دُہرا دُہرا سہرا باندھے۔ پیچ کو تُرارہ بیچ طُرّہ کلغی لٹکائے مروارید کی مالا پہنے جواہر کے نورتن بازوں پر باندھے پھولوں اور موتیوں کی بدھیاں پہنے دولہا بن رہے تھے اور خوشی کے مارے زمین پر قدم نہ رکھتے تھے اب وہ کفن پہنے چتا میں بیجان پڑے ہیں۔ نہ دنیا کی کچھ خبر ہے نہ دُنیا کے کسی عیش کی طرف انکو رغبت ہے اور ایک آن پر کیا موقوف ہے۔ ہزاروں راجہ اور سیکڑوں

بادشاہ جنکی حکومت کے پھریرے تمام جہان میں اُڑ رہے تھے۔ جن کے جاہ و حشم اور شان و شوکت دفتروں میں نہیں لکھے جا سکتے۔ مرے اور مر کر گمنام ہو گئے۔ سری رام چندر جی مہاراج جنہوں نے اجودھیا میں جنم لیکر اجودھیا کو اجودھیا جی بنا دیا جن کے نام کی سمرن جپی جاتی ہے۔ جن کا حسن و جمال چاند سورج سے زیادہ تھا جنکی فوج بے شمار تھی جنکے حزبے نعل دیا وت سے پُر تھے۔ جنہوں نے سمندر کا پُل باندھا۔ جنہوں نے راون جیسے مہہ دیت کو زیر کیا آج کہاں ہیں کرشن جی مہاراج جنہوں نے سعد اس دیو کی اچھوتی کوکھ سے ظہور فرما کر ہندوستان کو اپنے فیض و برکت سے سیراب کر دیا تھا۔ اور جنہوں نے سلونے چھپیلے حسن پر لاکھوں زہرہ تمثال حور ستمگار معشوقوں کو شیدا بنا رکھا تھا۔ جنکی بانسری سن کر پتھر موم ہو گئے تھے۔ موت نے انکو بھی نہ چھوڑا دنیا بہت ناپائدار مقام ہے اور اس کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ خدا نے جنکو سمجھ دی ہے وہ ایسا خیال کرتے ہیں ؎

زیست اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلینگے دم لیکر

اس جہان کا پتہ پتہ اور ذرہ ذرہ کہہ رہا ہے۔

قیامت گاہ ستوان ناخس گلزار دنیا را نسیم صبح گو یدایں سخن آہستہ در گوشم

مگر غفلت کی رُوئی ہمارے کانوں میں ایسی ٹھسی ہوئی ہے کہ کسی کی سنتے ہی نہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے بھول کا ایسا موٹا اور دلدار پردہ پڑا ہوا ہے کہ کسی کے پردرد حال کو دیکھکر عبرت نہیں پکڑتے ہیں۔

الغرض مبارک اور پاک ہے ہندوستان کی خاک جس سے ایسی باوفا عورتیں پیدا ہوتی ہیں جو اپنی جان محبت اور عشق کی راہ میں دیدیتی ہیں اور اپنے خاوندوں کے ساتھ جل جاتی ہیں۔ چنانچہ اے قوم تو گواہ رہنا کہ میں اپنی جان اسی رستہ میں

قربان کرتی ہوں۔ میری اس پُراثر تقریر نے لوگوں کو بے چین کر دیا۔ بہت سے
بے ہوش ہو گئے۔ بہت لوگوں نے گریبان چاک کر ڈالے اور ایسا تو کوئی نہ
تھا جو زار و قطار نہ روتا ہو۔ اسی حال میں آگ نے شعلہ لیا اور مجھے اور لیلیٰ مجنوں
کی لاش کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ آگ نے جو میرے جسمِ نازک کو تکلیف
دی اور جس سختی سے میری جان نکلی اسکو سوائے میرے کوئی نہیں جان سکتا
مگر بعد وفات اس وفاداری اور جان نثاری کے بدلے میں خدا نے وُہ درجہ
اور وُہ نعمت اور وُہ راحت و بخشش مجھے عطا فرمایا جسکو۔ میں بیان کرنے
کی مجاز ہوں نہ تو سمجھ سکتا ہے۔ جس زمین پر ہم دونوں کی بھسمی کی گئی تھی۔
وہاں حیدر نگر کے راجہ نے یادگار کے طور پر یہ عمارت بنوا دی جس میں اس وقت
تو بیٹھا ہوا یہ تماشا دیکھ رہا ہے"۔ اتنے میں رتھ بان نے آکر میرا شانہ
ہلایا اور کہا حکیم جی۔ آپ تو خوب سوئے۔ دن ڈھل چکا اور آپ کو خبر نہیں
میں ہوشیار ہو گیا اور دیکھا تو نہ وُہ عروہ ہے نہ نازنین۔ البتہ سقفِ گنبد میں
ابابیل نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔ میں رتھ میں جھٹ پٹ سوار ہو کر چلدیا +

حکیم سید ناصر نذیر فراق دہلوی

پنجاب ریویو اردو علم ادب کے شائقین یہ سنکر بہت خوش ہونگے کہ ہمارے دوست مولوی ظفر علی خان صاحب بی۔ اے سابق ایڈیٹر دکن ریویو نے پنجاب میں آکر اس علمی خدمت کو ہاتھ سے نہیں دیا جو وہ دکن ریویو کے ذریعہ سے کرتے رہے ہیں اور انہوں نے ایک نیا رسالہ پنجاب ریویو نام جاری کیا ہے جسکا مقام اشاعت کرم آباد (پنجاب) ہے۔ دکن ریویو کو جو کامیابی ہمارے لائق دوست کے ہاتھوں میں ہوئی تھی وہ یہ امید دلاتی ہے کہ پنجاب ریویو بھی ہر طرح سے کامیاب ہوگا۔ اسکا پہلا نمبر بابت ماہ اگست جو ہمارے سامنے ہے ایسا ہے کہ اسکی تعریف میں۔ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ پنجاب ریویو جنم لیتے ہی اردو کے بہترین رسالوں میں شامل ہو گیا ہے۔ اسکی تقطیع بھی بڑی ہے جیسے رسالہ ادیب شائع ہو رہا ہے۔ اور اسکی قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک قسم خاص کے لئے صہ اور قسم عام کیلئے عہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ ہمیشہ مثل ایڈیٹر کے [illegible]

وہیل

اعجاز! تم سانپ اور گائے کی داستان تو سُن چکے۔ اب یہ سمجھو کہ وہیل کیا چیز ہے اور بحث لی دُنیا کو اس سے کیا کیا نفع پہنچتا ہے! لو سُنو اور جو کچھ میں کہتا ہوں اسکو یاد رکھو۔

وہیل ایک قسم کی بہت بڑی مچھلی کا نام ہے جو بحر اطلانٹک اور بحر الکاہل میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔ نام کو تو ہے یہ مچھلی مگر حقیقت میں اس کو دریائی گائے سمجھو؟ مچھلیاں انڈے دیتی ہیں اور اپنے ننھے ننھے بچوں کو جدا کر پالتی ہیں وہیل جیسے جاگتے بچے جنتی ہے اور انکو دُودھ پلاکر پرورش کرتی ہے مچھلیاں گلپھڑوں سے ہوا لیتی ہیں۔ وہیل صحرائی جانوروں کی طرح پھیپھڑے سے سانس لیتی ہے۔ مچھلیوں کا جسم اکثر چھوٹے دار ہوتا ہے وہیل کے بدن پر سنگ کھال ہوتی ہے۔ مچھلیوں کا خون ٹھنڈا رہتا ہے وہیل کا خُون گرم ہوتا ہے اب اس مخلوقات دُودھ پلانے والے دریائی جانور کو جو چاہو سمجھ لو؟

وہیل کا اگلا دھڑ مچھلیوں کا سا ہوتا ہے لیکن پروں کے بدلے جن سے مچھلیاں تیرتی ہیں۔ وہیل کے دو بڑے بازو ہوتے ہیں؟ اُن کی ہڈیوں کے جوڑ و بند رگ و پٹھے شریان و وریدکی نرکب کو دیکھو تو بالکل ویسی ہی بنا ہے جیسے انسان کے بازو میں ہوتی ہے۔ انہیں ہاتھوں سے وہیل اپنے پیارے چھوٹے بچوں کو گود میں لیتی ہے اور خطرے کے وقت انکو جلدی سے پکڑ کر اپنے سینہ میں چھپا لیتی ہے تم کو سُنکر حیرت ہوگی کہ وہیل کے دونوں

پچھلے پاؤں نہیں ہوتے لیکن اُن کا نشان ا: رگوشت میں موجود ہے۔ تبدیل اشکال سے جسکا ذکر تمہیں کسی اَور موقع پر سمجھاؤنگا۔ بنتے بنتے وُہ مچھلیوں کی دُم کا سا بنگیہے۔ جس سے وہیل جہاز کے پہیہ کی طرح پانی کو کاٹتی ہُوئی چلتی پھرتی ہے۔

اگرچہ صحرائی جانوروں کی طرح وہیل بھی سانس لیتی ہے لیکن وہ سانس لئے دو گھنٹوں پانی کے اندر رہی سہتی ہے اور اس کا دم نہیں پھولتا جب سانس لینا چاہتی ہے تو پانی سے اُوپر اُبھرتی ہے اور خوب پیٹ بھر سانس لیکر مچلتی ہُوئی غوطہ لگاتی ہے۔ اور خوش خوش پانی کی پھوہار اوڑاتی اور اپنے پیارے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہُوئی سمندر کی تہ میں پہنچ جاتی ہے۔

وہیل کیا کھا کر زندگی بسر کرتی ہے اور کیونکر کھاتی ہے اس کی دل لگی سنو۔ اُسکے کلوں میں دونوں طرف قطار قطار چھوٹے چھوٹے سُوراخ ہوتے ہیں۔ جب وُہ بھوکی ہوتی ہے تو کنارے کی طرف نکل آتی ہے اور مُنہ کھول کر غوطہ مارنا شروع کرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں گھونگے سیپ غیرہ جو کچھ اس کے مُنہ میں آ جاتا ہے نگلتی جاتی ہے اور پانی گلے کے سوراخوں سے باہر نکل جاتا ہے۔ سکار کرتے وقت وہیل کا مُنہ جس کا دہانہ محض چھوٹا سا ہوتا ہے بالکل مچھوؤں کے جال کا کام دیتا ہے۔

اسکا سر بہت بڑا اور بھاری ہوتا ہے۔ آنکھیں اُلی ہوئی گائے کی آنکھ کے برابر ہوتی ہیں۔ کان نہایت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن آواز سُننے میں غضب کے تیز ہیں۔ اوپر کا رنگ کہیں کالا اور کہیں بھورا ہوتا ہے۔ پیٹ تمام سفید ہوتی ہے۔ قد کی لمبائی پچاس ساٹھ ہاتھ ہوتی ہے اور وزن کچھ کم چار ہزار من ہوتا ہے۔

وہیل دو قسم کی ہوتی ہے۔ پہلی قسم جو سب سے بڑی ہوتی ہے وہ ہے جسکے دانت نہیں ہوتے۔ یہ وہیل منطقہ باردہ کے سمندروں میں رہتی ہے اسکی زبان کی دونوں طرف لمبے لمبے مسوڑھوں کی دو قطاریں ہوتی ہیں۔ جو اوپر سے جھک کر نچلے جبڑوں تک پہنچی ہیں۔ ان مسوڑوں کی تعداد تین سو ہوتی ہے۔ تاجروں کے روزمرہ میں اسے وہیل کی ہڈی کہتے ہیں۔ مگر حقیقت میں۔ ایک قسم کا سخت سینگ ہوتا ہے جس سے سر جھاڑنے کا برش چابک چھڑی کی مٹھ عورتوں کا کمر بند وغیرہ بنتا ہے؟

دوسری قسم کی وہیل وہ ہے جس کے گائے کی طرح نچلے جبڑے میں دانت ہوتے ہیں۔ اسکا سر وزن میں قریب نو ٹن کے ہوتا ہے اور اس سے اسقدر تیل نکلتا ہے کہ چالیس چالیس ٹین کے ٹب بھر جاتے ہیں۔ اس تیل کو جوش دیکر جب ٹھنڈا کرتے ہیں تو تہ میں میل بیٹھ جاتا ہے۔ جو دیکھنے میں بالکل موم کا سا ہوتا ہے۔ اس سے موم بتی بنتی ہے اور روغن بہت سے کام میں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح کی وہیل منطقہ حارہ کے سمندروں میں ملتی ہے۔

تم پوچھ سکتے ہو کہ وہیل جس کی کھال اور دودھ پلانے والے جانوروں کی کھال کی طرح موٹی اور گرم نہیں ہوتی تو منطقہ باردہ کے سمندروں میں جن کا پانی ہمیشہ یخ رہتا ہے وہ کیونکر زندہ رہ سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کھال کے اندر کوئی دس بارہ انگل چربی کا موٹا دل ہوتا ہے جس پر سر سے دُم تک اس کا سارا بدن لپٹا رہتا ہے۔ وہیل برف کے سمندر میں رہتی ہے اور اسکو سردی محسوس نہیں ہوتی؟

سن لیا وہیل کا حال؟ اب اس کے شکار کی کیفیت سنو۔ تم کو حیرت ہوگی کہ اتنے بڑے ڈرانی ڈیل ڈول کے جانور کو جو سمندر میں جتنا گہرا غوطہ

چاہے لگا سکتا ہے۔ آدمی کیونکر پا سکتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہیل بچہ جنتی ہے اور بچہ جننے والے جانوروں کی طرح پھیپھڑے سے سانس لیتی ہے۔ بس سمجھ لو جب وہ سانس لینے اوپر آتی ہے شکاری مچھوا کی بن آتی ہے۔ لمبی لمبی ڈانڈ کے برچھوں کو پھینک کر اس غضب کا تلا ہوا ہاتھ مارتے ہیں کہ وہیل گتھ جاتی ہے۔ وہ بھاگتی ہے۔ مچھوے پیچھا کرتے ہیں اور موقعہ پا کر لگاتار زخم لگاتے چلتے ہیں۔ یہانتک کہ اس کے جسم کا سارا خون بہ جاتا ہے اور غریب مچھلی آخر کو موت اختیار کرتی ہے؟

ایک مسلح آہن پوش جہاز جو نہایت مستحکم بنا ہوتا ہے۔ مہینوں کا زادِ سفر لیکر وہیل کے شکار میں روانہ ہوتا ہے۔ اس رسالہ ستر آدمی سوار ہوتے ہیں۔ جہاز کی باربرداری کی طاقت چودہ ہزار من سے کم نہیں ہوتی۔ اس پر آٹھ آٹھ چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہوتی ہیں اور ہر ایک کشتی کے سرے پر ایک چھوٹی سی توپ چرخ چڑھی ہوتی ہے اور توپ کے رنگ لوہے کے کیل پر میل کی ایک گھرنی لگی رہتی ہے بس پڑو رکو رکھکر ڈھیل دیتے ہیں۔ جہاز کو دیکھو تو اس کی جانب کئی کلیں لگی ہوئی ہیں کوئی تو شکار کی لاش کو جس کا وزن سن چکے ہو۔ کئی ہزار من ہوتا ہے۔ آن کی آن میں پانی سے اوپر اٹھا لاتی ہے اور کوئی اس کے ٹکڑے پرزے اڑا کر بات کی بات میں کاٹ کر ڈھیر کر دیتی ہے۔ دوسری جانب دیکھو تو روغن نکالنے اور اسکو صاف کرنے کا اہتمام ہوتا ہے۔ کہیں پر تیز چمکتے ہوئے چھرے کلہاڑیاں بیلچے رکھے ہوئے ہیں۔ کہیں پر خالی ٹین کے پیپے جن میں چربی بھر بھر کر لاتے ہیں قرینے سے سجے رہتے ہیں۔ چھوٹی کشتیوں میں جو وہیل کے شکار کو جاتی ہیں دستی برچھے اور بھالوں کا انتظام رہتا ہے بھالوں کی ڈانڈ دو ہاتھ لمبی ہوتی ہے اور ہر یک کا وزن چھ سیر ہوتا ہے۔

اس کا پھل نہایت سخت لوہے کا بنا ہوا اسکو لمبا اور چوڑا ہوتا ہے جس کے دونو
طرف غضب کی تیز دھار ہوتی ہے۔ اس کے سامنے تو ایک نوک ہوتی ہے
لیکن پیچھے کو پھری ہوئی دو نوکدار شاخیں اور ہوتی ہیں اور یہ اس غرض سے
بنائی جاتی ہیں کہ بھالے کی سنان جسکو نوک کی زبان سمجھو گوشت کو کاٹتی
ہوئی شکار کے جسم میں آسانی سے گھس جائے۔ لیکن پھر اسکا نکلنا دشوار ہو
بھالوں کو توپ سے چلاتے ہیں اور برچھیوں کو جنکی لمبی ڈانڈ ہلکی پھلکی ہوتی
ہے ہاتھ سے تان تان کر مارتے ہیں۔ قصہ کوتاہ شکاری جہاز ان سب مہلک
ہتھیاروں کے ساتھ اپنے کل کانٹوں سے درست ہو کر بسم اللہ کہکر کسی طرف
کو نکل جاتا ہے اور شکار کی ٹوہ میں تمام سمندر ناپتا پھرتا ہے یہاں تک کہ
کوئی وہیل سامنے آنکلتی ہے۔ اس مچھلی کا یہ سبھاؤ ہے کہ جب سانس لینے
اوپر آتی ہے تو زور سے پانی کی پھوار اڑاتی ہے۔ شکاری مچھیرے جو اسکی
تاک میں نظر جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔ پھوار کو دیکھتے ہی فوراً بھانپ لیتے ہیں
آن کی آن میں اپنی شکاری کشتیوں کو جہاز سے نیچا کر کے ان پر آ بیٹھتے ہیں
اور کوئی ساعت جاتی ہے کہ چالاکی سے دبے پاؤں پشت کی جانب سے
شکار کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اسوقت نشانہ باز بھالوں کو توپ میں
دیکر اس انداز سے تاک کر باڑھ مارتے ہیں کہ خونخوار بھالا ایک خوفناک گھمیر
کاٹتا ہوا اندر گوشت میں دھنس جاتا ہے۔ وہیل گھبرا کر زور سے غوطہ مار کر
بھاگتی ہے اور بھالا لئے ہوئے جسکی ڈور کو ڈھیل دیتے جاتے ہیں۔ سیدھی
سمندر کی تہ میں پہنچ جاتی ہے۔ جدھر جدھر وہ بھاگتی ہے کشتیاں بھی اسی
طرف کو بڑھی چلتی ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ مچھلی پانی کے اندر بھاگتی
ہے کشتی پانی کے اوپر چلتی ہے۔ مچھلی کا پتہ ڈور بتاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں

زخمی وہیل سانس لینے کو ڈرتے ڈرتے پھر باہر آتی ہے۔ چھوٹے جہاز
باندھے ہوئے برچھا مارنے پر تُلے ہوتے ہیں۔ تیزی سے سمٹ کر ایک مرتبہ
قریب آجاتے ہیں اور سانس لیتی کو ہر طرف سے برچھا ان کے سِن سے
تیسنک کر مارتے ہیں۔ ہم جانور ان موذی شکاریوں کے تُلے ہوئے ہاتھ
کب خطا کر سکتے ہیں۔ مچھلی برچھوں سے گتھ جاتی ہے اور اپنے خون میں
شرابور ڈوب کر سمندر ورے بھاگتی ہے۔ اسی طرح کئی مرتبہ غوطہ لگانے اور
پے بہ پے برچھے کھسنے کے بعد اس میں سکت باقی نہیں رہتی۔ خون کے
بہ جانے سے ضعف نہایت کو پہنچ جاتا ہے۔ پانی میں دم گھٹتا ہے سانس
لینے باہر نہیں آسکتی۔ کہو اُس کا جینا دشوار ہے یا نہیں۔ ہے ہے بیگناہ
مچھلی کس بے بسی سے مرنا گوارا کرتی ہے اور آخری سانس لینے کو باہر آتی
ہے۔ چھوٹے برچھیا مارتے ہیں وہ بھاگ نہیں سکتی۔ تھوڑی دیر میں آخر کو سر
پٹک پٹک کر مر جاتی ہے اور کوئی ساعت جاتی ہے کہ اُس کی ڈراؤنی لوتھ
الٹا چت پانی پر تیرتی ہوتی ہے۔

چھوٹے خوش خوش شکار کی لاش کے پاس آکر جمع ہو جاتے ہیں اور اسکو
پانی پر کھینچتے ہوئے جہاز کے قریب لاتے ہیں۔ جہاز جو دیر سے منتظر کھڑا ہوتا
ہے اپنی جگہ سے حرکت کرتا ہے۔ اور وہیل کی لاش کو بوجھ اٹھانے والی
کل سے اوپر کھینچ لیتا ہے۔ پھر اک دوسری کل پر رکھ کر اسکو جکڑ دیتے
ہیں جو وہیل کے ناہموار عضو کو کاٹ کوٹ کر برابر کر دیتی ہے۔ اس کے
بعد مزدور لاش پر کھڑے ہو کر چھرے کلہاڑی اور بیلچوں سے اپنا کام
کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ کوئی ہڈی نکالتا ہے اور کوئی چربی کے بڑے
بڑے ٹکڑوں کو کاٹ کر ڈھیر کر دیتا ہے۔ یہ توحشر ہوتا ہے اُس مچھلی کا

جس کے دانت نہیں ہوتے۔ لگے ہاتھ دانت والی قسم کا بھی خاتمہ سن لو۔ اس کے سر کو چاک کر کے بڑا سوراخ بناتے ہیں۔ اس کے دماغ میں سیکڑوں من تیل بھرا رہتا ہے۔ جس کو ڈولچیوں میں بھر بھر کر اس طرح نکال لیتے ہیں جیسے حوض سے پانی نکالا جاتا ہے۔

جب وھیل کے مُردہ جسم سے کل کام کی چیزوں کو نکال لیتے ہیں تو جہاز اپنی کامیابی پر فخر کرتا ہوا زمین کی جانب پلٹ آتا ہے ۔

سید راحت حسین۔ بی۔ اے

ہیرا اور آبگینہ

مولانا حالی مرحوم کے مسدس و دیگر اشعار کے بعض ابیات آگے سے نقل کیے جاتے ہیں ۔

اور وہ مغرور آبگینے سے یہ ہیرے نے کہا — ہر وجود اپنے تنزل پر برابر ہے مدام

جنس تیری کس طرح قدر و قیمت میں تیری — ہے پلٹنے کی جو تو اے دیکھ نگم ہوگا کم

میکے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا — امتحاں کے وقت کھلتا ہے سب ابہام

سن کر آبگینے نے یہ ہیرے سے کہا — گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم

مجھ میں و تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز — ہیں مبصر ایسے اس بازار میں یہاں ہیں کم

تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں — تجھ سے اے الماس لیکن اچھے رہتے ہیں ہم

نینی تال

پیارے وُدُود! قیامِ نینی تال اب اس قدر مختصر رہ گیا ہے کہ شاید یہاں سے یہ آخری خط ہے۔ تمہارے یہاں آنیکی مجھ کو حسرت رہ گئی۔ عجب جانفزا و نزہت افزا مقام ہے۔ تم دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور دل پر ایک کیفیت لیکر جاتے۔ بہرحال جب کبھی بھی آؤگے تو یہاں کے مناظرِ زیبا تم کو مست و مخمور کر دینگے۔ نیلا آسمان ہوائے جاں پرور کے سرد جھونکے، برگہائے نوخیز کی ٹھنڈی اور فرحت بخش سبزی، پھولوں کی نازک و رنگین پتیاں، سایہ دار کنجوں کی تحمل پرور تنہائی فاختۂ دردمند کی دلسوز آواز تمہیں وارفتہ و مدہوش کر دیگی! چونکہ فضا عموماً گرد سے صاف ہوتی ہے، اس لئے چاندنی اتنی اُجلی، موثر و تسکین ہوتی ہے کہ تم دیوانہ وار گھر سے باہر نکل پڑوگے، نظر اُٹھا اُٹھا کر کبھی تاروں کو دیکھوگے، کبھی ماہِ تاباں کو دیکھوگے، کبھی بیٹھ جاؤگے، کبھی کھڑے رہ جاؤگے، یہانتک کہ اسی طرح ساری رات آنکھوں میں کٹ جائیگی!!

نسیمِ سحری طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے تمہاری خوابگاہ میں آکر تمہیں جگائیگی کہ اٹھو پاس کے درخت کی چڑیاں نغمہ سنجیاں کر رہی ہیں، شبنم آلود گھاسوں پر موتیوں کا انبار پڑا ہے، اُفقِ مشرقی میں دولتِ ضیا لُٹ رہی ہے۔ گلہائے نازک و رنگین بیدار کھڑے ہیں اور تم سو رہے ہو؟ یہانتک کہ ہوائے شوق تم کو بہت دور دور لیجائیگی، ناہموار بلندیوں پر چڑھا کر دامنِ صحرا کا لطف دکھلائیگی، کمرِ کوہ پر پُرخم و پُرپیچ رستے بتائیگی۔ صاف و سرد پانی کے جھرنے دیکھوگے۔ جگہ جگہ پر چھوٹی چھوٹی کھیتیاں نظر آئینگی، چڑیوں کی میٹھی اور سیلی آواز سُنوگے، یہاں وہاں گلہائے خوش رنگ

نہیں آگے بڑھنے سے روکینگے، انکو دیکھوگے، مسرت سے مسکراؤگے، انکی نزاکت مانع ہوگی، مگر تم سے صبر نہ ہوسکیگا، تم انہیں توڑوگے، سونگھوگے اور بدمست ہوکر بیٹھ رہوگے،

دوپہر اور جگہوں کی طرح یہاں کی بھی کسی قدر افسردہ وسنسان معلوم ہوگی، مگر یہاں اسوقت بھی ایک عالم ہوتا ہے۔ مناظر قدرت کا دلدادہ کسی طرح سایہ دار اور ٹھنڈی کنج میں نرم گھاس پر پڑا ہوا ہے، اور تخیل کی باگ چھوڑ دی ہو، کسی پل کے پتھر سے پانی کے رستے اور گرنے کی نرم آواز کانوں میں پڑ رہی ہے اور ہوائے خوشگوار کے خواب آور جھونکے اس کے سر کے بالوں کو الجھا رہے ہیں کہ دفعتاً کسانوں اور گلہ بانوں کی تندرست لڑکیوں کی بشاشت آمیز آواز کانوں میں پڑتی ہے، وہ اٹھ بیٹھتا ہے اور دیر تک نظارہ رہتا ہے، اس لئے کہ وہ عموماً خوشگل موزوں اندام اور نظر فریب ہوتی ہیں اور گو انکا لباس قطع ہو مگر انکا تناسب اعضا اہلِ نظر کے لئے صبر آزما ہوتا ہے، وہ عموماً بکریاں چراتی ہوتی ہیں، درختوں کے نیچے جمع ہو کر گرم رہتی ہیں، بے حجابانہ اچھلتی ہیں، کودتی ہیں اور پھر غائب ہوجاتی ہیں!!

تم کو پہاڑیوں کی بولیاں سمجھ میں نہیں آئینگی، مگر انکے پہاڑی گیت میں ترساد گی گھلاوٹ اور درد پاؤگے جس کے اثر سے تمہارا دل بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ وہ سنسانی گھڑیوں میں جس وقت اونچی اور ولولہ انگیز لے سے گاتے ہیں تو انکی آوازیں چٹانوں سے اچٹ اچٹ کر دلوں سے ٹکراتی ہیں اور دیر تک ریشہ ہائے دل کانپتے رہتے ہیں!

ان وقتوں میں ہمارے پردادہ دوستوں کی بھی ادا میں کچھ کم دلفریب نہیں ہوتیں۔ حریص و بلا نوش گدھ اونچی نوکیلی چٹانوں پر بیٹھے ہوئے کسی جاں بلب جانور کی

موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ بدنیت دھوکہ باز کوا اس طرح سے گردن موڑے بیٹھا ہوتا ہے کہ گویا کچھ نہیں جانتا ہے، مگر حقیقت میں موقع کا منتظر ہے کہ چیل نے جو شکار کیا ہے اُسے آپ اُڑا لیجائے۔ گلہری اکڑو بیٹھی ہوئی اخروٹ کے چھلکے کتر رہی ہے پہاڑی مینا کسی شاخ پر بیٹھی رہا ہنہانے معلقہ کی مشق کر رہی ہے اور اُدھر صید نکات پسند طیور ٹھنڈے پانی میں غسل کر رہے ہیں!

انہیں تماشوں میں تمہیں شام ہو جائیگی اور غروبِ آفتاب کا عالم دیکھ کر بے تم سر دُھننے لگو گے، کیونکہ یہ وقت بھی یہاں نہایت ہی نشاط انگیز ہوتا ہے۔ اُدھر آفتاب سرِ کوہ کی طرف جھکا اور اُفقِ مغرب میں آگ لگی، لہکتی ہوئی سنہری کرنوں سے تمام جنگل گلزار و روشن ہو گیا۔ تیتریاں اٹھنے لگیں، ہوا سے سرد کے جھونکے چلنے لگے۔ مدرشن و بہائی پسند طیور آشیانوں کے قریب لیٹے تسنن ہونے شروع ہوئی، ابابیلیں اڑنے لگیں اور آفتاب غروب ہو گیا! اب گھاس نم ہونے لگی، پھول سرنگوں ہو گئے، تاریکی پھیلنے لگی، خرماں چُپ ہو گئیں اور چاروں طرف اندھیرا ہو گیا! گہرے گہرے غار تاریک ہو گئے اور ویران طمدیوں پر ہولناک سکوت چھا گیا!

نہ سمجھنا کہ فرصت ہو گئی۔ ابھی سر بر تاروں بھری رات یمپین کرنے کو کھڑی ہے۔ تمہارے جذباتِ خفتہ جاگ اٹھینگے، حسرت دامنگیر ہو جائیگی، ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں کا ہجوم ہو جائے گا اور خدا جانے تمہارا دل کیا کیا چاہنے لگے گا!!

مگر تم کہو گے کہ ابھی مجھ کو شہر نہیں دکھلایا، میں نے اس لئے نہیں دکھلایا کہ وہاں کچھ دیکھنے کے لائق نہیں۔ بازاروں کے مکانات عموماً پست، تاریک بے فضا ہیں۔ جن میں کم مایہ و ملازم پیشہ لوگ گرمیوں بھر جانہ گیر رہتے ہیں۔ تم

اگر بعض دوستوں کی ملاقات کے لئے ان مکانات میں جاؤ گے تو کئی بار تمہارے
سر میں چوٹ لگیگی؛ اکثر سیڑھیوں پر سے پیر پھسلیگا اور تھوڑی دیر کہیں بیٹھنا نہیں
پاؤ گے کہ دھوئیں سے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہو گے۔ وجہ یہ ہے کہ قلت جگہ کے
سبب باورچی خانہ قریب ہی، اور نہ صرف باورچی خانہ - بلکہ 'مودی خانہ'
نعمت خانہ. غسل خانہ سب ایک جگہ رہتے اور بہس روس کے مکانات اس قدر کثیف
گھسے ہیں کہ دیکھ کر دم گھٹنے لگتا ہے مگر غربت و افلاس نے صفائی و نفاست
پسندی کے احساس کو اتنا کند کر دیا ہے کہ اس طرح کا بھی کوئی مکان خالی نہیں
مگر انگریزوں کی کوٹھیاں اور امراء اہل وطن کے بنگلے جو بازاروں سے دور
اور ایک دوسرے سے الگ الگ بلندیوں پر واقع ہیں اُنکا ذکر نہیں۔ وہ جنت
ہیں عیش و راحت کے ایوان ہیں جن میں ہر وقت ایک کیفیت رہتی ہے۔ رات
کے وقت اُن مکانات کی روشنیوں سے پہاڑوں پر چراغاں ہو جاتا ہے۔
کسی جگہ سے سازوں کی آواز آرہی ہے، کہیں گلاس ٹکرا رہے ہیں۔ روشن
و آراستہ کمروں میں بتانِ فرنگ محوِ رقص و سرگرم ناز ہیں۔ ایک طرف افسرانِ اعلیٰ
و جلیل القدر حکام سگار کشی و اصحاب رمی میں مصروف ہیں اور دوسری طرف سامانوں میں
فراغت سے اور دولتمند انگریز آرام کرسیوں پر لیٹے ہوئے قہقہے لگا رہے ہیں!
انہیں بنگلوں کے قریب اور پہاڑوں کی گود میں وہ بڑا اور خوشنما تالاب (نینی تال)
ہے جس میں رات کے وقت تارے نہاتے اور مہتاب آکر منہ دیکھتا ہے۔ اس کے چاروں
طرف ایک سڑک گھوم گئی ہے جس پر سایہ دار درخت لگے ہیں جنہیں ارباب محبت شکایت غم
کہنے کے لئے آ بیٹھتے ہیں۔ شام کے وقت سطح آب پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں دوڑتی
پھرتی ہیں اور انہیں بادشاہانِ ملاحت تفریح و عشق کا وقت گذارتے ہیں!

محمود

جمال الدین عرفی

سید محمد ابن زین الدین موسیٰ ابن جمال الدین مشہور بخواجہ جاوید شیرازی۔ اکبر شاہ کے عہد سلطنت میں یہ ہندوستان آئے اور اسی پایۂ تخت کے شاعر ہوئے۔ پہلے پہل جب یہ آئے ہیں تو فتحپور میں شیخ فیضی کے مہمان ہوئے۔ شیخ ان کے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آئے۔ عرصہ تک یہ انہیں کے یہاں رہے۔ آخر میں کسی بات پر کشیدگی ہوگئی۔ انہوں نے حکیم ابوالفتح سے ربط پیدا کیا اور اُن کی سفارش سے جاکیاں تک پہنچے رفتہ رفتہ اتنی ترقی کی کہ اپنے امثال میں سبقت لے گئے

صاحب ذخیرۃ الخوانین لکھتے ہیں کہ خانخاناں عرفی کے ساتھ اس قدر سلوک ہوتے تھے کہ انکو دوسرے کی احتیاج نہ ہوتی تھی ایک مرتبہ ایک قصیدہ کے صلہ میں ستر ہزار روپیہ دیا تھا۔

مشہور ہے کہ انکو شاہزادہ سلیم سے محبت تھی بعض بدخواہوں نے جہانگیر سے کہا کہ عرفی آپ پر فریفتہ ہے۔ اس کی محبت کا امتحان لینا چاہئے۔ یہ تجویز ہوا کہ اس سے کہا جائے اگر تم کو شاہزادہ کی سچی محبت ہو تو اُس کی خوشی سے جام زہر پینا قبول کرو۔ شاہزادہ اس صلاح پر راضی ہوگیا اور کہا کہ اگر وہ منظور کرلے تو زہر کا جام ہرگز نہ دینا۔ یہاں لوگوں کو یہ خیال کہ اسوقت تو اسکا کام تمام کر ڈالیں۔ پھر دیکھا جائیگا۔ غرضکہ ایسا ہی ہوا کہ جہانگیر کے ہاتھ سے زہر کا جام پلوا دیا۔ عُرفی کے بعد ان کے حاسدوں اور مشیروں سے بہت کچھ قصاص لیا گیا۔ جہانگیر نے عرفی کی حسرتناک موت پر بہت افسوس کیا۔ خدا جانے یہ واقعہ

عرفی کی رحلت کر ہوئے۔

کلیات | ملا محمد علی سرخوش لکھتے ہیں کہ پہلے انہوں نے جو دیوان مرتب کیا تھا اس میں ۲۶۰۰ قصیدے ۲، غزلیں ۷۰، قطعے اور رباعیاں تھیں اس کے آخر میں یہ رباعی تھی جس کے مصرع آخر میں تاریخ تھی۔

این طرفہ نکات سحری و اعجازی — چوں گشت مکمل برقم پردازی
مجموعہ طرا قدس تاریخش یافت — اوّل دیوان عرفی شیرازی

مصرع تاریخ میں ایک عجب صنعت ہے اگر اس کی اکائیاں شمار کیجائیں تو قصائد کے ہم عدد ہیں اور دہائیاں غزل کے اور سیکڑے قطعات و رباعیات کے ہم عدد ہیں۔

دیوان گم شدہ | اس دیوان کی ترتیب کے قبل چھ ہزار شعر انکے تلف ہو گئے جو پھر نہ دستیاب ہوئے۔ اس کا افسوس ایک قطعہ میں ظاہر کرتے ہیں۔

عمر در شعر سر کردہ و در باختہ ام — عمر در باختہ را بار دگر باختہ ام
العطش میزند از تشنہ لبی ہر مو کم — کہ قدح ہائے پر از خونِ جگر باختہ ام
شاید ار طعم کشم نالہ ز حرمانِ سخن — طوطی گرسنہ ام تنگ شکر باختہ ام
رصد کشیع سحر جوں نسو دمحو کرمن — شش ہزار آیتِ احکام ہنر باختہ ام
گفتہ گر شد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست — از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام
صد مصیبت کدہ در ہر سخنم مدغم بود — گریہ و نالہ بسی شام و سحر باختہ ام

صاحبِ خزانۂ عامرہ کی رائے | در وقتِ تحریر این صحیفہ دیوانِ عرفی مشتمل بر اقسام سخن بملاحظہ در آمد۔ در قصیدہ گوئی ید طولیٰ داشت باوصف آں مخالطہا و جیدہا خوب واقع شدہ لہذا برزبانِ قلم نیاید۔ غزل و مثنوی او مرتبہ مساوی دارد۔ اما باعتقاد حکیم حاذق پسر حکیم ہمام برادر حکیم ابوالفتح مثنوی او کم بہت دیں باب گوید

عرفی ما چو غزل اُستاد بود   خانہ خراب دو آباد بود

شورِشش از فصاحت نداشت   کانِ نمک بود ملاحت نداشت

اشارہ است بمثنوی عرفی کہ در ہمیں وزن گفتہ مطلعش اینست۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   موج ہست است ز بحر قدیم

مولف گوید بجائے موج لفظ مد مناسب تر است۔

عرفی کے مصرع پر جو اصلاح صاحبِ تذکرہ نے دی ہے میرے ذہن میں اُسکا کوئی لطف نہیں آیا۔

آذر کی رائے | حاجی مرزا لطف علی بیگ آذر صاحبِ تذکرۂ آتشکدہ لکھتے ہیں۔

در باب استعارہ اصرار بسیار دارد بحدیکہ تمتع از معنی مقصود غافل میشود۔ مثنوی ثانی در خسرو شیریں دارد۔ اگر عیب استعارہ حک نداشت۔ بنداں بد نگفتہ بود

ہر شخص اپنے مذاق و وجدان کے موافق رائے دیتا ہے جسکو وہ استعارہ جنک بتاتے ہیں ہمیں وہی پسند ہے۔

جو کیفیت عرفی اپنے شعر میں دکھاتا ہے وہ معراج شاعری ہے۔ تشبیہات و استعارات سے اُسکی خداداد اور حکیمانہ طبیعت کو جو مناسبت ہے کسی شاعر کی قسمت میں نہیں ہے اُسکا کلام فلسفہ کا مخزن اور شاعری خوبیوں کا معدن ہے۔ معنی یاب طبائع اسکے جوہر شناس ہیں۔ سرزمینِ فارس پر جب شاعری نے تخم ریزی کی تو بڑے بڑے باکمال اور فن شعر کے حکیم علی الاطلاق پیدا ہوئے مگر اس جوان کا رنگ بالکل الگ رہا۔ متاخرین میں عرفی کے سچ میں بہت لوگوں نے خیالی گھوڑے دوڑائے۔ مگر اُس کی گردِ قدم کو بھی نہ پہنچے۔ روح کو جو لذت اُس کے کلام سے ملتی ہے اُسکا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ عرفی

تو ہرچہ کہ من باز بہر روح سازدہم   نہ دوری نہ فلانی دہند بہمانی

اس کے خیال کی رسائی جہانتک ہو وہ شاعری کی انتہا ہے۔

آن چشمہ قدم کز لب تشنگی دمی   جبریل در آید بحریم نگاہ منیرم

درحقیقت وہ پیکر سخن میں ایک تازہ روح پھونک رہا ہی ہوا۔

شعور زدیدہ ام از معرفت آسودہ ام   جان معنی شدم و صورت بیجان رفتم

جس زمانہ میں حزیں کا دیوان میرے مطالعہ میں تھا تو میں اسے پسند کے شعروں پر نشان دیتا جاتا تھا۔ اکثر ان شعروں کو پڑھ پڑھ کر لطف اٹھاتا تھا۔ اس عرصہ میں رسالہ مخزن میری نظر سے گذرا جس میں مولوی رضا علی صاحب وحشت نے جنکی خوشگوئی کا سکہ میرے دل پر بیٹھا ہے۔ شیخ علی حزیں کے منتخب اشعار مع تنقید کے لکھے ہیں۔ مطالعہ مجھ کو بہت پسند آیا۔ کیونکہ میرا بھی ارادہ تھا کہ مولانا عرفی کے منتخب اشعار کسی وقت چھپواؤنگا۔ یہ مضمون میرے خیالات کا محرک ہوا۔ میں بہتر سمجھا کہ وارفتگان نغمۂ شیراز کے سامنے یہ تحفہ پیش کروں۔

نالہ میکشم از درد تو گاہے لیکن   نالہ میرسد از ضعف نفس میگردد

اس مضمون کی نزاکت و ندرت اس جوان شیرازی کے حصہ میں آئی۔ ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ عاشق اگر کبھی نالہ کھینچتا ہے تو وہ ہونٹوں تک آتے آتے سانس ہوجاتا ہے۔ نالہ کا ضعف سے نفس ہوجانا کیسا فطری خیال ہے۔

مرزا غالب نے بھی اس مضمون کو دوسرے لباس میں ظاہر کیا ہے۔

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے   جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آکے دم ہوئے

مرزا یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے انفاس حقیقت میں نالے ہیں اور اسی کے سہارے ہماری زندگی ہے۔ یہ شعر بھی عشق کے گہرے رنگ میں ڈوبا ہے۔

در بہاراں ہمہ کس ہمدم مرغ چمن اند دل من ہمنفس مرغ قفس میگردد

موسم بہار میں سب آدمی مرغان چمن سے دلبستگی رکھتے ہیں۔ مگر ایک میرا دل ہے کہ مرغ قفس سے بہلتا ہے۔ اپنی اسیری اور مجبوری کس پیرایہ میں ظاہر کی ہے اور کتنا درد بھرا ہے۔ حقیقت میں عرفی ان دلوں کا بادشاہ ہے

تعلق کیا رہا ہم کو نواسنجان گلشن سے بہلتا ہے تو مرغان قفس سے جی بہلتا ہے

حاصل دو جہاں امروز محشر بجویند یک یک لحظہ ہجران تو باشد

دونوں جہان کی جانوں کا سرمایہ کل روز حشر کے دن طلب یہ معمولی خیال نہیں۔ حشر کے لفظ نے اور قیامت ڈھائی کہ دوسرے جہاں کو بھی شامل کر لیا۔ اس شعر کو تصوف کی عینک لگا کر دیکھئے تو دوسرا ہی جلوہ دکھاتا ہے۔ اردو میں اب تک کوئی مضمون میری نظر سے نہیں گذرا۔

ہاں رنگے کہ ہجا در دل اسلامیان بینی مغان از تیرگی داماں صفائی میزدود اینجا

اس شعر میں تصوف کی رنگ جھلکی ہوئی ہے۔ شراب معرفت نے مغان کے زنگ دل پر قلعی کر دی تھی۔ آج دشمن جن مسلمانوں کا دل زنگ آلود دیکھ رہا ہے۔ وہ اس شراب کے نہ پینے سے ہے

بہر سو میروم بوئے چراغ کشتہ می آید مگر وقتے مزار کشتگان عشق بود اینجا

جدھر جاتا ہوں بجھے ہوئے چراغ کی بو آرہی ہے۔ شاید کسی وقت یہاں کشتگان عشق کی تربتیں تھیں۔ یہ تو ترجمہ ہے۔ مگر اس شعر کی تصویر کھینچنا وجدان کا کام ہے۔ عرفی نے جس دنیا میں پہنچکر یہ شعر کہا ہے وہاں سوائے عشق کے

دوسری کوئی چیز نہ تھی اہلِ دل کی جس قدر بھی آبادی تھی اسکو عشق نے زیر زمیں پنہاں کر دیا۔ ہزاروں لاکھوں قرینِ عشق کے مرقدوں کی دکھائی دے رہے ہیں جو چراغ کشتہ کی جگہ آ رہی ہے۔ چراغ کشتہ نے اس شعر میں جو درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے اسکا کیا مذکور۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیکسوں کی قبروں پر جو چراغ روشن تھے وہ سب کسی نے ابھی بجھا دیئے ہیں۔ جس کی بو کا احساس ہو رہا ہے۔
میں نہیں کہہ سکتا کہ دوسروں پر اس شعر کا اثر ہو کہ نہ ہو مگر میں تو اس شعر کو پڑھ کر ایک دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہوں۔

بہ ہر کاوشِ دل اہلِ درد نیست طلب
من و نگاہ تو با نشتر چہ کار مرا

اس شعر کی حسنِ ادا اہلِ دل سے پوچھو۔

مرا فریب دہد نالہ و غمم گوید
ز من ترانہ بشنو با اثر چہ کار مرا

اس خوبیٔ بیان کو دیکھو۔ حاصل صرف اتنا ہی ہے کہ میرے نالے بے اثر ہیں مگر اسکو یوں سمجھا ہے کہ نالہ مجھ کو یہ دھوکا دے رہا ہے اور غم سے کہتا ہے کہ تجھ کو اثر سے کیا سروکار۔ لے میں تجھ کو ترانہ سناتا ہوں۔ اسے تن نالے کو مذاقِ غم میں ترانہ ثابت کرنا عرفی ہی کا کام ہے۔

چرا ز عرفیٔ جانباز سر نمی طلبی
فدائے تیغِ تو جانم لب بسر چہ کار مرا

اللہ رے تغزل۔

منم کہ یافتہ ام ذوقِ صحبتِ غم را
بصبحِ عید دہم وعدہ شامِ ماتم را

شام ماتم کو عید کی صبح بنانا انتہا کا مذاق غم ہے۔ اس سے بالا کوئی مرتبہ نہیں۔

قبولِ عشق عنانم گرفت عرفی و برد   بخلوتے کہ تصور نبود محرم را

وہ خلوت جہاں محرم کا بھی تصور نہیں پہنچ سکتا۔ عشق نے انکو وہاں پہنچا دیا اس کی کیا تعریف کیجائے۔ کتنا بلند اور متصوفانہ خیال ہے۔

عرفی زیر تیغ مشو مضطرب کہ ہست   اجرے دگر شہید بخون طپیدہ را

صبر کا ایک اجر ہے۔ اس مضمون کو غزل میں لاکر کس اثر بھرا ہے   واہ رے عرفی!

تا برگرہ بہ سیاست نگاہ را   منتہاست بر دلِ عاشق گنہ را

جس گناہ کے سبب سے اس نے مجھ پر سیاست کی تیز نگاہ ڈالی اس گناہ کے سیکڑوں احسان میرے دل پر ہیں کہ اس کی بدولت ایسی نگاہوں کا لطف رہ ہوگیا

عرفی طمع مدار مدارا زخوئے دوست   در دل نگاہ دار سراسیمہ آہ را

اللہ رے درد اس شعر کا۔ آہ سراسیمہ کو اپنے دل میں دبائے رہنا ایسا نہ ہو کوئی آفت برپا کرے۔

مرزا محمد ہادی - عزیز - لکھنوی

الہ آباد کی نمائش

اخبار بین دنیا کو معلوم ہے کہ سال حال کے اختتام پر ماہ دسمبر میں ایک عظیم الشان نمائش الہ آباد میں ہونے والی ہے۔ جس کے اہتمام میں صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ بھی پوری سعی کر رہی ہے اور جس کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ بہت کامیاب نمائش ہوگی۔ ہمیں یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی ہے کہ نمائش کے اُس حصہ کے متعلق جس میں زنانہ دستکاری کے نمونے رکھے جائینگے ایک پردہ کلب قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ پردہ والی بیبیاں بس پردہ بیٹھ کر نمائش کے بہت سے حصوں کی سیر دیکھ سکیں۔ ایک انگریزی اعلان اس زنانہ کلب کی بابت جناب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر کے پرائیویٹ سکرٹری صاحب نے ہمارے پاس بغرض اشاعت روانہ کیا ہے۔ جس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ تجویز عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاویگی اور پردہ دار خواتین اس انتظام سے جو انکی خاطر کیا گیا ہے فائدہ اُٹھائینگی۔

لیڈیز کورٹ

صوبجات متحدہ کی نمائش کے زنانہ حصہ کے متعلق جسکا لیڈیز کورٹ نام رکھا گیا ہے۔ ایک پردہ کلب ہندوستانی خواتین کے آرام کے لئے قائم ہوا ہے اور مسز آر. ایل. پورٹر صاحبہ نے اسکا اہتمام اپنے ذمہ لیا ہے۔ ۱۹ ماہ جون ۱۹۱۰ء کو زنانہ حصہ کے متعلق مختلف امور پر غور و بحث کرنے کے لئے ایک جلسہ ہوا۔ اور سب حاضرین۔ دیکھکر کہ چند ہفتوں میں ہی کس قدر ترقی اس کی تیاری میں ہوئی بہت خوش ہوئے۔ زنانہ صحن کے مختلف حصوں کی عکسی تصویریں حاضرین کے روبرو پیش

تلاش کی جانی چاہئیں۔ پرانے زمانے کے شال کمخواب اور لیس اگر بھیجے جائیں گے
تو وہ مستقل اشیا نمائش میں شمار ہونگے۔

انگریزی خواتین سے پرانے اور نایاب لیس کی خاصکر درخواست کی جائیگی
اگر کسی کے پاس رونز پائنٹ ہاؤنسٹن کے نمونے ہوں تو بہت غنیمت ہونگے

گڑیوں کے لباس کا ایک مقابلہ ہوگا جس کیلئے خاص انعام دیئے
جائینگے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ گڑیاں خاص خاص لباسوں میں دکھائی
جائیں۔ مثلاً دلہن کے لباس میں۔ سکھوں کے لباس میں۔ اور اسی طرح رقاصہ
چپراسی سائیس کے لباسوں میں۔ کسی گذشتہ صدی کا انگریزی زمانہ ایک
یورپ کے کسانوں کا قومی لباس۔ سب دکھائے جائیں۔ اگر خواتین چاہیں
تو اس خیال کو توسیع دے کر بجائے ایک گڑیا کے کئی گڑیاں کا ایک گروپ
دکھائیں جس میں پوری برات۔ یا رقاصہ اور اس کے مطرب یا کسی گھر
کے نوکر چاکر مجموعی طور پر نظر آئیں۔

تمام نمائشی اشیا کے بھیجنے کے مصارف۔ بھیجنے والے کے ذمہ ہونگے
مالک کا نام اور پتہ ہر چیز پر واضح طور پر لکھا ہوا ہونا چاہئے۔ اور اگر فروخت
کے لئے ہو تو قیمت بھی درج ہونی چاہئے۔ نمائشی چیزیں ۱۰ اکتوبر تک رائے

سانول داس بہادر۔ جونیر سکرٹری۔ رونیو بورڈ۔ الہ آباد
کے پتہ سے بھیجی جائیں ۔

یہ نظم مسدس میں لکھی گئی ہے جو قابلِ داد ہے۔ مولانا ممدوح اُن چند حضرات
میں ہیں جن کا وجود اس وقت غنیمت ہے اور جنہوں نے اردو علم ادب کی خدمت کی ہے۔

اے خوشا! وہ قوم مستقبل ہو جس کا شاندار — کل سے بہتر آج ہو اور آج سے بہتر ہو کل
دمبدم راہِ طلب میں کر رہی ہو دوڑ دھوپ — ایک لحظہ رہ نہ ہو اسکو توقف ایک پل
رفتہ رفتہ بن گئی ہو مسلم کی کشور کشا — ہوتے ہوتے ہو گئی ہو مردِ میدانِ عمل
کیوں نہ ہو اُس قوم کی دنیا کے ہر گوشہ میں دھاک — جس میں اخلاقی سکت ہو اور حکومت کا بل
وقت کو، دولت کو، طاقت کو نہ کھو کر کھیل میں — کھو دے احیاناً تو حاصل بھی کرے نعم البدل
ہچکچاتی ہو پہاڑوں سے نہ دریا سے ڈرے — ہمتیں ہوں اسکی عالی عزم ہوں اُسکے اٹل
حسرتا! وہ قوم غافل کہ ہو ننگِ سلف — کاہلی سے دست و بازو ہو گئے ہوں جسکے شل
اسکی طاقت کیا کہ ہوں اوراق دفتر جسکے بند — اسکی عزت کیا جو ہو پس ماندہ علم و عمل
اُسکی دولت کیا کہ ہوں افراد جس کے بے ہنر — مفلسی ہو اور دماغوں میں ریاست کا خلل
کر دیا ہو خانہ برباد آج انہیں اسراف نے — جنکو قدرت نے دیے تھے سینکڑوں رنگیں محل

خیر جو گزرا سو گزرا، یہ جو ہیں نازہ نہال
فکر انکی چاہئے تا یہ بھی جائیں سنبھل

انکو بار آور بناؤ — جو ادب کا رو وصول — آج جس سانچے میں ڈھالو گے انہیں جائینگے ڈھل
کھیت میں پیدا ہوں پودے اور سینچو وقت پر — ہے نتیجہ صاف ظاہر ورنہ سب جل جائینگے جل
سوکھ کر جھڑ جائیں کلیاں اور نہ چیتے باغباں — ایسے ظالم باغباں کو کیا ملیگا خاک پھل

جی چرانا کام سے اور کامیابی کا طلب
اے عزیزو! ہے خلافِ حکمِ حق عز و جل

لَیسَ لِلاِنسانِ اِلّا ما سعیٰ پڑھتے تو ہو — لیکن اس پڑھنے کا اے حضرات! آخر ما حصل؟
شہد کی مکھی کو دیکھو کس قدر مصروف ہے — چوس کر ہر پھول سے لاتی ہے پیاری عسل

ادب نے اجازت نہ دی کچھ کہوں میں
کریں آپ اب فیصلہ بندہ پرور

احمد حسین خاں (ایف آر ۔ اے ۔ ایس)

ہم نشیں

(طرزِ جدید)

میں یہ ناچیز نظم کو اپنے دلی دوست مسٹر توکل حسین صاحب مرحوم کے نام سے منسوب کرتا ہوں۔
(شاکر)

اے انیسِ کنجِ تنہائی ۔ اے پیارے ہم نشیں!
آہ! میں تیرے لئے زندہ ہوں تو میرے لئے
تجھ سے بڑھ کر لطفِ دنیا کی کسی شے میں نہیں
تجھ کو میری دھن ہے ۔ تیری آرزو میرے لئے

گو کہ قابل ہے اگرچہ بہت فضائے روزگار
اور دلکش ہے اگرچہ باغِ عالم کی بہار
گر کبھی پہلو میں نہ ہو تو اے نسیتی غمگسار
وادیٔ پرخار ہے نظروں میں فردوسِ بریں

تو نہ ہو تو لطفِ دنیا ہیچ ہے اے غمگسار
تیرے دامن سے ہے وابستہ نشاطِ زندگی
مجھ کو الفت تجھ سے ہے ۔ اور تو مجھے کرتا ہے پیار
تجھ پہ ہے موقوف لطفِ انبساطِ زندگی

مجھ سے کرتا ہے بیاں تو داستانِ دل
اور ہوں تیرے سامنے میں ترجمانِ دل
دونوں پہروں رہتے ہیں افسانہ خوانِ دل
ایک ناوک آہ! دونوں کے کلیجے کر گیا

ہجر کی شب کی نہ کٹنے والی گھڑیوں میں عجب
جب دھڑک کر آہ! لیتا ہے دلِ مضطر فرا
بیٹھ جاتے تھک کے ہیں جب آہ! ہم غربت نصیب
چلتے چلتے دشت میں ہو جاتے ہیں تلوے فگار
خارِ صحرا پاؤں میں رہ جاتے ہیں جب ٹوٹ کر
وادیٔ غربت میں بڑھ جاتا ہے جب دردِ جگر
اے شریکِ رنج و راحت! اے ہمارے چارہ گر
سب سے پہلے تو ہی آتا ہے تصور کی نظر

دشتِ غربت میں اگرچہ ساحرِ بزمِ خیال
دور کرنے کو ہمارے دل سے آلام و محن
کھینچ دیتا ہے اعزا کے نظر میں خط و خال
صورتِ احباب - اور تمثالِ یارانِ وطن
اور فرقت میں ہیں جن کی آہ! ہم اندوہگیں
لا کے پہلو میں بٹھا دیتا ہے وہ زہرہ جبیں
سب سے پہلے صحبتِ دیرینہ لیکن ہمنشیں!
تو دکھا جاتا ہے ہم کو اپنی تصویرِ جمال
آہ - یہ کیوں؟ مجھ سے لذت ہو وصالِ یار کی

آہ تجھ پر منحصر ہے لطفِ یارانِ وطن

آہ! یہ کیوں؟ تجھ سے ہے تسکینِ جانِ زار کی
نورِ قسمت وادیٔ غربت ہے اور جانِ وطن

لیتے ہیں تیری زباں سے ہم تری خو کے مزے
لوٹتے ہیں تیری آنکھوں سے ہر اک شے کے مزے
تیرے کانوں سے ہیں سنتے نغمہ گو کے مزے
تیرے نغموں پر صدا ہے آہنگِ موسیقار کی

چاند سا چہرہ نہ جب تک ہو کسی کا سامنے
بیوفاؤں سے نہ ہو جب تک جہاں تانِ وفا
دوستوں کا ہو نہ جب تک روئے زیبا سامنے
جمع جب تک ہوں نہ اجزائے پریشانِ وفا

دل نہ لیں بچھڑے ہوئے یاروں کی جب تک آہ ہم
اُف! ...کا ذخیرہ دل کی کبھی ہوگی نہ کم
تجھ سے مایوسی میں بھی ہے ... تسکینِ غم
آرزوؤں کی ہے گویا ایک دنیا سامنے

ہم جہاں جاتے ہیں ہمیں ... اپنا ...
... دل وقت سے کبھی ممکن نہیں
کرتے ہیں تیغ و سناں سے جنگجو ملکوں کو سر
چھین لیتے ہیں جہانداروں سے گو تاج و نگیں
دل کو کر سکتے نہیں تسخیر یہ بھی زینہار
او! ہماری صحبتِ دیریں کی زندہ یادگار

دل پہ گر لیتا ہے قابو - آہ! تو بے اختیار
اور اُٹھا لیتی ہے ہم کو بیلدکی تیری نظر

ہم نفسوں میں اگرچہ ہے رفیقِ باوفا
ہم سے اچھی عالمِ امکاں میں کوئی شے نہیں
اپنی صورت دیکھ کر کہتے ہیں خود صلِ علیٰ
ہم ہیں اِس تصویر خانے میں وہ نقشِ دلنشیں
ہم سے پوچھے کوئی لیکن آہ! اے جانِ جہاں
تیری اک دلکش ادا میں کتنی ہیں دلچسپیاں
تیری ہستی میں ہماری آہ! ہستی ہے نہاں
ہم ہیں محوِ بیخودی - کیسی فنا؟ کیسی بقا؟

ہیں ہمارے دل کا آئینہ ہمارے ہمنشیں
ہم میں جو جذبات مضمر ہیں - وہ اُنمیں ہیں عیاں
اُن سے ظاہر ہیں تمنائیں ہماری بالیقیں
اور ارادے ہیں ہمارے - اُنکے دامن میں نہاں
ہے ہمارا امتحاں مدِ نظر تمکو اگر
ہمنشینوں کو ہمارے دیکھ لو تم اک نظر
جو خصائل ہیں نہاں ہم میں ہیں اُنمیں جلوہ گر
شرط اے اہلِ نظر لیکن ہے چشمِ نکتہ بیں

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

فراق

اِک دن وہ تھا کہ نشۂ عشرت میں چُور تھا پہلو میں صبح و شام کوئی رشکِ حُور تھا
شیشہ بغل میں ہاتھ میں جامِ بلور تھا دو روزہ زندگانی پہ کیا کیا غرور تھا

اے انقلابِ دہر یہ کیا قہر ہو گیا
آبِ حیات حق میں مرے زہر ہو گیا

آنکھیں وہی ہیں اپنی مگر وہ نظر کہاں وہ دل کہاں وہ جوش کہاں وہ جگر کہاں
منہ میں زباں ہے کہنے کو گویا مگر کہاں نالے وہی ہیں نالوں میں اب وہ اثر کہاں

دیوار و در کو تکتے ہیں فرقت میں روتے ہیں
جانِ عزیز اسی مصیبت میں کھوتے ہیں

جو ہم پہ مہربان تھا نامہرباں ہے اب وہ زندگی کا لطف کدھر ہے کہاں ہے اب
صبر و شکیب اب ہے نہ تاب و تواں ہے اب غم سے مقابلہ ہے بڑا امتحاں ہے اب

ہاں ہمتِ بلند کہ یہ موقع مرد کا ہے
کوشش کا اور سعی کا ہے جد و کد کا ہے

ہمت ضرور چاہیے ہر کام کے لئے رغبت ضرور چاہیے ہر کام کے لئے
نیت ضرور چاہیے ہر کام کے لئے جرأت ضرور چاہیے ہر کام کے لئے

دنیا کا سارا کام تردد کے ساتھ ہے
بن آنا کوششوں کا مقدر کی بات ہے

امید ہی سہارا ہے ہر خستہ حال کا امید ہی ہے خضر طریقِ وصال کا
گو دل میں پھیر ہو گا مہینوں کا سال کا لیکن امید ہے تو نہیں غم ملال کا

اُمید میں ہزار اگر رنج و غم ہے
انسان کو ضرور ہے ثابت قدم رہے

ہاں اے شاہدِ مراد کہاں تک مگر ہے تو
منہ سے اُلٹ نقاب کہیں آ بھی رُوبرو

کب تک رہے تلاش کہاں تک یہ جستجو
وارفتگانِ عشق کو اتنی ہے آرزو

ہو روزِ وصال پردہ درِ انتظار ہو
قابو میں سینے ابلقِ لیل و نہار ہو

عزیز یار جنگ عزیزؔ (حیدرآبادی)

ابابیل

جان ہے ننھی سی تو ننھی سی تری آواز ہے
ننھے ننھے بال و پر تھا ترا انداز ہے

خالِ عارض سے سیاہ تر ہے تری چشمِ بصیر
سحر ہے جادو ہے تو یا کوئی افسوں ساز ہے

آنکھ میں تیری لگا ہے سرمۂ دنبالہ دار
زلف ہے مشکیں ترک کالی تری شہباز ہے

شانۂ مشاطہ کی تجھ کو نہیں ہے احتیاج
بے نیازی حسن کی تیرے سراپا ناز ہے

تجھ کو مل جاتا ہے ہر نو روز پر چستِ حریر
حاجتِ خیاط سے بے منتِ بزاز ہے

سقفِ پرپیچ میں ننھا سا نشیمن ہے ترا
گو فلک تک مسجد ہم تو مائلِ پرواز ہے

قوم کو تیری نہیں ہے مال و دولت کی ہوس
بس ہوسِ ناکس تمہارا خانہ برانداز ہے

ہم سفر تیری کبھی بادِ صبا اور گہ نسیم
تازگی تجھ کو ہی اس سے تجھ پہ انکو ناز ہے

آبِ دریا سے بھلا کچھ بھی نہیں کیا تری پیاس
ابرِ نیساں کے مقابل تو جو انداز ہے

بانٹوں کو تیرے مہ بھی نہیں ملتا کوئی
برق ہے ان میں کبھی یا [illegible] ہے

سمجھا تجھے سب بلا کی تو ہوشیار ہے	مگر افسوس سارے قوم کا تو نادار ہے
تیری حالت میں کبھی کچھ نہیں تو نے فرق	تیر کماں کہتے ہیں تمہارا دغا ہے

سید نور اللہ شاہ بی اے

تازہ غزلیں

(از نواب سید علی حسن خاں بہادر طاہر)

روشن ز نورِ عالمِ فطرت بیانِ ما	یک اسمِ اعظم است زبان و دہانِ ما
یک یک رموزِ کائنات جہاں کردہ ایم حل	جامِ جہاں نماست دلِ ما بیانِ ما
ما عاشقان بجائے خرابی فسانہ ایم	چون داغ ماند بر دلِ گیتی نشانِ ما
رسوائی دردِ عشق کسے آنچنیں مباد	بایک شنید از لبِ دشمن فغانِ ما
ہر جا فراق ہرزہ روی قطعِ وقت کرد	بیرون ز جائے خود نرود کاروانِ ما
تمییزِ خوب و زشت ز اضداد می شود	با ہر ز حالِ غیر گرفت امتحانِ ما
چشمش فتاد چون برُخِ رنگِ شکستہ ام	خوش بہار رشک برد بر خزانِ ما
بے صرفِ عمر وصل میسر نمے شود	ذوقِ فناست زندگیِ جاودانِ ما

طاہر زمانِ ماضیِ ما خوش ز حال بود
اے کاش رو کند بقفا کاروانِ ما

(از صاحبزادہ مصطفےٰ علی خاں بہادر اسسٹنٹ پرائیویٹ سکرٹری دربار رامپور)

زندگی عشقِ بتاں میں کوئی کیونکر کاٹے	آتے دن میں نے پہاڑوں کو ہی جڑ کاٹے
تم نے کاٹی ہے گزارے ہیں جاناں بنکر	زندگی عیش میں جس طرح تو کیونکر کاٹے

مخزن ایجنسی لمیٹڈ کی موجودہ کتابیں

مقام خلافت (مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا) پہلے لاجواب ایڈیشن کے م
...بی قدر کی گئی ہے شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت [illegible]

رسوم دہلی۔ مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ قیمت [illegible]

منازل السائرہ۔ مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا اڈ...

خواب ہستی۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا اڈیشن

ابومسلم خراسانی رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مو
محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے

مکتوبات آزاد۔ اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ باتصویر

کلام نیرنگ سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما اڈیشن

انتخاب مخزن۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب۔ ۔ قیمت [illegible]

دردِ جانستاں۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی، دہلی کی زبان میں ...

دربار نمبر۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا

مثنویات میر حسن۔ مثنوی بے نظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخہ سے نقل کر

سیر تبت۔ انگریزی کتاب "فور ایرس ان تبت" کا بامحاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا

مرقع خوشخطی۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہو
نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقین خط کے واسطے تیار کیا جسکو
خط کے تمام نکات آسانی سمجھ میں آسکتے ہیں علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب مصنف نے اسکی اہتمام
ملکی ہی یہ خوبی ہے کہ اس دو مسیتر کاپی ہر فن کیسا سیکھا جاسکتا ہے ... [illegible]

مخزن ایجنسی کی موجودہ کتابیں

مقام خلافت (مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا) پہلے لاجواب ایڈیشن کے مرفتہ
باقی رہ گئی ہیں شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت [illegible]
شوم دہلی۔ مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ قیمت [illegible]
منازل السائرہ۔ مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا اڈیشن۔
خواب ہستی۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا اڈیشن۔ ۔ر
ابو مسلم خراسانی رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی
محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ۔
مکتوبات آزاد۔ اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ بالتصویر۔
کلام نیرنگ سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما اڈیشن ۔
انتخاب مخزن۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب۔ ۔ قیمت [illegible]
دجالستان۔ مصنفہ حکیم سید [illegible] صاحب فراق دہلوی) دہلی کی زبان میں [illegible]
دربار نمبر۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا
مثنویات میر حسن۔ مثنوی بے نظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخہ سے نقل کرکے
سیرت۔ انگریزی کتاب "[illegible]" کا بامحاورہ ترجمہ اور تہذیب کے متعلق معلومات کا ذخیرہ
مرقع خوشخطی۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہوری نے
نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقین خط کے واسطے تیار کیا جسکو دیکھ کر
خط کے تمام نکات بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب موصوف نے اسکی اتمام [illegible]
ملحوظ رکھی ہے [illegible]

ربڑکی مہر اور مہرکنی کا مشہور و معروف کارخانہ

کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست ... راستی موجب رضائے خداست

جناب عالی! تو ہندوستان میں ربڑ کی مہر اور مہرکنی کے بہت سے کارخانے ہیں مگر یہ کارخانہ چالیس سال سے نہایت صفائی اور دیانتداری سے کام کرتا ہے اس کارخانے نے بڑے بڑے قیمتوں کے کام بنا کر سندیں حاصل کی ہیں اور اس کارخانہ میں سب قسم کا کام اور سب زبانوں یعنی گورمکھی ناگری۔ ہندی بنگلہ۔ فارسی۔ عربی۔ انگریزی میں بہت صفائی کے ساتھ بنایا جاتا ہے اور ہر چیز مثلاً چاندی۔ لوہا۔ پیتل۔ پتھر۔ لکڑی پر کھدائی بہت عمدہ ہوتی ہے۔ اور ہر قسم کے بلاک بھی بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں اور مونوگرام اور سلطانی طغرائے وغیرہ لوہے کی ڈالی پر بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ عقیق کی مہر کی قیمت ایک نام کی اعلیٰ درجہ کی مع انگشتری چاندی کے (عا) اور معمولی درجہ کی مع انگشتری چاندی کے (عه)

ربڑ کی مہریں بھی نہایت عمدہ تیار ہوتی ہیں

جنکی قیمت اعلیٰ درجہ کی (عا) مع سامان معمولی درجہ کی (عہ) اور روزمرہ تاریخ بدلنے والی ربڑ کی مہر کی قیمت مع سامان (عہ) اور وہ مہر ربڑ جو خود سیاہی لیکر چھاپتی ہے۔ مع سامان (عہ) اور ربڑ کی مہر مع انگشتری چاندی کے بغیر سامان پنسل (عہ) پنسل والی ربڑ کی مہر ۱۲ بغیر سامان علاوہ ہمارے کارخانہ میں ہر رنگ کی ربڑ کی مہریں سیاہی و انگوٹھا لگانے کے بکس و ربڑ کے حرفوں کے بکس و ٹوپیک سیاہی غرض سب سامان مل سکتا ہے۔

المشتہر

احمد بیگ مہرکن و ربڑ اسٹامپ میکر چاندنی چوک دہلی

ن کی تصدیق تمام انڈیا میں ہر قوم کے لوگ کرتے ہیں